انگریز کا راج کیوں ختم ہوا؟

گم کردہ مقبوضہ

انگریز کا راج کیوں ختم ہوا؟

مترجمہ

مولوی محمدؐ ابراہیم علی چشتی

شائع کردہ

لائن پریس۔ ہسپتال روڈ۔ انارکلی۔ لاہور

تبصرے

لندن کا مشہور اخبار "ٹائمز" اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے:-

یہ کتاب تصنیف و تالیف کا بہترین اور قابلِ غور نمونہ ہے . . . مصنف ہندوستان سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ کوئی اشتہار باز نہیں وہ نہایت احتیاط لیکن پورے یقین کے ساتھ اُن اسباب و نتائج کا تجزیہ کرتا ہے جو اس کی رائے میں ہندوستان کو انگلستان سے چھین چکے ہیں۔

انگلستان کا نامور اخبار "مارننگ پوسٹ" کہتا ہے:-

ہم اراکین پارلیمنٹ، ایڈیٹروں، سوداگروں، مناظرہ کے شوقینوں اور ادبی ذوق رکھنے والی بیگمات غرض سب کو اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں . . . .

مصنف کوئی پُرجوش سرپھرا نہیں۔ نہ ہی اُسے پارٹی بازی کا مرض ہے . . . جو لوگ اُس کے پیش کردہ تجزیۂ حالات پر غور کرنے کی تکلیف گوارہ کریں گے۔ اُنہیں ضرور کچھ نہ کچھ حاصل ہوگا۔

سر مائیکل اوڈوائر سابق لفٹننٹ گورنر پنجاب کی رائے ہے:-

اُمید ہے کہ اخبار ٹائمز میں اس کتاب کے متعلق جو قابلِ تعریف تبصرہ شائع ہو چکا ہے وہ انگریزی رائے عامہ کو بلا لحاظ جماعتی اختلافات کے اُن خطرناک کوائف سے آگاہ کر دے گا جو اِس قابلِ غور کتاب میں نہایت صفائی اور سچائی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

مقدمۂ مترجم

پنڈت جی کا افسانہ یا بنئے کا خطرناک بہانہ

جن لوگوں کو ادبیات سے مس ہے، وہ جانتے ہیں کہ کردار نگاری (یا ناٹک) میں شخصیتیں دو طرح سے پیش کی جاتی ہیں: بعض مصنّف تو اپنے ہیرو چلتے پھرتے انسانوں کے نمونہ پر دکھاتے ہیں۔ ان میں وہی تنوّع ہوتا ہے، وہی گہرائی، وہی تغیّر، وہی ارتقا، اور وہی بعید الفہم پیچیدگیاں، جن سے ہم اپنی روزمرہ زندگی میں دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ شیکسپیئر کے مشہور کردار اسی صف میں شمار کئے جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے ایک دوسری صنفِ تحریر یہ ہے جس میں کسی قوم، طبقہ، جماعت یا ایک خاص ڈھب کے لوگوں کے چال چلن اور طبائع کے ابھرے ہوئے

نقش و نگار یکجا کر کے دکھائے جاتے ہیں۔ اس دوسری قسم کی شخصیتوں کی کہانی قدرے تصنّع سے خالی نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ مصنّف اُن کا نقشہ پیش کرتے ہوئے زندگی کا مرقّع کھینچنے کی کوشش میں مصروف نہیں ہوتا۔ بلکہ عام اور مشترک صفات کی ایک فہرست مرتب کر رہا ہوتا ہے۔ ایسی شخصیّت اردو لٹریچر میں آزاد کی ہے، جہاں سرشار نے لکھنؤ کا تمدّن دکھاتے ہوئے ماضی اور حال، گذشتہ اور موجودہ متمدّن اور غیر متمدّن، جدید اور قدیم، مشرق اور مغرب، سب کو ایک ہی ذات میں جمع کر دیا ہے۔

موجودہ کتاب کے مصنف نے پنڈت جی کی فرضی شخصیت تلے وہ تمام عناصر جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو ہندو ساہوکارہ کا ما بہ الامتیاز ہیں: بنیاپن اور یہودیّت، چالاکی و عیّاری، عدم تشدّد اور متمرّدانہ کشمکش سے ایک طبعی گریز اور ہچکچاہٹ۔ لیکن ساتھ ہی ہٹ دھرمی، ضد، اور اپنی ذہنی خصوصیات کو قائم رکھنے کا وہ ملکہ جس کے لئے عجم اور ہندوستان کے آریا ہمیشہ سے تاریخ میں مشہور رہے ہیں۔ اس قسم کے مرقّعات کی زندہ تصویریں مشکل ہی نظر آیا کرتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص میں اس کی قوم کی تمام نمایاں خصوصیات جمع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ہٹلر جرمن

عسکریت، خشونت، دلیری اور جارحانہ ذہنیت کا مجسّمہ تھا۔ اسی طرح اگر آپ ہندو یہودیت کی جیتی جاگتی تمثیل دیکھنا چاہیں تو ہندو نیشنلزم کا مہاتما پنڈت جی کا بہترین ہمزاد قرار دیا جا سکتا ہے۔

کچھ شک نہیں کہ بنیا پن کی گھٹی میں غلامی پڑی ہے۔ (مرہٹوں اور سکھوں کو چھوڑتے ہوئے (جو نسلی، مذہبی اور تمدنی لحاظ سے ہندو یہودیت سے قطعاً جدا تھے اور جوں ہی اُن پر بنیا پن کے منحوس فلسفہ کا سایہ پڑنا شروع ہوا، اُن کی عسکری صفات بھی ہٹتی گئیں) ان کی گذشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ میں حریت کے مردانہ اور جارحانہ تصوّرات، تمدّن کے تعمیری اور تخلیقی محرکات مفقود ہیں۔ اِن کا سوراج کسی مجاہدانہ انقلاب کا متمنّی نہیں۔ وہ کائنات کے لئے کوئی جداگانہ اور عالمگیر پیغام نہیں رکھتے۔ بلکہ اُن کی لغت میں آزادی کے معنی ہی فقط یہ ہیں کہ فرنگی کے فولادی دستِ شفقت کے زیرِ سایہ ان کا ساہوکارہ پورے جوبن سے قائم ہو جائے۔ خود کانگرس کے نسبتاً روشن خیال اور ترقی پسند طبقہ کو ہمیشہ سے اس حقیقت کا اعتراف رہا ہے۔ جواہر لال نے اپنی تزک میں جا بجا اسی غلامانہ ذہنیت کا رونا رویا تھا۔

عدم تشدّد اور عدم تعاون درحقیقت ہندو تمدّن کے قدیم ہتھیار ہیں۔ ان میں کوئی جدّت یا اختراع نہیں۔ زمانۂ قبل تاریخ سے بنیا سوسائٹی کا ایک پرانا دستور تھا کہ جب کسی لالہ جی کو اپنے قرضدار سے رقم وصول کرنے میں دقّت پیش آئے تو وہ ایک سچّے بنئے کی طرح چپ چاپ اس کے دروازے کے سامنے براجمان ہو کر فاقہ کشی شروع کر دیتا تھا۔ وہ دن رات وہیں بیٹھا رہتا۔ اور اگر اسے مار پیٹ کر وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی جاتی تو خاموشی سے لاٹھی کی ضربیں سہ لیتا۔ لیکن ٹلنے کا نام نہ لیتا۔ اوّل تو قرضدار خود ہی اس دن رات کے جھنجھٹ سے تنگ آ کر ساہوکار کا حساب چکا دیتا۔ ورنہ گاؤں میں چرچا ہونے پر برادری کے بڑے بوڑھے کوئی ایسا انتظام کر دیتے کہ مہاجن کا دھن ضائع نہ جاتا۔ اِس رسم کو "دھرنا دے کر بیٹھ جانا" کہا جاتا تھا۔ عدم تشدّد اور عدم تعاون میں بھی ہندو یہودیت کے ایک ازلی و ابدی بنیا مہاتما نے اسی "دھرنا" کا چربا اتارا ہے۔

پاکستانیوں کے لئے پنڈت جی کے افسانہ میں ایک ہی دلچسپی ہے اور وہ یہ کہ وہ خود ان کے منتر سے محفوظ رہیں۔ کیونکہ انگریز کو اپنی ہوا خواہی کا یقین دلا کر اس سے ساہوکارہ کا اجارہ لے لینے اور اُس سے اپنی فوجی حفاظت کا عہد نامہ کر لینے کے بعد اب وہ وقت آن پہنچا ہے جب

پنڈت جی مسلمانوں کے صدقے واری ہو کر اُن کی جیب میں ہاتھ اور گلے میں طوق ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ پنڈت جی اگرچہ جہودانہ فساد میں کسی سے کم نہیں لیکن اُن کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ کھڑے ہو کر خون کی قربانی نہیں دے سکتے۔ وہ کسی کا گلا گھونٹ کر یا لہو چوس کر مار ڈالنے سے دریغ نہیں کرتے لیکن مردانہ وار خون بہانا یا بہانے دینا اُن کے حوصلہ سے باہر ہے۔ جیو ہتیا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس وہ پٹتے پٹتے مرجانے کو تیار ہیں لیکن ہاتھ میں تلوار لے کر ڈٹ جانے کی سکت نہیں رکھتے۔ لیٹ کر گلے پر چھری چلوا لینا، پیٹھ میں پیچھے سے آکر کٹار گھونپ دینا، یا جھگڑے اور فساد کی صورت میں قتل کر لینا تو اُن سے عجب نہیں، لیکن جنگ کے میدان میں دلیروں کی طرح دادِ شجاعت دینا اُن کے بس کی بات نہیں۔ بنئے کے لئے بنیا پن کی موت ممکن ہے لیکن راجپوت کی زندگی ناممکن۔ ان کی کامیابی کا راز اگر کچھ ہے تو اُن کی ہٹ دھرمی ہے

اس دور میں سب مٹ جائیں گے اور باقی وہ رہ جائے گا

جو دُھن پر اپنی قائم ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے

جہاں تک استقلال کا تعلق ہے مسلمان بھی کسی سے کم نہیں، ضرورت فقط اُس کی احتیاط کی حس کو بیدار کرنے کی ہے۔ ہمیں پنڈت جی کے اغراض و مقاصد، اُن کے عقائد، اور طریقِ کار سے پوری طرح آگاہ ہو

جانا چاہیئے۔ انگریز اُس کے ہاتھوں اپنی غفلت کا کچھ خمیازہ بھگت چکے ہیں، کچھ بھگت رہے ہیں، اور کچھ بھگتیں گے۔ ہمیں دوسروں کے حال سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ یہ کتاب بنئے کی چالاکی کے ہاتھوں ایک انگریز کی فریاد ہے۔ ہمیں اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

ایک غلط فہمی جس کے پیدا ہو جانے کا امکان ہے، میں ابھی سے اس کا ازالہ کر دینا چاہتا ہوں۔ جدید نفسیاتی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کاروبار اور کام کرتے وقت جو مقاصد بظاہر ہم نے پیشِ نظر رکھے ہوں وہ دراصل اور درحقیقت بھی ہمارے اصلی مقاصد ہوں۔ اکثر ہماری کوششوں کا اصل منبع ہمارے ذہن کے غیر شعوری حصّوں میں پنہاں ہوتا ہے جس کی تشریح ایک مشاہدہ کرنے والا تو کر سکتا ہے لیکن بسا اوقات ہم خود اس سے ہمیشہ کے لئے ناواقف رہتے ہیں۔ لہٰذا یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کتاب میں یا اس مقدمہ میں پنڈت جی سے جو کچھ منسوب کیا گیا ہے وہ ہندو قوم کی اکثریت نے دیدہ و دانستہ اور جان بوجھ کر خاص اسی نیّت سے اختیار کر رکھا ہے۔ نہیں! عجب نہیں کہ اپنے ضمیر کو تسکین دینے اور دل کو خوش کرنے کے لئے اُنھوں نے کچھ اور عذر گھڑ رکھے ہوں۔ ہمارا مصنّف تو اُن کے ارادوں

ﺗﺮ

اور کوششوں کے خارجی نتائج سے بحث کر رہا ہے۔ اُن کی نیتوں سے اُسے کوئی واسطہ نہیں۔

غرض ہمیں اس غلط فہمی سے بچا رہنا چاہیئے کہ بنئے کی کمزوریاں یا برائیاں، یا ہمارے ساتھ سلوک اُس کی سوچ بچار کا نتیجہ ہے۔ وہ خود بھی اِس سے ویسا ہی بے خبر ہے جیسا کوئی تیسرا ناواقف شخص بے خبر ہو سکتا ہے۔ اِس لئے اُس سے بحث کرنا، یا استدلال سے اُنہیں قائل کر لینے کی اُمید رکھنا، یا اُن کے ضمیر کو بیدار کر لینے کی توقع رکھنا بیکار ہے۔ اگر ہم انہیں قائل بھی کرنا چاہیں تو ایسا کرنے کے لئے ہمیں اپنی قوّتِ عمل سے کام لینا ہوگا، نہ کہ زبانی وعظ و پند سے۔ قدرت کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ ہمیں خود حفاظتی کے لئے اُن سے ٹکرانا ہوگا۔ میں نے غلط کہا، ہمیں اُن سے نہیں بلکہ اُن کے غلط عقائد سے لڑنا اور اُن کی غیر اسلامی عادات کو مٹانا ہے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَظِيمِ

خاکسار

محمد ابراہیم علی چشتی

پیسہ اخبار سٹریٹ

لاہور

فہرست مضامین

عنوانات | صفحہ

باب ششم (بغاوت)

سرپرستی صـ۳۲۲ - آزادی کی دیوی، خون کی بھینٹ مانگتی ہے صـ۳۲۵ -
احیائے ہندومت کا پہلا شکار مسلمان تھے صـ۳۲۸ - شورش بنگال
میں پھیلتی ہے صـ۳۳۰ - جنم بھومی کی تقسیم، دیوی اور ماں کے دو ٹکڑے
کردینے کے برابر ہے صـ۳۳۲ - پاربتی دیوی نے اب " کالی دیوی "
کا روپ دھار لیا! صـ۳۳۶ - فیل شدہ گریجویٹوں کی بغاوت صـ۳۳۸ -
حکومت کمزور ہو تو فساد پھیلتے دیر نہیں لگتی صـ۳۴۱ - پن کی خاطر
پاپ بھی جائز ہے صـ۳۴۲ - انگریز نے ہندوستانیوں کو نہتا کر
رکھا تھا صـ۳۴۴ - تہذیب کے ستائے ہوؤں کی حالت قابلِ رحم
تھی صـ۳۴۷ - اخباری جرائم کے خلاف قانون ناقص تھا صـ۳۴۸ -
جلسوں کے متعلق قانون بھی تسلی بخش نہ تھا صـ۳۵۰ - ضابطہ کی
کی خامیاں، قانون کی کوتاہیوں سے بھی زیادہ تھیں صـ۳۵۰ - پنڈت
جی کی امید بر آئی صـ۳۵۲ - اعتدال پسند ممدوح الطرفین تھے صـ۳۵۴ -
وفادار رعایا کا پہلا فرض حکومت کی مخالفت ہے صـ۳۵۶ -
مطلب ایک، لیکن لفظوں میں فرق ہے صـ۳۵۷ - اعتدال پسند
اور انتہا پسند، ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں صـ۳۵۹ -
اکالیوں اور آریہ سماج کی جارحانہ تحریکیں صـ۳۵۹ - مسلمان
فی الحال سوئے پڑے تھے صـ۳۶۳ - اسلام کی رو سے

مزاج نہیں ہوتے صـ۳۹۳۔ حکومت کو کس حد تک سختی کرنا چاہئے ہے۔ صـ۳۹۵۔ ہندوستان کو دیسی ریاستوں میں تقسیم کر دینا چاہئے تھا صـ۳۹۸۔ حکومتِ برطانیہ نے کانگرس کی طرف جھکنے کا فیصلہ کر لیا صـ۴۰۱۔ ہندوستانیوں نے دوست بن کر انگریز سے راج چھینا ہے صـ۴۰۴۔ "تمہیں تمہاری قسم، ہمیں لیڈر بنا دو" صـ۴۰۶۔ ہمیں منصب مل جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا صـ۴۰۸۔ انگریز غچا کھا گئے صـ۴۱۰۔ جدید آئینی اصلاحات کا ایک خاکہ صـ۴۱۱۔ یہ آئین تعلیم یافتہ برہمنوں کی ڈکٹیٹر شپ قائم کر دیتا صـ۴۱۵۔ جدید آئین فرانس کے آئین سے ملتا جلتا تھا صـ۴۱۷۔ حکومت کا انتظامی شعبہ مضبوط ہونا چاہئے صـ۴۱۸۔ عہدے تھوڑے تھے اور امیدوار بہت صـ۴۲۰۔ حکومت کو اعتدال پسندوں سے مصالحت کا کچھ فائدہ نہ ہوا صـ۴۲۱۔ باوجود مراعات کے حکومت کے خلاف شکایات بڑھ گئیں صـ۴۲۳۔ سختی کے ساتھ نرمی کو ملانے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا صـ۴۲۴۔ حکومت اب کمزور ہو چکی تھی صـ۴۲۶۔ حکومتِ ہند کی افواج کمزور ہو گئیں صـ۴۲۹۔ پہلی جنگِ عظیم صـ۴۳۱۔ جنگ کا اثر ہندوستان پر صـ۴۳۴۔ افواجِ ہندوستان صـ۴۳۵۔ حقِ خود ارادیت، صـ۴۳۸۔

عیسائی قومیں ایک دوسرے کا گلا گھونٹ رہی تھیں صہ۴۴۱۔
پہلی عالمگیر جنگ دوسری جنگِ عظیم کا پیش خیمہ تھی صہ۴۴۳۔
یورپ کا کچومر نکل چکا تھا صہ۴۴۵ ۔ جنگ ختم ہونے پر ہندوستان
میں ایک تزلزل رونما ہوا صہ۴۴۶ ۔ "تحفظِ حرمین شریفین"
صہ۴۴۷ ۔ "ماتا" کے پجاریوں کو اب ایک "پتا" میسّر آگیا صہ۴۴۔
گاندھی کا فلسفہ صہ۴۵۰ ۔ ترکِ دنیا، تخریب پسندوں کا
عقیدہ ہے صہ۴۵۴ ۔ ہندو مسلم اتحاد صہ۴۵۷ ۔ زمین پر رہنے
والے آسماں پر کہاں چڑھ سکتے ہیں صہ۴۶۰ ۔ موپلہ بغاوت
صہ۴۶۴ ۔ سکھ گوردواروں کی تحریک صہ۴۶۷ ۔ فوج پر
تحریکِ خلافت کا اثر صہ۴۷۰ ۔ حکومتِ ہند کی جڑیں ہل چکی
ہیں صہ۴۷۲ ۔ ہندوستان میں پرنس آف ویلز کی آمد صہ۴۷۵
ہندوستان میں آئینی اصلاحات ناکام ثابت ہوئیں صہ۴۷۸ ۔ دوعملی کی دقّتیں صہ۴۸۰ ۔
مختلف اعضائے حکومت میں افتراق مفید ثابت نہیں
ہوتا صہ۴۸۳ ۔ حکومت کے انتظامی اور قانون ساز شعبوں
میں اتّحاد لازمی ہے صہ۴۸۷ ۔ حکومتِ ہند نے ہتھیار
ڈال دیئے صہ۴۹۰ ۔ سرکاری نظام میں خلل پڑ گیا صہ۴۹۴۔

ہمیشہ بدچلنی کا شیوہ ہوتی ہے صنہ ۵۴۰ - ع گیا وقت پھر ہاتھ
آتا نہیں صہ ۵۴۲ - ہندوستان آزاد ہوکر برطانیہ کی حلقہ
بگوشی تو نہ چھوڑ دے گا صہ ۵۴۴ - گورے اور کالے کیسے برابر
ہوسکتے ہیں صہ ۵۴۸ - فتح کا پھل کھانا ایک ذلیل حرکت ہے
صہ ۵۵۲ - پاجیوں کو سارا جگ پاجی ہی نظر آتا ہے صہ ۵۵۵
مغرب ابھی وحشی تھا کہ مشرق متمدن ہو چکا تھا صہ ۵۵۷ - فرنگی
کا تمدن، فرنگی کا راج، اور فرنگی کا سکہ، تینوں لعنتیں ہیں صہ ۵۵۹ -
انگریزی راج ختم ہو چکا ہے صہ ۵۶۱ - ہندوستان انگریزوں
سے خالی کراؤ صہ ۵۶۴ - انگریزی راج کے ساتھ انگریزی
زبان بھی رخصت ہو جائے گی صہ ۵۶۷ - فرنگی کا مالیاتی نظام
ایک نحوست ہے صہ ۵۷۱ - تدبیر کند بندہ، تقدیر کند
خندہ صہ ۵۷۵ - ہندوستان تقسیم ہو جائے گا صہ ۵۷۶ -
ہندوستان برطانوی دولتِ مشترکہ میں زیادہ دیر شامل نہ رہے گا
صہ ۵۷۸ - ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات ہوں گے صہ ۵۷۹ -
ہندوستان کا مستقبل مبھیانک ہے صہ ۵۸۱ - تؤتی الملک
من تشاء وتنزع الملک من تشاء صہ ۵۸۲ -

بابِ اوّل

ہندوستان میں سلطنتِ انگلشیہ کا قیام

نکلے تھے کالی مرچ ڈھونڈنے کہ ہندوستان کا تخت قبضہ میں آگیا

ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا آغاز تجارت سے ہوا۔ شاہانِ تودور کے عہد میں انگلستان کی دولت مسلسل بڑھتی گئی۔ یہ دولت صنعت سازی میں خرچ کی گئی۔ اس طرح تجارتی منڈیوں کی مانگ روز بروز زیادہ شدید ہوتی جا رہی تھی۔ ربعِ مسکونہ کے بیشتر حصے انگریزی تجارت کے لئے مسدود تھے۔ بہت سے ممالک میں تجارت کرنے کے لئے انگریزوں کو دلالی کی رقوم اور بھاری ٹیکس ادا کرنے پڑتے تھے۔ پھر یہ اجازت بھی طوعاً و کرہاً ملتی تھی، اور یہ تجارت بھی فقط آڑھتیوں کے واسطہ سے چلتی تھی۔ جہاں تک درآمد کا تعلق ہے، سردیوں میں گوشت ملنا ناممکن

تھا۔ نمک لگا کر خشک کیا ہوا گوشت تو چھ مہینہ کے لئے اچھے امیروں کی خوراک تھا۔ یہ خشک غذا بے مزہ ہوتی۔ مصالحوں کی بڑی مانگ تھی لیکن مصالحے پیدا کرنے والے علاقوں سے براہِ راست تجارت کا راستہ انگریزوں پر بند تھا۔ اس تجارت کے واحد ٹھیکیدار پہلے پرتگیز اور بعد میں ڈچ لوگ تھے۔ ایک دفعہ اتفاق سے پرتگیزوں کا مشرق سے آتا ہوا کوئی جہاز انگریزوں کے ہاتھ آپڑا تو ان کی توجہ جو عرصہ سے امریکہ کی جانب مبذول تھی اب مشرق کی طرف بھی منعطف ہوئی، اور انہیں خیال پیدا ہوا کہ مشرق بھی انگریزی مصنوعات کی ایک ممکن منڈی اور مصالحے حاصل کرنے کا ایک اچھا ذریعہ بن سکتا ہے۔

ڈچ سوداگروں نے اپنی ٹھیکیداری کے زعم میں کالی مرچ کا بھاؤ اتنا بڑھا دیا کہ انگریز گاہکوں نے اس نرخ کو ناواجب طور پر گراں خیال کیا۔ چنانچہ بعض منچلے انگریزوں نے بحرِ ہند کے راستے تجارت کا آغاز کیا۔ یہ تجارت کچھ ایسی قابلِ اطمینان نہ تھی۔ انگریزی مصنوعات کے لئے مشرق کوئی بہت اچھی منڈی ثابت نہ ہوا۔ بلکہ مشرقی مصنوعات نے اُلٹے مغرب کی سودیشی مصنوعات کی قیمت گرا دی۔ مشرق سے آنے والے مال کی قیمت نقد ادا کرنی پڑتی تھی، اور ایسا کرنا قانوناً ممنوع تھا۔

اس لئے شروع شروع میں زیادہ لوگ اس تجارت کی جانب مائل نہ ہوئے۔ لیکن آخر کار اُس وقت کے اقتصادی ماہرین پر بھی واضح ہوگیا کہ ہندوستان کو ایک روپیہ روانہ کرنا اور اُس کے بدلے آدھ سیر کالی مرچ حاصل کر لینا جو ہسپانویوں کے ہاتھ پانچ روپے کو بیچی جا سکتی ہے کچھ ایسا برا سودا نہیں۔ جلد ہی محسوس ہونے لگا کہ مشرقی مصنوعات کی منڈی کالزبن (پرتگال) اور ایمسٹرڈم (ہالینڈ) سے اُٹھ کر لندن آجانا انگلستان کے لئے سینکڑوں فروعی فوائد کا باعث ہے بغرض تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان سے تجارت برطانوی حکومت کا منتہائے نظر بن گئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی

تجارت کا انتظام کرنے یا بالفاظِ دیگر، اندھادھند مقابلہ، سٹے بازی، اور بحرِ ہند میں بدنظمی کے انسداد، سوداگروں کو تجارت کے معمولی قواعد کا پابند کرنے، اور اس تمام تجارت کو ایک ایسی مرکزی قوت کے ماتحت لانے کے لئے جو افراد کے حقوق کی حفاظت کر سکے، شاہی فرمان کے مطابق ایک کمپنی بنائی گئی۔ ایک انتظامیہ حکم نامہ کی رُو سے جنوبی افریقہ اور جنوبی امریکہ کے مابین تمام ممالک سے تجارت کا اجارہ اس کمپنی کے متعلقین کو سونپ دیا گیا۔

شاہانِ سٹوئرٹ کے عہد میں اس کمپنی کا رابطہ تاجِ برطانیہ سے نہایت گہرا رہا۔ اس عہد کے آخری ایام میں مختلف سیاسی جماعتوں کے مابین جو تنازعے زور پکڑ گئے تھے۔ اُن کے دوران میں بھی کمپنی کا اثر و رسوخ قدامت پسندوں کے حق میں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب شاہانِ سٹوئرٹ مغلوب ہو گئے تو کچھ مدّت کے لئے کمپنی کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا۔ اس کے تجارتی حقوق کی اجارہ داری چھن گئی۔ مشرق میں انفرادی قسمت آزمائیوں کی سرکار کی جانب سے حوصلہ افزائی ہونے لگی۔ اس جدید پالیسی کے نتائج کچھ ایسے تباہ کن ثابت ہوئے کہ جلد ہی کمپنی کو قدامت پسند عناصر سے پاک کر کے اور اُس میں تازہ سرمایہ اور نئے اراکین کو شامل کر کے اُسے دوبارہ زندگی دی گئی، اور اس کے حقوق بھی ایک نئے قانون کے ذریعہ محفوظ کر دئیے گئے۔ اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی بادشاہ کے پنجہ سے نکل کر پارلیمنٹ کے سایہ میں آ گئی۔

سالہا سال تک کمپنی کی تجارت ہندوستان تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اوّل اوّل اُن کی توجہات مشرقِ بعید کے مصالحہ پیدا کرنے والے جزائر پر مرکوز تھیں۔ یہاں انہیں ڈچ لوگوں سے مخالفت کا سامنا ہوا۔ اس وقت تک ڈچ لوگوں نے ان دور دراز

علاقوں ایک اچھی خاصی سلطنت پیدا کر لی تھی۔ ملک کے اصلی باشندوں میں کسی طاقتور حکومت کا وجود نہ تھا، اور اس لئے سوداگروں کو محفوظ رہ کر تجارت کرنے کے لئے حاکم بننا بھی لازمی تھا۔ انگریزوں کو ایسا کوئی شوق نہ تھا۔ یا تو وہ ایسے دور دراز کار مقبوضات حاصل کرنا چاہتے نہ تھے، اور یا حاصل کر نہ سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ سترھویں صدی عیسوی کے وسط تک وہ مشرقِ بعید کی منڈیوں سے نکالے جا چکے تھے۔ جاپان میں تو انہیں گھسنے ہی کون دیتا تھا۔ چین میں ابھی اِن کے پاؤں نہ جمے تھے۔ آسٹریلیا کا انہیں علم ہی نہ تھا۔ اور امریکہ کا مشرقی ساحل برائے نام یا فی الحقیقت ہسپانیہ کے ماتحت تھا۔ پھر یہ مؤخر الذکر علاقے کچھ ایسی کشش بھی نہ رکھتے تھے۔ اس لئے آخر کار انگریزوں کی تمام کوششیں ہندوستان پر مرکوز ہو گئیں۔ گویا اُن کے اور ڈچ لوگوں کے مابین ایک قسم کا غیر رسمی تصفیہ ہو گیا جس کی بنا پر ہندوستان تو انگریزوں کے سپرد ہو گیا اور مشرقِ بعید کے جزائر ہالینڈ کو مل گئے۔ پرتگیز اب قطعاً نظر انداز کئے جا سکتے تھے۔

انگریزوں کی ابتدائی بستیاں

ہندوستان ابھی مغلوں ہی کے ماتحت تھا۔ اگرچہ اُن کے تنزل کا دور شروع ہو چکا تھا، تاہم وہ ابھی تک ملک میں امن قائم رکھ سکتے

تھے، اور اُن کی بڑی یا بحری طاقت بھی ہرگز نظر انداز نہ کی جا سکتی تھی۔
کمپنی کے ایک منچلے ڈائریکٹر کے دل میں کچھ عرصہ کے لئے تسخیرِ مملکت
کی آرزوؤں نے چٹکی لی اور ولندیزوں کے نمونہ پر ہندوستان میں
مقبوضات حاصل کرنے کی کچھ کوششیں بھی کی گئیں، لیکن اورنگ زیب
کے سپہ سالاروں نے بڑی آسانی سے ان کوششوں کا قلع قمع کر دیا۔
اس طرح مشرق میں کمپنی کا واحد مالکانہ ارضی مقبوضہ فقط بمبئی کا جزیرہ
اور اس کے متعلقہ مضافات رہ گئے۔ یہ علاقہ ابتداءً پرتگیزوں نے
فتح کیا تھا۔ پھر پرتگیزوں نے چارلس ثانی کی بد قسمت بیوی کے جہیز میں
یہی علاقہ تاجِ برطانیہ کو دے دیا، اور اب بادشاہ نے اسے کمپنی
کے سپرد کر دیا یوں سالہا سال تک کمپنی اطمینان سے اپنا
کاروبار چلاتی رہی۔ یہ کاروبار یا تو اُن کوٹھیوں میں جاری تھا جو کمپنی
نے سلطنتِ مغلیہ کے بعض شہروں میں قائم کر رکھی تھیں (مغلیہ حکومت
اس قسم کی بستیوں کی خود مختاری میں ایک حد تک مخل نہ ہوتی تھی) اور
یا اس کاروبار کا مرکز ایسی تجارتی منڈیاں تھیں جو کمپنی مغلوں کے کسی
باجگذار نواب سے ٹھیکہ پر لے لیا کرتی تھی۔

انگریز تاجروں کو کئی مشکلات بھی درپیش تھیں۔ خاص طور پر جب
سلطنتِ مغلیہ کا انحطاط ظاہر ہونے لگا تو یہ مشکلات اور بھی بڑھ گئیں

فصیلوں والے شہر بھی ڈاکے کی واردا توں سے محفوظ نہ تھے۔ مغربی ہندوستان کی تجارت گھٹ گئی۔ بمبئی اگرچہ انگریزوں کے قبضہ میں تھا لیکن اس میں تجارت کا مرکز بننے کی اہلیت نہ تھی۔ اس کا محلِ وقوع کھلے سمندر پر تھا جہاں سے ہر وقت سمندری ڈاکوؤں کا خدشہ رہتا تھا۔ اس کے عقب کا علاقہ کم آباد اور ریگستان ہے۔ پھر پرتگیزوں اور مرہٹوں کے مقبوضات درمیان میں حائل ہونے کے باعث بمبئی اس کم آباد ریگستانی علاقہ سے بھی براہِ راست کوئی تعلق قائم نہ کر سکتا تھا۔ بنگال دور تھا۔ سندھ کا رویہ انگریزوں سے مخاصمانہ تھا۔ اس طرح کمپنی کی تمام کوششیں مدراس کے مشرقی ساحل کی جانب منتقل ہو گئیں۔ اس ساحل کو کرناٹک کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہاں کمپنی معمولی حیثیت کے زمینداروں اور زبردست سوداگروں کے بھیس میں برسوں مزے اڑاتی رہی۔

فرانسیسیوں سے زور آزمائی

انہیں دنوں برطانوی ملاح جنکنز کے کان کٹ جانے کا انتقام لینے کے لئے انگریزوں نے جنگ شروع کر دی۔ جو بات کبھی مشکوک تھی وہ اب مسلمہ ہے یعنی جنکنز کا ایک ہی کان تھا۔ یہ کان کاٹ لیا گیا تھا۔ ایک ملاح کا کان کٹ جانے کو عذر قرار دے کر اعلانِ جنگ کر

دینا بظاہر نہ تو انگریز قوم کی دُور اندیشی کے لئے قابلِ ناز حرکت دکھائی دیتی ہے، اور نہ ہی اس سے اُن کے سیاسی مدبرین کی دیانتداری ثابت ہوتی ہے۔ ہاں ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کم از کم جنگ کی ایک وجہ ضرور معقول تھی۔ وہ یہ کہ شاہانِ باربون انگریزی تجارت کو فنا کر دینے کے لئے ایک سازش میں مصروف تھے، اور یہ تجارت روز برطانیہ کے وجود کے لئے لابدی ہوتی جا رہی تھی۔ جنگ چھڑی تو ہندوستان تک بھی آپہنچی۔ دیگر مقامات کی طرح یہاں بھی انگریزوں کی ہیٹی رہی اور فرانسیسیوں کا پلّہ بھاری ثابت ہوا۔ صلحنامہ ایلاشیپل کی رو سے کمپنی کو اس کے مقبوضات تو واپس مل گئے، لیکن اس واپسی سے فرانسیسی کمپنی کو اپنے حریف کے خلاف اور بھی کینہ بڑھ گیا یہ ضد اور مخالفت اب ایچ پیچ طریقوں سے ظاہر ہونے لگی۔ مقامی حکمران انگریزوں کی نسبت فرانسیسیوں کو زیادہ عزّت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہاں فرانسیسیوں کو وقت تھی تو یہ کہ اُن کی کمپنی باوجود اچھی خاصی تجارت کی مالک ہونے کے، کیا بلحاظِ سرمایہ اور کیا بلحاظِ اجناس تجارت کبھی بھی اس قابل نہ ہوئی کہ درآمدنی یا برآمدنی تقاضے پورے کر سکتی۔ برخلاف اس کے انگریزوں کا واحد مقصد تجارت ہونے کے باعث وہ بیچے گاہک بھی تھے، اور اس لئے مقامی

حکمران اُن کو قطعاً خارج از بلد نہ کرنا چاہتے تھے۔

آخرکار کمپنی کے ملازموں کو طوعاً و کرہاً بہی کھاتے کے دفتر اور ترازو کا گز ایک طرف دھر کر تلوار و تفنگ کی جانب مائل ہونا پڑا۔ جب تک فرانسیسی قائدین کی کامیاب حکمتِ عملی اور دلیرانہ جنگجوئی سے یہ نظر نہ آنے لگا کہ یہ قوم سارے جنوبی ہند پر قبضہ کر لے گی، اور یہ خدشہ بھی پیدا نہ ہوگیا کہ فرانسیسیوں کا یہ عروج انگریزوں کی تجارت کا خاتمہ کر دے گا، تب تک انگریز اُس جدوجہد میں شریک نہ ہوئے جو برائے نام ہندوستان کے مقامی نوّاب راجاؤں میں اور فی الحقیقت انگریزوں اور فرانسیسیوں میں ایک ایسے مرحلہ پر جاری تھی جبکہ بظاہر دونوں سلطنتوں میں صلح تھی۔ یہ جدوجہد ایک لمبی چوڑی داستان ہے جس میں دلیرانہ اور دلچسپ واقعات کی کمی نہیں۔ اس کشمکش کا اختتام فرانسیسی رسوخ کی کُلّی بیخکنی پر ہوا۔

سوداگری چھوڑ کر کشور کشائی کا آغاز

کمپنی تو غالباً اس فتحیابی کے بعد پھر وہی دوکانداری کی زندگی اختیار کر لیتی جس میں سلطنت کے فرائض مقامی حکمرانوں کے سپرد رہتے اور انگریز خالی ایک بارسوخ سوداگروں کی جماعت کے منصب پر قانع رہتے، لیکن ایسی رجعتِ قہقری اب ممکن نہ تھی۔ انگریز اس

لڑائی کے دوران میں ایک بھاری فوج کی بنا ڈال چکے تھے۔ وہ مقامی حکمرانوں سے اَن گنت معاہدے کر چکے تھے جن کا پورا کرنا اب لازمی تھا۔ الغرض فوج منتشر تو کی نہ جا سکتی تھی، اور آخر اُس کو تنخواہ دینے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ اِن حالات میں لگان وصول کرنے کی ذمہ داری سنبھالنا ناگزیر تھا۔ مزید بریں انگریز اگر یہ میدان خالی بھی کر دیتے تو اس میں دوسروں کے آ کودنے کا دھڑکا لگا رہتا۔ فرانسیسیوں نے جنگ ہفت سالہ کے بعد انتقام کی اُمید پر اپنے مقبوضات اور بحری طاقت کو مضبوط کر لیا تھا۔ ولندیز بھی ہندوستان میں پاؤں جمانے کے شائق نظر آتے تھے۔ ہندوستان ولندیز دل کے لنکا جیسے اہم مقبوضہ کے قریب واقع تھا، اور یہاں کے کئی علاقوں پر اُن کا پہلے سے تسلط بھی تھا۔ ڈنمارک، جرمنی اور اٹلی کی طرف سے بھی حملہ ناممکن نہ تھا۔ اندریں حالات انگریزوں نے، اگرچہ مجبور ہو کر، لیکن بڑی دانشمندی سے، جو کچھ فتح کیا تھا اُس پر قبضہ جاری رکھنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اپنے ضمیر کو انہوں نے یہ کہہ کر تسکین دے لی کہ ان مفتوحہ علاقوں کا مستحق ہم سے زیادہ کون ہے۔ مغلوں کا دعویٰ تو ان علاقوں پر نہ ہونے کے برابر ہے۔ نظامِ دکن کے حقوق آخر ہم سے کس طرح بہتر ہیں۔ کرناٹک کا نواب شاہِ شطرنج سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتا اور بظاہر اپنی

حالت پر اچھا خاصہ مطمئن بھی نظر آتا ہے۔

اسی دوران میں بنگال کا زرخیز اور اہم صوبہ حیرت انگیز اتفاقات کی بنا پر انگریزوں کے قبضہ میں آچکا تھا، اور اُن کے لئے کرناٹک اور بنگال کے مابین کے غیر آباد اور ویران علاقہ کا الحاق کر کے، اِن دونوں کو ملا دینا کچھ مشکل نہ تھا۔

یہ تھی ہندوستان میں انگریزی مقبوضات کی ابتدا۔

کلائیو، ہسٹینگز اور ڈلہوزی

اس مقبوضہ کو کلائیو اور ہسٹینگز نے منظم کیا، ویلزلی نے اِس کو وسیع کیا اور لارڈ ڈلہوزی نے گویا اس کی بنیادیں پختہ کیں۔ گذشتہ عیسوی صدی کے ابتدائی رُبع تک سوائے دریائے سندھ کی وادی کے باقی سارا ہندوستان یا تو براہِ راست انگریزوں کے ماتحت تھا اور یا وہاں اُن کے مطیع رلبجے نوّاب حکومت کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں روس نے بھی اپنی سلطنت شرقاً و جنوباً وسیع کر لی تھی۔ اب وہ افغانستان کے غیر منظم منطقہ میں اپنا رسوخ قائم کرنے کی کھلی کوششیں کر رہا تھا۔ اگر روس کی یہ تجویز کامیاب ہو جاتی تو جیسا کہ ظاہر ہے یہ بات ہندوستان میں انگریزی مفاد کے لئے سخت مضر ثابت ہوتی۔

روس کی کوششیں اگرچہ قبل از وقت تھیں، لیکن انگریزوں نے ان کا جواب دینا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اُنہوں نے افغانستان پر حملہ کر دیا، لیکن یہاں اُن کو ماننا پڑا کہ افغان ہندوستانیوں سے مختلف واقع ہوئے ہیں۔ اگرچہ پٹھانوں کو میدان میں شکست دینا کچھ مشکل نہ تھا لیکن انگریزوں کو پتہ چل گیا کہ اس ملک پہ قبضہ کر کے امن قائم کرنا بڑا مہنگا اور خطرناک سودا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے درّہ خورد کابل کی لڑائی کا فتویٰ التسلیم کر لیا، اور افغانستان سے ٹھنڈے ٹھنڈے واپس چلے آئے۔ کسی فاتح نسل کا یہ ظاہر کرنا کہ نہ صرف انہیں شکست دی جا سکتی ہے بلکہ انہیں اپنی شکست کا اقرار بھی کروایا جا سکتا ہے، نہ صرف اُن کی رعیت کو بدگمان کر دیتا ہے، بلکہ مشکوک دوستوں کو خطرناک وسوسوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس طرح جنگِ افغانستان کا لازمی نتیجہ سکھوں سے جنگ اور آخر کار سن ستاون کا انقلاب تھا۔ انقلاب تو خیر ابھی آنے والا تھا، لیکن ۱۸۵۶ء تک سارا ملک انگریزوں کے ہاتھ میں آ چکا تھا۔

ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی یہ توسیع اُس غزل کا بڑا موزوں مقطع تھا جس کا مطلع اُسی دن لکھا گیا تھا جب انگریزوں نے یہاں تسخیرِ مملکت کی ابتدا کی تھی۔ جب ایک طاقتور اور قیمتی مقبوضات کی مالک سلطنت کی حدود، کمزور حکومتوں سے ملحق ہوں

تو اُسے خواہ نخواہ خود حفاظتی کی غرض سے، یا رعیت کے دفاع کے معمولی فرائض سرانجام دینے کی خاطر، تب تک آگے بڑھتے جانا پڑتا ہے، جب تک یا تو ایسی جغرافیائی رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہو جائیں جو ناقابلِ عبور ہوں، یا جن کا عبور کرنا فضول ہو اور یا اس کی حدود کسی اور ایسی زبردست سلطنت سے جا ملیں جو اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتی ہو۔ غرض ایک ایک قدم کر کے انگریز بڑھتے ہی چلے گئے۔ حکومتِ انگلستان اس توسیع کے خلاف تھی۔ کمپنی کے ڈائریکٹروں کی مجلس ایک متوکل سی انجمن تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ کسی سوداگرانہ کمپنی کے لئے فاتحانہ شکوہ کی نسبت نفع اور سود کا دھیان رکھنا زیادہ اہم ہے نیز انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ سلطنت میں توسیع ہوتی گئی تو ایک دن انجام یہ ہوگا کہ انگلستان کی سرکار مداخلت پر مجبور ہو جائیگی۔ اگر بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو کمپنی کے ملازم بلکہ گورنر جنرل بھی صلح پسند لوگ ہی تھے حالات صلح کے خلاف ثابت ہوئے۔ برطانوی فتوحات ہرگز جارحانہ جنگجوئی کا نتیجہ نہ تھیں سوائے سندھ کے، جس کے الحاق کے لئے کمپنی قطعاً ذمہ دار نہ تھی، جبرہ دستی کی اور کوئی کامیاب مثال اِن واقعات میں نہیں ملتی۔

میر جعفر اور ریاست میسور میں دل ہلا دینے والے سلوک کی کہانیاں صلح پسند ہمسایوں پر جبرہ دستی کی مثالیں نہیں، بلکہ وہ اس بدیانتی اور اخلاقی تنزل کی آئینہ دار ہیں جو چند افراد تک محدود تھا۔ ان افراد میں کچھ کمپنی کے ملازم بھی شریک تھے لیکن وہ صریحاً اپنے افسروں کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔

ڈلہوزی کے کچھ الحاقات ضرور زبردستی کے کرشمے تھے، لیکن وہ

بھی کسی آزاد حکومت پر چیرہ دستی کی مثالیں نہیں۔ وہ تو فقط اندرونی اور ملکی بندوبست میں تبدیلیوں کے نمونے ہیں، جہاں ایک علاقہ جو پہلے کسی راجہ یا نواب کی وساطت سے کمپنی کے ماتحت تھا، اب براہِ راست مقبوضات میں شمار ہونے لگا۔ چاہے کوئی اسے صحیح پالیسی کہے، یا غلط، اس کو چیرہ دستی پر ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۱۸۵۴ء میں ڈلہوزی چاروں طرف اطمینان سے نگاہ ڈال سکتا تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کی سلطنت اب اُن حدود تک پہنچ چکی تھی جو ہندوستان کی قدرتی حدودِ اربعہ کہلا سکتی تھیں۔ اس علاقہ میں ہر طرف کمپنی کا طوطی بول رہا تھا۔ بظاہر کوئی ایسی دنیاوی طاقت نظر نہ آتی تھی جو کمپنی کے اقتدار میں مخل ہو سکتی۔ اس سلطنت کا انتظام حاکموں کے حسبِ منشا، لیکن محکوموں کی بہتری کو مدِنظر رکھتے ہوئے کیا جاتا تھا۔ جن لوگوں کی تربیت فلسفۂ افادیت کے ماحول میں ہوئی تھی اور جن کا حکومت کے متعلق تصور محض مادی تھا وہ یہ سمجھتے تھے کہ حکومت بھی کوئی مشین ہے۔ ایسے لوگوں کا خیال تھا کہ کمپنی یوں ہی ہمیشہ سرسبز اور کامراں رہے گی۔

انگریز کی حکومت مغلوں کی کمزوریوں سے کیوں محفوظ تھی؟

کمپنی وہ کارنامہ سرانجام دینے میں کامیاب ہو چکی تھی جو اُس سے

پہلے کوئی سرانجام نہ دے سکا تھا، یعنی اُس نے اپنا راج پشاور سے لے کر آسام اور ہردوار سے لے کر راس کماری تک پھیلا لیا تھا، پھر بھی کمپنی کی کامیابی کا راز معلوم کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کمپنی ایک کمپنی تھی، وہ کوئی ایک شخص نہ تھی۔ اس لئے بخار اس کا خاتمہ نہ کر سکتا تھا، نہ ہی اُسے شراب کی لت پڑ سکتی تھی، نہ ہی وہ خزانۂ عامرہ کا روپیہ طوائفوں اور ہجڑوں پر ضائع کرتی تھی اور نہ ہی اُس کی حکومت میں دیوانی اور فوج کے اہم عہدے خواجہ سراؤں یا ڈوموں کے سپرد ہونے کا موقع تھا۔ کمپنی اگرچہ مشرق میں حکومت کرتی تھی، لیکن اس میں ایشیائی حکمرانوں کی عادات و خصائل مفقود تھیں۔

کمپنی کی مجلسِ انتظامیہ ایسے عمر رسیدہ اور تجربہ کار سوداگروں پر مشتمل تھی جن میں سے اکثر سکاٹ لینڈ کے باشندے تھے۔ یہ لوگ کسی کام میں محض نشاطِ کار کے لئے ہاتھ نہ ڈالتے تھے۔ وہ جنگ کے بڑے مخالف تھے، اور صرف تبھی لڑائی کا راستہ اختیار کرتے جب اور کوئی راہِ گریز باقی نہ رہتی، یعنی عام طور پر وہ حملہ کئے جانے کے منتظر رہتے، اور کسی ہندوستانی ریاست کا خود بخود کمپنی پہ چڑھائی کرنا ہمیشہ اس کے نظامِ حکومت میں کھلی بے تدبیری کی نشانی ثابت ہوتا تھا۔ ایسی چیرہ دستی، حملہ آور ریاست کے حریفوں کو خائف اور اُس

کے ہمسایوں کو بد گمان کر دیتی۔ اس طرح کمپنی ہمیشہ دوسری ہندوستانی ریاستوں کی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی، اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ہندوستانی ریاستیں کبھی بھی کمپنی کے خلاف متحدہ محاذ قائم نہ کر سکیں۔

کمپنی دولتمند تھی۔ دو زرخیز صوبوں کی آمدنی اس کے قبضہ میں تھی۔ یہ درست ہے کہ مدراس جنگ سے برباد ہو چکا تھا، تاہم وہاں کا نظامِ آبپاشی سب ٹھیک ٹھاک تھا، اور بہر صورت یہاں کی تباہی ملک کے دوسرے حصّوں کی تباہی کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھی۔ بنگال میں انگریزوں کے حملہ سے اگر کچھ نقصان ہوا تو وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ پھر کمپنی کی اپنی تجارت کا نفع الگ تھا۔ مزید بریں کمپنی کی دیانت اور ساکھ کی کچھ ایسی دھاک بیٹھ چکی تھی کہ اُسے ہمیشہ ہندوستان میں آسانی سے قرضہ مل جاتا تھا۔ اس قرضہ کی شرائط چاہے آجکل گراں نظر آئیں لیکن اُن دنوں اِن شرائط پر قرضہ حاصل کرنا کمپنی کی بڑی کامیابی سمجھا جاتا تھا اور پھر اگر کوئی ایسا ہی موقعہ آپڑتا تو لنڈن کی دولت اور برطانوی حکومت کے خزانے اُس کی پشت پناہی کو موجود تھے۔

اس دوران میں کمپنی کی مالی حالت اکثر اچھی رہی، اور اُس کے سرمایہ کا انتظام بھی قابل لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ کمپنی فوجی ملازمت کے

متلاشیوں کیلئے بڑا اچھا آقا تھی اور ہندوستان ان دنوں فوجی ملازمت کے متلاشیوں کی منڈی بنا ہوا تھا

انگریز کی عسکری برتری

سوائے بغاوتِ امریکہ کے چند ایام کے انگریزوں کو نہ صرف ہمیشہ سمندر پر اقتدار حاصل رہا بلکہ اُن کی بحری طاقت فی نفسہٖ مسلّمہ تھی۔ کئی مخالف سلطنتوں کو خیال پیدا ہوا کہ ہندوستان کی تجارت پر حملہ کر کے انگریزوں کو پریشان کیا جائے، اور اس مقصد کے لئے بہتیرے فرانسیسی گماشتے بھی آتے جاتے رہے۔ صفحۂ کاغذ پر قابلِ تعریف سازشیں تیار کی جاتی رہیں، لیکن جونہی یہ پتہ چلتا کہ کوئی یورپین حکومت ہندوستان میں کافی فوج نہیں بھیج سکتی تو سوائے چپکے ہو رہنے کے اور کوئی چارہ نظر نہ آتا۔ اِن سازشوں سے اُلٹے انگریزوں کو توسیعِ مملکت کے مواقع میسر آجاتے رہے۔

انگریزوں کی فوجی طاقت ناقابلِ تسخیر تھی۔ کمپنی اور سرکار کے انگریزی رسالوں کے علاوہ ہندوستانی سپاہیوں کا ایک ہمیشہ بڑھتے رہنے والا لشکر اُن کی امداد کو کمربستہ تھا۔ یہ ہندوستانی سپاہی پہلے پہل فرانسیسیوں نے بھرتی کئے تھے، لیکن ان کو قواعد سکھانے، اور قواعد سکھا کر اُن سے عالیشان کارنامے سرانجام دلانے کا سہرا انگریزوں کے سر ہے۔ ایسے ہندوستانی سپاہی نرے بھاڑے کے ٹٹو نہ ہوتے تھے۔ اس میں شک

نہیں کہ اُن کو کمپنی کی ملازمت میں کھینچ لانے کا باعث باقاعدہ تنخواہ اور حسن سلوک کا لالچ تھا، لیکن جب وہ ایک دفعہ ملازم ہو جاتے تو اُن میں ایک عجیب نوعیت کی وفاداری پیدا ہو جاتی تھی جس کی بنیاد اُن کے اُس اعتماد پر تھی جو اُنہیں کمپنی کے "اقبال" پر تھا۔ ہندوستان اُس زمانہ میں ایسے جنگجوؤں سے بھرا پڑا تھا جن کا کوئی آقا نہ تھا۔ یہ لوگ بڑے شوق سے کمپنی کے ہمیشہ فتحیاب رہنے والے جھنڈے کے ماتحت جمع ہو گئے۔

مغرب کی حربی فوقیت کا راز

صدیوں سے اہلِ یورپ کو علم تھا کہ ۳۷۵ء میں ایڈریانوپل کے مقام پر روس کی سوار فوج کو روما کی پیدل فوج کے مقابلہ میں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ اب ممکن نہیں، بلکہ اب تو پیادہ فوج سواروں سے بازی لے جاتی ہے۔ نئے ہتھیاروں کی ایجاد نے پہلے لمبی کمان اور پھر بندوق کی صورت اختیار کر کے سواروں کی برتری کو عرصہ گذرا ناکارہ کر دیا تھا۔ اس پر سنگین کے موجد نے پیادوں کے ہاتھ میں ایک ایسا حربہ دے کر جو بیک وقت بندوق اور برچھی دونوں کا کام دے سکتا ہے سواروں کی قدر و قیمت اور بھی گھٹا دی۔ اس کے بعد رومی پیادوں کی قواعد کو تازہ کیا گیا۔ اس قواعد نے پیادوں کی فوج میں ایک ایسی

لچک اور مدافعانہ و جارحانہ اقدام کو فوراً ایکے بعد دیگرے اختیار کرنے کی ایسی استعداد پیدا کر دی، جس کا مقابلہ سوار ہرگز نہیں کر سکتے۔ آخرکار جنگِ سی سالہ کے دوران میں سواروں، پیادوں اور توپ خانہ کو ملا کر استعمال کرنے کا وہ طریقہ ایجاد ہوا جس نے خالی سواروں کو بالکل نکما کر دیا۔ نظر بین فرانسیسیوں نے سلطنت مغلیہ کے عہد میں ہی دریافت کر لیا تھا کہ یوروپ کے نمونہ پر تیار کی ہوئی تھوڑی سی فوج بھی ہو تو ہندوستان میں اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت کسی میں نہیں چنانچہ کرناٹک میں فرانسیسیوں کی کامیابی کا باعث اسی راز سے آگاہی تھی۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں ابھی سواروں ہی کا دور دورہ تھا۔ جلد ہی ثابت ہو گیا کہ ایک چھوٹے سے چھوٹا پیدل رسالہ، بشرطیکہ اُس کا ضبط و نظم صحیح ہو، اور اس کی کمان کسی لائق اور تجربہ کار افسر کے ہاتھ میں ہو، ہندوستان کی بھاری سے بھاری افواج کو شکست دے سکتا ہے۔ اسی دوران میں یہ بھی دریافت ہوا کہ پیادے سواروں کو تعاقب میں تھکا کر منتشر کر سکتے ہیں۔ متحرک توپ کی ایجاد کے بعد یہ بات یقینی ہو گئی کہ سوار فوج جہاں کہیں پیادوں کے قابو میں آئی فوراً تتر بتر کر دی جائے گی۔

یہ سچ ہے کہ ہندوستانی حکمرانوں نے بھی جلد ہی اجنبیوں کی چالاکی

کا راز پالیا، اور اُنہوں نے بھی انگریزی نمونہ پر افواج قائم کرلیں۔ لیکن یہ نقل ہرگز اصل کا لگا نہ کھا سکتی تھی۔ اوّل تو بہترین سپاہی ہمیشہ کمپنی کی ملازمت کو ترجیح دیتے تھے۔ دوسرے عرب یا افغان سپاہی گوروں کی پلٹنوں کے مقابلہ میں برابر کے حریف نہ تھے۔ تیسرے اچھے افسروں کی بھی کمی تھی۔ دراصل نیا طریقۂ جنگ ہندوستانی دماغوں کے لئے بالکل اجنبی تھا اور ہندوستانی افسر اس کا استعمال کرنے کے ناقابل تھے۔ اِن وجوہات کی بنا پر ہندوستانی حکمرانوں نے فرنگی افسر ملازم رکھنے شروع کر دیئے۔ یہ لوگ اگرچہ بہادر اور وفادار تھے، لیکن آخر تھے تو پھر اجنبی اور بھاڑے کے ٹٹو! خود اُن کے آقاؤں کو بھی اُن پر پورا اعتبار نہ تھا۔ اس وجہ سے جن رسالوں کے افسر فرنگی ہوتے تھے اُن کو جان بوجھ کر کمزور رکھا جاتا تھا، اور ہندوستانی حکمرانوں کا حقیقی اعتماد وہی اپنی پرانی اور دیسی طرز کی بھدّی "کثیر التعداد" گراں خرچ، اور ناکارہ فوج پر تھا۔

اگرچہ کمپنی کو میسور، سیندھیا اور سِکھوں کا مقابلہ جان توڑ کر کرنا پڑا، اور خاص طور پر سکھوں کے پاس تو ایک زبردست توپ خانہ بھی تھا۔ لیکن انگریزوں کی فتح ہمیشہ یقینی تھی۔ ایسے دشمنوں کا مقابلہ ذرا زیادہ مشکل تھا جو اگرچہ سوار فوج استعمال کرتے تھے، لیکن کہیں جم کر نہ لڑتے

تھے، لیکن نتیجہ یہاں بھی ایک ہی تھا۔ یہ صرف افغانوں کا خروجِ عام تھا جس نے انگریزوں کے بھی دانت کھٹے کر دیئے۔

ہندو اور مسلمان دونوں حبِّ وطن سے عاری ہیں!

افغان ایک آزاد اور سرکش قوم ہیں۔ انگریز اگرچہ پٹھانوں کے غیر منظّم علاقہ میں امن و امان قائم کرنا چاہتے تھے، لیکن وہ ساتھ ہی اُن کے گلے میں غلامی کا طوق بھی آویزاں کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات افغانوں کو ہرگز منظور نہ تھی، اور اس لئے وہ خروجِ عام کی صورت میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہندوستان میں انگریزوں کو ایسی کوئی مشکل درپیش نہ آئی کیونکہ یہ ملک آٹھ صدیوں سے غلامی کا عادی تھا۔ ہندوستانی حُبِّ وطن سے ویسے ہی ناآشنا تھے جیسے دوسری ایشیائی قومیں ناواقف ہوتی ہیں۔ اُن کا تعلقِ خاطر اپنے گاؤں سے وابستہ ہوتا ہے یا اپنی برادری اور اپنے ہم مذہبوں سے۔ گجراتی مسلمان ایک ایسا مسلمان ہے جو اپنی زندگی کے دن گجرات میں کاٹ رہا ہو۔ اُس کے نزدیک چین یا قسطنطنیہ کا مسلمان اُس کا ہم وطن ہے۔ گجرات کے ہندو اور عیسائی اُس کے نزدیک اجنبی ہیں۔ اُس کی اُلفت کسی خطّۂ ارض سے مخصوص نہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ بعض شاذ و نادر مثالوں میں کسی علاقہ کے باشندوں کی قومیّت بھی کچھ ایسی ارضی

حدود کی پابند تھی کہ اُسے حُبّ وطن کا نام دیا جا سکتا ہے - ایسی ہی ایک مثال کورگ کی تھی۔ پھر بعض جگہ قبائلی رشتے ایسے مضبوط تھے کہ مذہب اور نسل اُن کے سامنے ماند پڑ گئے تھے - ایسی مثالوں میں جہاں کہیں یہ قبیلے کسی خاص علاقہ میں مقیم تھے، اُسے بھی ایک وضع کی مقامی حُبِّ وطن کہا جا سکتا ہے - اس دوسری مثال کے نمونہ کے طور پر بھوپال اور نیپال کا نام لیا جا سکتا ہے - لیکن یہ شاذ و نادر مقامی خصوصیات تھیں جن سے کوئی کلیہ اخذ نہیں کیا جا سکتا - بلکہ اگر تاریخی لحاظ سے دیکھئے تو اس مقامی حب الوطنی کا نتیجہ یہی ہوا کہ جب کبھی کسی ہندوستانی حکمران کی طرف سے حملہ کا خطرہ پیدا ہوا تو انگریزوں سے امداد طلب کی جاتی رہی - یہ انگریزوں ہی کی مداخلت کا نتیجہ ہے کہ بھوپال، کورگ، اور راجپوت ریاستوں کی میونسپل آزادی برقرار نظر آتی ہے - نیپال سے انگریزوں نے میانہ روی کا سلوک اختیار کرنے میں ہی مصلحت دیکھی۔

غرض مسلمانوں اور ہندوؤں کا وطن اسلام اور ہندو دھرم تھا نہ کہ زمین کا کوئی ٹکڑا - اُن کا حکمران اللہ تھا یا کوئی دیوتا مہاراج بہرحال اُنہیں دنیاوی نوّاب راجاؤں سے کوئی دلی وابستگی نہ تھی - اِن نوّاب راجاؤں میں بھی کوئی ایسی بات نہ تھی جس کی خاطر لوگ اُن پر اپنی جان نچھاور

کرنے کو آمادہ ہو جاتے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستان
بہت سی چھوٹی اور کمزور ریاستوں سے بھرا پڑا تھا۔ اِن
ریاستوں کے حکمران زیادہ تر ایسے جری اور دلیر سپاہیوں کی نااہل
اولاد تھے جنہوں نے شروع شروع میں قسمت کو موافق پا کر اقتدار
پر قبضہ کر لیا تھا۔ اجنبیّت کے معیار پر پرکھا جائے تو اِن لوگوں کو
کمپنی کے مقابلہ میں حکومت کرنے کا کچھ زیادہ حق نہ تھا۔ ہاں ظلم و ستم
میں اُن کا پلّہ ضرور بھاری تھا۔ اگر مرہٹوں کو چھوڑ دیا جائے تو ہندوؤں
میں کوئی قابلِ ذکر حکمران نہ تھا مسلمان بھی رو بہ انحطاط تھے۔ ہندوستان
میں اسلامی اقتدار شروع سے اُن بیرونی لوگوں پر مبنی تھا جو ایران اور
وسطِ ایشیا سے برابر یہاں آتے رہتے تھے۔ اب اِن ممالک میں
بعض داخلی سیاسی انقلابات کے باعث یہاں سے ہندوستان میں
آنے والے غیر ملکیوں کی آمد مسدود ہو گئی۔ مزید بریں پنجاب میں
سکھوں کے عروج نے اِن آنے والوں کا راستہ ہی بند کر دیا۔ اس
طرح اٹھارہویں صدی کے ہندوستانی مسلمان حکمران تیسری یا چوتھی
پشت میں کسی ترک یا ایرانی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ہندوستان
کی آب و ہوا نے اِن لوگوں میں نسوانیت اور رقّت پیدا کر دی تھی۔
اگر اُن کی موروثی جبلت کبھی جوش مارتی تو اُس کا اثر درندوں جیسی

مغلوب الغضبی کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ یہ ظالم اور آوارہ شہزادے حرم کے مرغِ خانگی تھے۔ اِن میں رعایا کے دلوں کو موہ لینے والی کوئی کشش باقی نہ رہی تھی۔ اس پہ طرّہ یہ کہ اِن میں سے اکثر شیعہ ہونے کے باعث ہندوستان کے سُنّی مسلمانوں میں ہر دلعزیز نہ ہو سکتے تھے، بلکہ سُنّی تو انہیں کافر ہی خیال کرتے تھے۔

حیدر علی، ٹیپو، شاہ دہلی اور مرہٹے

حیدر علی خداداد ذہانت کا مجسمہ تھا، اور اس کا بیٹا ٹیپو سلطان بھی ایک قابل اور زبردست حکمران تھا۔ ایک ایسے علاقہ میں جو آج تک ایک خاص نوع کے ہندو تعصب کا مرکز ہے، یہ دونوں باپ بیٹے اسلام کو رواج دینے، اُس کے قیام میں کوشاں رہنے، اور اس کی تبلیغ کرنے کے باعث، کسی حد تک مسلمانوں کے قومی راہنما بھی سمجھے جاتے تھے، لیکن انجام کار یہی امر بجائے خود انگریزوں کے حق میں ہندوؤں کی امداد حاصل کرنے کا باعث ہوا۔ پھر حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی فاتحانہ یلغاریں خالی ہندوؤں یا عیسائیوں کے خلاف محدود نہ تھیں، بلکہ جنوبی ہند کے اسلامی علاقے بھی اُن کی دستبرد کا مزا چکھ چکے تھے۔ مزید بریں ٹیپو سلطان کی بے چین اور اصلاح طلب طبیعت قدامت پسندوں کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔

دہلی کا برائے نام شہنشاہ" مدتوں برطانوی سایۂ عاطفت کا مشتاق رہنے کے بعد آخر کار انگریزوں کی پناہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بعض مسلمان تو ضرور اُس کے نام اور مرتبہ کا فائدہ اُٹھا کر سازشیں کرتے رہے، لیکن اب خود اس کے لئے ایک ایسی طاقت کی کھلی مخالفت کرنا ممکن نہ تھا جو اُس کے رعب و داب اور وقار کی مالک بن چکی تھی۔

مرہٹے اپنے گھر میں ایک اچھی خاصی وطن پرست قوم تھے، لیکن انگریزوں کے مقابلہ میں نہ تو مسلمان انہیں ترجیح دینے کو تیار تھے اور نہ ہی وہ ہندوؤں کو پسند تھے۔ اصولاً مرہٹہ سرکار ایک ہندو حکومت تھی اور اُن کا مقصد مسلمانوں کے خلاف بغاوت کرنے والی ہندو طاقتوں کو ایک مرکز پر جمع کر دینا تھا لیکن عملاً مرہٹوں نے جہاں سلطنتِ مغلیہ کو متزلزل کر دیا وہاں ساتھ ہی وہ ہندو مسلمان دونوں پر یکساں ظلم و ستم کرتے تھے، اپنے علاقے سے باہر وہ حکومت کے کسی قسم کے فرائض پورے کرنے کی ذمہ داری نہ سنبھالتے تھے۔ ان کا کام خالی ٹیکس وصول کرنا تھا۔ یہ ٹیکس ہندو مسلمان دونوں کے لئے یکساں تھا جب ٹیکس کی آمدنی کفایت نہ کرتی تو وہ لوٹ مار کرنے کو نکل جاتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مرہٹہ سرداروں نے انفرادی طور پر آزادانہ حکومتیں قائم کر لیں، لیکن

یہ سردار اپنے علاقہ سے باہر ہرگز مقبولِ عام نہ تھے

فرنگی حاکموں کی ہردلعزیزی کی وجوہات

الغرض ہندوؤں کا تو کوئی لیڈر ہی نہ تھا، اور اس سے بھی بدتر یہ کہ ہندو سرداروں سے عوام متنفر تھے۔ مسلمانوں کی اُمیدیں شمالی سرحد سے وابستہ تھیں، لیکن وہاں سے کوئی مستقل امداد نہ آئی۔ نادر شاہ کے حملہ نے شہنشاہِ دہلی کو ایک ہنگامی مہلت دے دی۔ احمد شاہ ابدالی کی یلغاروں نے مرہٹوں کی کمر توڑ ڈالی، اور اسلام کے لئے سانس لینے کا وقفہ مہیا کر دیا، لیکن کوئی لائق اور مستقل حکومت قائم نہ ہو سکی۔ قصہ مختصر یہ کہ ہندوستان ایک بغیر خاوند کے بیوی تھی۔ جسے گھر ڈال لینے کا کمپنی کو بھی ویسا ہی حق پہنچتا تھا جیسا کسی دوسرے دعویدار کو۔ کمپنی کے برتاؤ میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو ہندو یا مسلمان قدامت پسندوں کو ناگوار گذرتی۔ کمپنی کے ملازم ضرور فرنگی تھے، اور ان کے رسم و رواج بھی انوکھے اور غیر مہذبانہ معلوم ہوتے تھے، لیکن وہ جو کچھ کرتے تھے آپس میں ہی کرتے تھے۔ انہیں اپنے عقائد اور خیالات دوسروں پر زبردستی لادنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ وہ عام طور پر عیسائی سمجھے جاتے تھے، لیکن انہیں اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا کوئی خبط نہ تھا، برعکس اس کے اگر کوئی اُن کا مذہب اختیار

بھی کرلے تو وہ اُلٹا اُس کو بدگمانی کی نگاہ سے دیکھتے۔ کمپنی اپنے ملازمین کے لئے پادری اور گرجے مہیّا کرنے میں انتہا درجے کی کنجوس تھی، اور یہ ملازمین بھی اِن روحانی تفریحات کے کچھ ایسے شائق نہ تھے۔ کافروں کے ماتحت رہنا خوشگوار نہیں ہوتا، لیکن کافر حاکم متعصّب اور ظالم حکمرانوں کے مقابلہ میں یقیناً قابلِ ترجیح سمجھا جاتا ہے۔ کمپنی کے ملازموں کی ہٹ دھرمی اور ضد معدودِ چند امور تک محدود تھی۔ ایک نظر سے دیکھا جائے تو وہ کسی حد تک ہندو مت سے مبالغہ آمیز ہمدردی کا اظہار کرتے رہے۔ مزید بریں کمپنی کا بنایا ہوا آئینِ نظم ونسق اور قانونِ عدالت بھی ہندوستان کے دونوں عظیم الشان مذاہب کی یکساں حفاظت کرتے تھے۔ کم از کم روپیہ کے لین دین، اور وراثت کے معاملات میں تو مذہبی قوانین میں ہرگز مداخلت نہ کی جاتی تھی۔

مقامی رسم و رواج اور مذہب کے متعلق فرنگی کی روش

مذہب کی طرف سے انگریزوں کی یہ لاپرواہی کچھ اس لئے نہ تھی کہ وہ ہندو مت یا اسلام کو عیسائیت پر ترجیح دیتے تھے۔ نہ ہی وہ مشرق کے تمدّن کو مغربی تہذیب کے مقابلہ میں بہتر خیال کرتے تھے۔ مذہب سے اُن کی لاپرواہی کا سبب یہ تھا کہ کمپنی کے ڈائریکٹر سوداگر

تھے، اور پرتگیزوں کے تجربہ نے ثابت کر دیا تھا کہ مذہب اور تجارت کا ساتھ نہیں چلتا۔ انگریزوں کو اس امر کا افسوس تو ضرور تھا کہ اُن کی ہندو اور مسلم رعایا اُن کے عقائد کی رو سے کافر تھی، لیکن وہ مذہب کی خاطر تجارت قربان کر دینے کو ہرگز تیار نہ تھے۔

علیٰ ہذا القیاس کمپنی ہندوستانیوں کے رسم و رواج میں دخل در معقولات کی بھی حامی نہ تھی۔ اس احتراز کا باعث یہ نہ تھا کہ کمپنی یا اس کے ملازم یہاں کی معاشرت کو بنظرِ استحسان دیکھتے تھے۔ ہندوستانی رسوم سے ہمدردی رکھنے والے لوگ ابھی پیدا نہ ہوئے تھے۔ اگر اٹھارھویں صدی کے اکھڑ مزاج انگریز کو بتایا جاتا کہ لواطت، تعدّدِ ازدواج، بچپن کی شادی، ستی، سود خوری، جھوٹی قسمیں کھانا، جعلسازی، دغابازی، اور ایک تنزّل پذیر تمدّن کے دیگر لوازمات کی نگہداشت اُس کا فرضِ منصبی ہے تو غالباً وہ ایسی نصیحت کرنے والے کو سیدھا پاگل خانے کا راستہ دکھاتا، کیونکہ اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی طرزِ معاشرت روبہ انحطاط تھی۔ ہندو تمدّن کی بہارِ شباب تو صدیوں پہلے رخصت ہو چکی تھی، اور اب اس سوکھے ٹھنٹھ سے کسی پھل کی توقع رکھنا اُمیدِ لاطائل تھی۔ رہی اسلامی تہذیب تو اوّل تو اس کو ہندوستانی تہذیب کہنا بجا نہ ہوگا کیونکہ اس کا تمام تر انحصار

مغرب کے اسلامی ممالک سے آنے والی کمک پر تھا۔ دوسرے اب اِن اسلامی ممالک پر بھی سیاہی کے بادل چھا رہے تھے۔ اسلام ترکوں کے آغوش میں رفتہ رفتہ اُس خوابِ غفلت کا شکار ہو رہا تھا جس سے بیداری کے آثار اب کہیں کہیں پیدا ہونے لگے ہیں۔

ہندوستانی تہذیب کے متعلق انگریزوں کی رائے

بہرکیف جب تک کمپنی کے گاہک اپنے قرضے ادا کر دیں، اور اپنے معاہدوں پر قائم رہیں، اُسے اُن کے اخلاقیات کے نظریات سے رواداری کا برتاؤ کرنے میں کوئی عذر نہ تھا۔ بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو انفرادی طور پر انگریزوں کو اِن باتوں کی کچھ ایسی پروا بھی نہ تھی۔ شخصی لحاظ سے انگریز طبعاً اجنبیوں کو اپنے سے ذلیل، عجیب اور ناقابلِ فہم تصور کرتے ہیں۔ انہیں اجنبیوں سے یہ توقع ہی نہیں ہوتی کہ وہ انگریزی خیالات کے مطابق زندگی بسر کریں۔ ہندوستانیوں کی اصلاح کے لئے کوشش کرنا خلافِ مصلحت نظر آتا تھا، اور پھر اس میں کامیابی کا بھی کوئی امکان نہ تھا۔ اندریں حالات خاموشی ہی کو ترجیح دی گئی۔

بعض ایسی جوشیلی شخصیتیں بھی تھیں جنہیں اُمید تھی کہ مغربی تہذیب کی نمائش اور خاص طور پر مغربی طریقۂ تعلیم کے ذریعہ کایا پلٹ کی جا

سکتی ہے۔ ایسے لوگ سرکاری حلقوں میں مشتبہ نظروں سے دیکھے جاتے تھے کیونکہ ڈر تھا کہ وہ کوئی خطرناک ہیجان نہ پیدا کر دیں۔ یہ لوگ اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ ہر قوم کا تمدّنی ارتقا، ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا، اور جب وہ اس حدِ کمال تک پہنچ جائے تو زوال کا آغاز یقینی ہے۔ جب کسی قوم پر یہ نوبت آجائے تو پھر نہ تو اُس میں وہاں پہنچنے کی طاقت رہتی ہے جہاں سے اُس کے تنزّل کا آغاز ہوا تھا، اور نہ ہی پھر وہ خود بخود کسی نئے تمدّن کی بنیاد ڈال سکتی ہے۔ ایسے حالات میں صرف جدید خیالات کی ترویج سے کوئی مفید نتیجہ اخذ نہیں ہو سکتا، بلکہ کسی ایسی زوال پذیر نسل کی ذہنیت میں کلّی انقلاب پیدا کرنا ہو، اور اُسے ترقی کی کسی نئی شاہراہ پر ڈالنا ہو، تو اس میں تازہ خون کی آمیزش بھی لازمی ہے۔ آپ محض درسی کتابیں رٹا کر انسانیت کے بدترین نمونوں کو بہترین نہیں بنا سکتے۔ اٹھارہویں صدی کی سب سے بڑی غلطی، اور ایک ایسی غلطی جو آج تک چلی آرہی ہے، یہ تھی کہ ہر آدمی کو انسانیت کا مکمل نمونہ بنایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اس خبط کے معتقد ہوتے ہیں اُن کے نزدیک پیدائش کے وقت ہر شخص کی فطرت اور استعداد یکساں ہوتی ہے۔ بلوغت کے بعد مختلف انسانوں میں جو اخلاقی اور ذہنی تفاوت پائی جاتی ہے، وہ

تعلیم و تربیت کا اثر ہے۔ یہ نظریہ نسبی اثرات کو قطعاً نظر انداز کر دیتا ہے، اور اس لئے سرے سے ہی غلط ہے۔ ایک سیاست دان کے لئے یہ غلط اصول نہایت مہلک ثابت ہو سکتا ہے، لیکن ہندوستان میں ابھی اس نظریہ کے حامیوں کو اقتدار حاصل نہ ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نظریہ کے خطرناک نتائج بھی یہاں ظاہر نہ ہوئے تھے۔ انگریز مزے سے اپنے بسم اللہ کے گنبد میں بند بیٹھے تھے۔ وہ اپنے مخصوص تمدن پر قانع تھے، اور انہیں اپنے طریقِ معاشرت کی برائیوں کا ہرگز احساس نہ تھا، تاہم اس متکبرانہ خود پرستی کے باوجود وہ ہندوستانیوں سے رواداری کا سلوک کرنے کو تیار تھے، چاہے وہ دل میں ہندوستانی تہذیب و تمدن اور یہاں کے باشندوں کو نفرت ہی کی نگاہ سے دیکھتے ہوں۔

ہندوستان میں تمدن کا انحطاط

سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی معاشرت کے انحطاط کی رفتار بڑی تیز تھی۔ اخلاقی رہنما ہونے کے لحاظ سے مذہب کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ حد یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں وہ اخلاقی اصول بھی مفقود ہوتے چلے جا رہے تھے جو لیڈروں کو جماعت بندی میں مدد دیا کرتے ہیں۔ مثلاً سردار کی اطاعت اور وفاداری، ساتھیوں سے

ہمدردی، یا اپنی جماعت کے اراکین سے عہد کی پاسداری - یہ سب باتیں یہاں مٹتی چلی جارہی تھیں - پندرھویں صدی کے اطالیہ کی طرح ہندوستان غداری کا بدترین نمونہ تھا - ایشیا میں اوامر و مناہی کی ترویج ہمیشہ سے مذہب کے ہاتھ میں رہی ہے، اِس لئے مذہب کے ساتھ ہی قانونی پابندیاں بھی اڑنچھو ہوگئیں علم و تقدیس کے جو بچے کھچے نمونے باقی تھے اُنہوں نے حجروں یا جنگلوں میں گوشہ نشینی اختیار کرلی - رشوت ستانی عالمگیر تھی - عدالتیں اور ججز کھلے بندوں انصاف کے گلے پر چھری پھیرتے تھے - ملک میں کوئی ایسی انتظامی طاقت نہ تھی جو عدالت کے فیصلوں پر عملدرآمد کروا سکے - ملک کی مالی حالت بھی مخدوش تھی - تجارت مسدود تھی - سوائے اُن بستیوں کے جو انگریزوں نے قائم کر رکھی تھیں، ملکی صنعت و حرفت کے مرکز تباہ ہو چکے تھے - تین نسلوں تک تمام ملک ایک لامتناہی، تباہ کن اور لایعنی خانہ جنگی میں مبتلا رہا - میلوں تک زمین کے زرخیز خطے ویران ہوگئے -

ان حالات میں اگر مظلوم ہندوستانیوں نے انگریزی راج کو اپنے زخموں کے لئے مرہم خیال کیا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں - یہ ٹھیک ہے کہ بیس سال تک کمپنی کی حکومت خاصی جابرانہ تھی، لیکن کمپنی کے

مظالم اعلیٰ طبقہ تک محدود تھے۔ زمینداروں کو کمپنی نے کوئی نقصان نہ پہنچایا تھا۔ پھر جونہی اِن مظالم کی داستانیں انگلستان پہنچیں، فوراً اِن کے انسداد کے لئے مناسب تدابیر اختیار کی گئیں۔ کمپنی اپنے ہندوستان کے گماشتوں اور ملازموں میں ایک اعلیٰ اخلاقی معیار قائم کرنے پر سختی سے مصر تھی۔ چنانچہ وارن ہیسٹنگز سے جو سلوک کیا گیا اُس کا باعث اُس کی حکمتِ عملی کی نوعیت نہ تھی بلکہ اُس نے اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو طریقِ کار اختیار کیا وہ ناپسندیدہ تھا۔ اُس نے جو کچھ کیا وہ ہر طرح قابلِ عذر تھا۔ صرف شکایت یہ تھی کہ جس طرح کیا، وہ نامناسب تھا۔ منصف مزاج ناظرین سے یہ امر پوشیدہ نہیں رہ سکتا کہ وارن ہیسٹنگز کا طرزِ عمل ایک عام انگریز مدبر کا طرزِ عمل نہ تھا، بلکہ وہ تو دروغِ مصلحت آمیز کے اصول کا اطلاق مشرق میں کرنا چاہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک خشک، اپنی دھن کا پکا، اور اخلاقی الجھنوں سے مستغنی حکمران تھا۔ اگر اُس کی حکمتِ عملی متقاضی ہوتی تو وہ جبر و ستم سے بھی دریغ نہ کرتا تھا۔

برکاتِ حکومتِ انگلشیہ

کمپنی نے ایک حکمران کے ابتدائی اور معمولی فرائض سرانجام

دینے سے تجاوز نہ کیا۔ یہ کمپنی ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ امن امان نئے سرے سے قائم ہو گیا۔ عدالتیں انصاف کرنے لگیں اور حملہ آوروں کی یلغاریں رک گئیں۔ یہ حاکمانہ فرائض سرانجام دینے کے اخراجات پورے کرنے کے لئے لگان جمع کیا جاتا تھا۔ یہ سب کاروبار اب اس مستعدی اور لیاقت کے ساتھ سرانجام دیئے جاتے تھے جس کی مثال پہلے ہندوستان میں نہ تھی۔ رعایا کا کثیر حصہ کمپنی کے راج کو نعمت غیر مترقبہ خیال کرتا تھا۔ ریاستوں کے باشندے ہر وقت دست بہ دعا رہتے تھے کہ خدا انہیں بھی اس سایۂ عاطفت سے بہرہ ور کرے۔ جو زمینیں صدیوں سے بنجر پڑی تھیں ان میں پھر زراعت ہونے لگی۔ شہر دوبارہ آباد ہو گئے۔ نئے قصبوں کی بنیادیں پڑنے لگیں۔ تجارت دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی گئی۔ مندر اور مسجدیں پھر آباد ہونے لگے۔ غنڈوں، بدمعاشوں، اٹھائی گیروں، ٹھگوں اور درباری لیموں نچوڑوں کو ضرور کمپنی کا راج ناگوار تھا، لیکن اب اِن لوگوں کی میعاد پوری ہو چکی تھی۔

ایشیائی سازشوں کے ایک مختصر تجربہ کے بعد کمپنی اور اُس کے متعلقین نے سمجھ لیا کہ سانچ کو آنچ نہیں۔ اس ضرب المثل کے معنی اکثر غلط سمجھے جاتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ منہ پر کھری کھری کہہ

دینا بھی ایک اچھی خاصی سیاسی چال ہے۔ یہ جو بسا اوقات بڑے زور شور سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انگریز دل سے جھوٹ اور داؤ فریب بن نہیں آتے، اس کا میں قائل نہیں۔ ایسی بہتیری مثالیں موجود ہیں جن سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ہم اس میدان میں بھی کسی کی بہو بیٹی سے کم نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری اعلیٰ قابلیت رکھنے والی انگریز قوم جل دینے میں ایشیائیوں سے بازی لے جا سکتی ہے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ راستبازی اور صادق القول ہونے کی شہرت، دھوکہ باز اور جعلساز کہلانے کی نسبت زیادہ مفید تھی۔ ایک ہندوستانی حکمران کے لئے یہ ایک نئی خوبی تھی، اور اس لئے اس کی قدر کی جاتی تھی۔

فرنگی راج کے متعلق عام ہندوستانیوں کی رائے

کچھ شک نہیں کہ رعایا نے اُس شان و شوکت اور دریا دلی کی کمی کو محسوس کیا جو وہ اپنے ایشیائی حکمرانوں میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔ غالباً وہ ایسے دو چار مظالم بڑی خوشی سے برداشت کر لیتے جن کا باعث متلوّن مزاجی ہو۔ وہ موجودہ عدالتوں کی غیر جانبداری کے مدّاح تھے، لیکن ساتھ ہی وہ محسوس کرتے تھے کہ انصاف کی رفتار سست، اِس کا نتیجہ غیر یقینی، اور اخراجات پہلے سے زیادہ

ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی وہ ٹھنڈی سانس لے کر قاضی جی کے عہد کی آئی چلائی بھی یاد کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کی عادت ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کے عالیشان محلّات اور عشرت گاہیں دیکھ کر مسرور ہوتے ہیں۔ اس سے بادشاہ کی خوش مذاقی، تموّل، اور جبروت کی شہادت ملتی ہے۔ ہاں اگر ان عمارات کے لئے عامۃ الناس کی زمینیں ضبط کی جائیں تو پھر ضرور ذرا شکایت پیدا ہوتی ہے۔ اگر فتوحات سے واپس آنے پر افواج کو جاگیریں اور انعامات عطا کئے جاتے، تو ہندوستانی یقیناً اس سے خوش ہوتے۔ اُنھیں فلک بوس گرجوں کی تعمیر پر کوئی اعتراض نہ تھا، بشرطیکہ اُن کی مسجدیں اور مندر محفوظ چھوڑ دیئے جائیں۔ اگر گاہے گاہے کمپنی کی فیّاضی علماء فضلاء، اور مذہبی پیشواؤں کو مالامال کر دیتی تو اُس کی رعایا اسے جائز محض تصوّر کرتی، بشرطیکہ خود رعایا کے مذہبی راہنما بھی اس عنایت سے فیضیاب ہوتے۔ اِن لوازماتِ سلطانی کی غیر موجودگی اُن کے لئے باعثِ تعجب تھی۔ وہ منڈیا ہلا ہلا کر کہتے تھے کہ یہ فرنگی تو بس پاگل ہیں، لیکن باوجود اس اعتراض کے اِنھیں فرنگی کے قائم کردہ امن و امان سے متمتع ہونے میں کوئی عذر نہ تھا، کیونکہ وہ اس امن و امان سے عرصۂ دراز تک محروم رہ چکے تھے۔

دیسی راجے اور نواب

ہندوستان کے نواب راجے بھی انگریزی حکومت کے سایۂ عاطفت میں زوال کی ناگزیر آندھیوں سے محفوظ، اس عالمگیر امن و امان اور آسودگی سے بہرہ ور ہو رہے تھے۔ اگر کوئی لائق حکمران کسی امر میں انگریزوں سے جائز اختلاف کرتا تو بھی اُس کے اندرونی انتظامات میں دخل در معقولات نہ کیا جاتا۔ جب حکومتِ انگلشیہ کسی غلط کار حکمران کو ٹھوکر کھاتے دیکھتی تو اُسے بطورِ خود مشورہ دیا جاتا۔ جہاں معاملہ سنگین ہوتا وہاں کھلے بندوں مداخلت کی جاتی۔ اگر کبھی ظلم و ستم کے ناقابلِ برداشت حادثات یا بغاوت کے ناگوار واقعات پیش آجاتے، تو افراد کو معزول کرتے ہوئے خاندانی گدّی کو بدستور محفوظ رکھا جاتا۔ کمپنی اوّل تو ریاستوں سے کسی قسم کا خراج نہ لیتی، اور اگر لیتی تو برائے نام۔ ہاں خدمات کا معاوضہ سختی سے وصول کیا جاتا تھا۔ یہ خیال کہ برکاتِ انگلشیہ کو جہاں تک ممکن ہو پھیلانا انگریزی حکومت کا فرض ہے، یا یہ اصول کہ بدانتظامی کی صورت میں نہ صرف کسی خاص حکمران کو گدّی سے اتار دینا چاہیئے بلکہ جب کبھی موقعہ ملے اُس کے خاندان کو محروم کر کے یا لاولدی کا غدر تراش کر ریاست کا الحاق کر لینا چاہیئے، اس عہد کے بعد پیدا ہوا جس کا ذکر ہم اس وقت کر رہے

ہیں۔ جب یہ انوکھے قاعدے وضع کئے گئے ہیں اور اِن پر عمل درآمد شروع ہوا تو تمام نوّاب راجے بھڑک اُٹھے، لیکن یہ سب قصّے ۱۸۵۷ء کے بعد کے ہیں۔

اب آپ پر واضح ہو گیا ہو گا کہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کا اس آسانی اور بغیر کسی رکاوٹ کے پھیل جانا کوئی مافوق العادت یا ناقابلِ فہم بات نہ تھی۔

باب دوم

ہندوستان میں سلطنتِ انگلشیہ کا نظام

کمپنی کا داخلی نظم ونسق

اگرچہ اصولی نظر سے دیکھا جاتا تو ہندوستان ایک تاجر کمپنی کی شخصی جائداد تھی، لیکن حکومتِ انگلستان کے لئے مداخلت اور نگہداشت سے باز رہنا ممکن نہ تھا۔ ملک بھر کے مفاد ہندوستان کی تجارت سے وابستہ تھے۔ تجربہ نے ثابت کر دیا کہ کمپنی اپنی رعایا کا انتظام کما حقہٗ ادا کرنے سے قاصر تھی۔ بعض دل ہلا دینے والے واقعات پیش آ چکے تھے۔ پھر کمپنی کے مقبوضات کی حفاظت یا توسیع کے لئے کسی وقت ساری قلمرو کی امداد کی ضرورت درپیش آ سکتی تھی۔ بایں ہمہ انگلستان کی کوئی سیاسی پارٹی انفرادی حقوق میں سلطانی

دخل اندازی کی حامی بھی نہ تھی۔ کمپنی ایک تجارتی انجمن تھی، اور ملک میں اور بھی کئی ایسی ہی طاقتور انجمنیں موجود تھیں جو سلطانی مداخلت کی کوئی نظیر قائم کرنے کے حق میں نہ تھیں۔ مزید برآں کمپنی کا اپنا رسوخ بھی کسی سے کم نہ تھا۔

عرصہ تک گرم مباحثوں اور کئی ادھورے تجربات کے بعد ایک ایسا حل پیدا ہوگیا جس پر سب متفق تھے۔ کمپنی کے تمام تاجرانہ حقوق بدستورِ سابق قائم رہے۔ بحیثیت حاکمِ اعلیٰ کے کمپنی ہندوستان میں اپنے عُمّال پر ایک بورڈ آف کنٹرول کے ذریعہ قابو رکھتی تھی۔ اس بورڈ کا صدر ایک ایسا سیاسی مدبر مقرر کیا جاتا جو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں سے کسی ایک کا رکن ہوتا۔ اصولاً صدر کی نامزدگی بادشاہ کے ہاتھ میں تھی، لیکن حقیقت یہ تھی کہ صدر کا تقرر وزیرِ اعظم بادشاہ کی منظوری سے کرتا تھا۔ یہ ایک سیاسی عہدہ تھا، اور وزارت کے مستعفی ہونے پر اس بورڈ کے صدر کو بھی مستعفی ہونا پڑتا تھا۔ الغرض آئینی رواج کے مطابق ہندوستان میں سلطنت انگلشیہ کے نظم ونسق کی ذمہ دار سلطانی وزارت تھی۔ دارالعوام میں ہندوستان کے نظم ونسق کی کسی شق کے خلاف قرارداد منظور ہو جانا وزارت کے معزول کر دیئے جانے کے مترادف تھا۔

برطانوی حکومت اور کمپنی کا رشتہ

اگرچہ اصولاً اور قانوناً صدر کو کمپنی کی خواہشات کے خلاف چلنے کے وسیع اختیارات حاصل تھے، اور بعض اوقات وہ اِن کا استعمال بھی کرتا تھا، لیکن بالعموم وہ ایک ایسی طاقتور انجمن اور اس کے بارسوخ اراکین سے جھگڑا کرنے سے محترز ہی رہتا۔ صدر کی تنخواہ کمپنی ادا کرتی تھی، اس لئے اس کا ذکر پارلیمنٹ کے تخمینہ میں نہ آتا تھا۔ اس طرح دارالعوام کے ہاتھ میں کوئی ایسی باقاعدہ اور یقینی طاقت نہ تھی۔ جس کے ذریعہ ہندوستان کے نظم و نسق میں مداخلت کی جا سکتی۔ ہاں اہم مسائل پر ایوان کو ہر وقت خاص خاص سوالات پوچھنے کا اختیار حاصل تھا، لیکن ایسے مواقع بکثرت پیش نہ آتے تھے، کیونکہ عام طور پر محسوس کیا جاتا تھا کہ ہندوستان کو پارٹی بازی کا اکھاڑا نہ بنانا چاہیئے۔ ایوان کی جانب سے حکمتِ عملی کا سرسری خاکہ کھینچ دینا ہی کافی سمجھا جاتا، باقی جزئیات اور تفصیلات ان آئینی حکام پر چھوڑ دی جاتیں جن کے فرائضِ منصبی میں وہ داخل تھیں۔

کمپنی کو اُس کے حقوق ایک فرمانِ شاہی کے ذریعہ حاصل تھے یہ شاہی فرمان ہمیشہ ایک مقررہ میعاد کے لئے ہوتا تھا۔ اِس میعاد کے بعد کمپنی کو ان حقوق سے سبکدوش ہونا پڑتا تھا۔ اِس طرح اِن حقوق

کو بحال رکھنے کیلئے ہر میعاد کے اختتام پر ایک نیا فرمان منظور کروانے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر مرتبہ پارلیمنٹ کی جانب سے ہندوستان کے حالات کی تفتیش کی جاتی، اور ہر دفعہ کسی نہ کسی پہلو سے کمپنی کے اختیارات کو محدود کر دیا جاتا، یا اس پر ایسے نئے فرائض عائد کر دیئے جاتے جو پارلیمنٹ کی رائے میں مناسب ہوتے۔

غرض دیکھا جائے تو اگرچہ انگریزی رائے عامہ کی نگرانی بعید از کار تھی، لیکن تھی مؤثر۔ اصولاً یہ طریقۂ حکومت نہ صرف لغو معلوم ہوتا ہے، بلکہ تھا بھی درحقیقت لغو، لیکن عملاً اس کے نتائج قابلِ تعریف ثابت ہوئے۔

ہندوستان میں فرنگی راج کا ڈھانچہ

ہندوستان کی عملداری ایک گورنر جنرل کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اصولاً گورنر جنرل کا تقرر کمپنی کے اختیار میں تھا، لیکن عملاً اس کی نامزدگی کمپنی کی معروضات سننے کے بعد وزیرِ اعظم کیا کرتا تھا۔ یہ گورنر جنرل ہمیشہ پارلیمنٹ کی برسرِ اقتدار پارٹی سے تعلق رکھنے والا کوئی لارڈ ہوتا تھا۔ اس کے عہدے کی میعاد پانچ سال تھی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ایک پارٹی کا مقرر کردہ گورنر جنرل اپنے سیاسی حریفوں کی وزارت کے ماتحت ہندوستان کا منتظم رہا۔ اصولاً کمپنی اسے معزول کر سکتی تھی، لیکن عملاً خالی سیاسی

وجوہات کی بنا پر کبھی ایسا نہ کیا گیا۔ پارلیمنٹ کی دونوں پارٹیاں ہندوستان میں اختیار کی جانے والی حکمتِ عملی کے متعلق ایک خاص حد تک متفق تھیں۔ رہیں فروعی تفصیلات، تو ان کا فیصلہ مقامی افسروں کے ہاتھوں ہی مناسب سمجھا جاتا تھا۔ شاذ و نادر ایسا بھی ہوا کہ گورنر جنرل اور وزارت کے سیاسی عقائد کے اختلاف کی بنا پر کچھ بدمزگی رونما ہو گئی، لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ بحیثیتِ مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ گورنر جنرل کوئی سیاسی عہدیدار نہ تھا۔

گورنر جنرل کا ہاتھ بٹانے کو ایک کونسل تھی جس میں کمپنی کے بعض مستقل ملازمین کے علاوہ سپہ سالارِ اعظم بھی شامل ہوتا تھا۔ موخرالذکر یا تو کمپنی کا ملازم ہوتا تھا اور یا حکومت کا۔ بعد میں ایک انگریز قانون دان بھی اس کونسل میں اضافہ کر دیا گیا۔ یہ کونسل خالی کونسل ہی نہ تھی بلکہ اس کے ممبروں نے بندوبستِ سلطنت کی مختلف شاخیں آپس میں تقسیم کر لی تھیں۔ اگرچہ اصولاً تمام انتظامی اقدامات گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے نام پر کئے جاتے تھے، لیکن درحقیقت ایک نوع کی باہمی ذمہ داری موجود تھی جسے پارلیمنٹری وضع کی وزارت کے مماثل کہا جا سکتا ہے۔ انفرادی طور پر ممبروں کو اپنے اپنے شعبوں میں خاصے اختیارات حاصل تھے۔ پوری کونسل کے سامنے

فقط اہم معاملات پیش کئے جاتے تھے۔ اِس کونسل کے اجلاس میں گورنر جنرل کی حیثیت محض صدر کی ہوتی تھی۔ بطور ممبر کے اُس کا ایک ووٹ تھا۔ اگر کسی معاملہ پر دونوں طرف آراء کی تعداد مساوی ہو تو اُس کا فیصلہ ناطق سمجھا جاتا تھا۔ یہ تو تھی آئینی حیثیت، لیکن فی الحقیقت گورنر جنرل کے اختیارات بادی النظر میں جتنے معلوم ہوتے ہیں اُس سے بہت زیادہ تھے۔ اوّل تو یہی ایک غیر رسمی قاعدہ سا بن گیا تھا کہ سوائے خالص فوجی معاملات کے سپہ سالارِ اعظم کا ووٹ ہمیشہ گورنر جنرل کے حق میں ہوتا تھا۔ دوسرے کسی اجلاس کے فیصلے قابلِ نفاذ ہونے کے لئے اراکین کی حاضری کی کوئی تعداد معین نہ تھی۔ اگر گورنر جنرل دارالحکومت سے باہر ہوتا تو اُس کے لئے صرف اُن اراکین سے مشورہ کر لینا ہی کافی سمجھا جاتا جو اُس کے پاس موجود ہوں۔ تیسرے اختلافِ رائے کے نتائجِ بد ایسے واضح ہو چکے تھے، اور ایک وزارتِ برطانیہ کے معتمد، ایک لارڈ، اور ایک نامور مدبر کا طبعی رعب و داب ایسا غالب ہوتا تھا کہ اراکین گورنر جنرل کے منشاء کے خلاف چلنے سے سخت احتراز کرتے تھے۔ پھر سب سے بڑا اور آخری حربہ یہ تھا کہ چاہے کونسل میں گورنر جنرل کی متفقہ مخالفت ہو، قانون اُسے اجازت

دینا تھا کہ اگر مناسب سمجھے تو اس مخالفت کو نظر انداز کر دے۔

بظاہر کونسل کا تقرر شاہِ انگلستان کے ہاتھ میں تھا، لیکن درحقیقت سپہ سالارِ اعظم کے سوا باقی اراکین کے انتخاب میں شاہِ انگلستان کی وزارت گورنر جنرل کے مشورہ پر عمل کرتی تھی۔ کونسل کی رکنیت کی میعاد بھی پانچ سال تھی، اور اس کا تقرر انگلستان میں سیاسی تغیرات سے وابستہ نہ تھا۔ اس طرح یہ ممکن تھا، بلکہ کئی دفعہ ایسا ہوا بھی کہ کونسل کا ایک رکن جس کا تقرر ایک گورنر جنرل کی سفارش سے ہوا، وہ بعد کے گورنر جنرل کے قریباً قریباً سارے عہد میں کام کرتا رہا۔ اس طرح ہندوستان کے اندر انگلستان کی سیاسی روش میں ایک گونہ تسلسل قائم رہتا تھا۔ اسی نمونہ کا انتظام بمبئی اور مدراس کے صوبوں میں چھوٹے پیمانے پر تھا۔ اگرچہ اِن دونوں صوبوں کی حکومت، حکومتِ ہند کے ماتحت تھی، لیکن اِن کے تعلقات بورڈ آف کنٹرول سے براہِ راست بھی تھے۔

صوبائی حکومتیں

ابتداً مرکزی حکومتِ ہند شمالی ہندوستان میں صوبائی حکومتوں

کے فرائض بھی خود ہی سرانجام دیتی تھی، لیکن انجام کار یہ طریقۂ انتظام تکلیف دہ سمجھا گیا۔ شمالی ہندوستان میں بھی پریذیڈنسی سسٹم قائم کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن وہ بارور نہ ہوئی۔ آخر کار حکومتِ ہند کے محروسہ علاقے صوبوں میں تقسیم کر کے، ہر ایک صوبہ ایک لفٹننٹ گورنر کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ لفٹننٹ گورنر اصولاً محض گورنر جنرل کا صوبائی نمائندہ تھا۔ اُس کی کوئی کونسل نہ تھی، اور نہ ہی حکومتِ انگلشیہ سے اُس کا براہِ راست کوئی تعلق تھا۔ اُس کا تقرر گورنر جنرل کے ہاتھ میں تھا۔ بالعموم اس کام کے لئے گورنر جنرل کی کونسل کے کسی سابق رکن کو منتخب کیا جاتا تھا۔

ناظرین نے دیکھ لیا ہو گا کہ انگریزوں کی دانشمندی کے طفیل ہندوستان کا نظم و نسق اُس آفت سے محفوظ تھا جس میں برطانیہ کی کئی نوآبادیاں گرفتار تھیں۔ وہ آفت یہ تھی کہ تمام اہم اور سودمند عہدے شہنشاہ سلامت کے سیاسی ہوا خواہوں کے لئے وقف تھے۔ یہ خوشامد خورے اپنی تنخواہ تو مزے سے بٹور لیتے اور اپنے فرائضِ منصبی ایسے نائبوں سے سرانجام دلاتے جنہیں تنخواہ بھی پوری نہ ملتی تھی۔ ہندوستان کے نظم و نسق کے سلسلہ میں یہ گربہ پروری ایسی مضر خیال کی جاتی تھی کہ جب کبھی گورنر یا

سپہ سالارِ اعظم ہندوستان سے باہر جاتے تو وہ اپنے عہدے سے بھی خود بخود سبکدوش سمجھے جاتے تھے۔

سول سروس

انتظامی عہدوں پر ہندوستان کی سول سروس کے عہدیدار فائز تھے۔ اُن کے حقوق قانون اور رواج کے مطابق مقرر تھے اور وہ کمپنی کے مستقل ملازم ہوتے تھے۔ اِن کی ابتداء ان محرّروں اور منشیوں سے ہوئی جن سے انگلستان میں معاہدۂ ملازمت کیا جاتا تھا اور جو ہندوستان میں نوکر رکھے جاتے تھے۔

جب کمپنی ایک تجارتی انجمن سے بڑھ کر حکومت کے مرتبہ پر پہنچ گئی، تو اس کے منشی اور محرّر بھی انتظامی عہدوں پر مقرر ہو گئے۔ اس تبدیلی کے نتائج شروع میں کچھ ایسے قابلِ اطمینان نہ تھے۔ کمپنی اپنے ملازمین کی تنخواہ کے معاملہ میں نہایت کنجوس اور خزرس واقع ہوئی تھی۔ ہاں انہیں اپنے قلیل مشاہروں کے ساتھ ساتھ ملک کی ساحلی اور اندرونی نفع بخش تجارت میں حصہ لینے کی اجازت بھی تھی۔ جب تک کمپنی کی حیثیت محض تاجرانہ رہی، تب تک تو اس انتظام میں کوئی ہرج نہ تھا، لیکن ایک انتظامی افسر کے لئے بیک وقت سوداگر بھی ہونا کوئی خوبی کی بات نہیں۔ برعکس اس

کے قلیل تنخواہ پانے والے یوروپین افسروں کے لئے ایک اجنبی ملک میں تجارت بھی نہ کر سکنا، اور اس طرح ہر قسم کے جائز ذرائع آمدنی سے محروم کر دیا جانا، اس سے بھی بدتر ہوتا۔ غرض شروع شروع میں کمپنی کے ملازم رشوت خور اور ظالم تھے، تاہم وہ اس بارے میں ہندوستانی عملہ سے بدرجہا بہتر تھے۔ آخرکار بدنامی کی افواہیں ناقابلِ برداشت ہوگئیں، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خود کمپنی کے مفاد کو نقصان پہنچنے لگا، تو اس مرض کے واحد علاج پر عمل کیا گیا یعنی سول سروس کے عہدے داروں کو تجارت کرنے اور تحائف لینے سے منع کر دیا گیا۔ اُن کی تنخواہوں میں ایسا اضافہ ہوگیا کہ وہ نہ صرف ہندوستان میں عزّت و آرام کی زندگی بسر کر سکیں، بلکہ اگر کفایت شعاری سے کام لیں تو ایک معقول رقم پس انداز بھی کر سکیں۔ بعد میں مزید آسامیاں مہیّا کر دی گئیں۔ مثلاً تنخواہوں میں کچھ تخفیف کر کے پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ کا انتظام ہونے لگا۔

سول سروس کے لئے ایسے طبقات سے بھرتی کی جاتی تھی جنہیں رشوت ستانی اور تعدی کا خواہ نخواہ شوق نہ تھا، اس لئے جب رشوت ستانی اور تعدی پر مجبور کرنے والے اسباب دُور کر دیئے گئے تو یہ لوگ اپنی دیانتداری کے لئے مشہور ہو گئے، اور پھر ان میں

سے ہر ایک کو اپنے گروہ کی عزت کی حفاظت کا خیال رہنے لگا۔

سول سروس میں ملازمت حاصل کرنا بہت کچھ اتفاقات پر منحصر تھا۔ ہر سال محرّروں کی ایک خاص تعداد بھرتی کی جاتی تھی۔ وہ اس طرح کہ تقرّر کا اختیار کمپنی کے ڈائریکٹروں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ ہر ایک ڈائریکٹر اپنے رشتہ داروں، یا اپنے کسی دوست کے قرابت داروں، یا کسی مشہور قومی کارکن کے عزیزوں میں سے انتخاب کر لیتا۔ ڈائریکٹر اپنے اس اختیار کا استعمال اپنے سیاسی ہواخواہوں کے بیٹے، بھتیجوں کے حق میں کرتے تھے۔ یا بعض اوقات وہ بورڈ آف کنٹرول کے صدر کو اپنی جانب سے مختار کر دیتے، جو کمپنی کے سیاسی ہواخواہوں کو انعام دینے کے طور پر یہ حق استعمال کرتا۔ انگریزوں کے سیاسی نظام کے کئی دوسرے شعبوں کی طرح یہ انتظام بھی اصولاً قابلِ تعریف نہیں، لیکن عملاً اس سے خوب کام چلتا رہا۔ ڈائریکٹر اس امر میں نہایت محتاط تھے کہ ان کے نامزد کردہ اُمیدوار اُن کے حسنِ انتخاب کا ثبوت دیں۔ اس لئے نالائق لڑکوں کو مقرّر نہ کیا جاتا تھا۔ بورڈ آف کنٹرول کے صدر کو بعض ڈائریکٹر جو اختیار سونپ دیتے تھے، اُس سے وہ پارلیمنٹ کے سکاٹ لینڈ سے آنے والے ممبروں کو کمپنی کے عام بندوبست کے حق میں

ووٹ دینے پر آمادہ رکھتا تھا، اور کم از کم اُن دنوں تو سکاٹ لینڈ کے نونہال کسی لحاظ سے ناقابل ثابت نہ ہوتے تھے۔

سول سروس کے عہدے دار جب ایک دفعہ مقرر ہو جاتے تو پھر اُن کا تمام عہدِ ملازمت ہندوستان ہی میں کٹتا، ہاں کبھی کبھی وطن جانے کو چھٹی مل جاتی۔ اس گروہ کی تعداد کوئی دو ہزار سے کم ہی ہوتی ہوگی لیکن سلطنت کے تمام اعلیٰ انتظامی عہدیدار، اور اکثر محکمۂ انصاف کے ذمہ دار اراکین انہیں میں سے چُنے جاتے تھے۔ گورنر جنرل کی کونسل کے اراکین اور نظم و نسق کی بالائی مشین کے کل پرزے بھی یہی گروہ بہم پہنچاتا تھا۔ اس طرح اگرچہ قانوناً اُن کی کوئی خصوصیت نہ تھی لیکن فی الحقیقت یہ ایک نہایت ذی اقتدار گروہ تھا۔ اس گروہ میں صرف فرنگیوں ہی کو شامل کیا جاتا تھا۔

اضلاع کی تقسیم

ہندوستان کو صوبوں میں اور صوبوں کو اضلاع میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ہر ایک ضلع کا رقبہ اوسطاً تین ہزار مربع میل کے لگ بھگ ہوتا تھا۔ ضلع کا بڑا انتظامی حاکم کلکٹر ہوتا تھا۔ اکثر اضلاع میں جج بھی ہوتے تھے۔ کلکٹر اور جج دونوں سول سروس سے منتخب کیے جاتے تھے۔ اِن کے ماتحت چند نائب سول سروس کے معمولی ملازمین میں

سے مقرر کر دیئے جاتے۔ علاوہ ازیں کچھ ڈپٹی امداد نے گماشتے بھی ہوتے تھے، جو کبھی تو ہندوستانیوں میں سے، اور کبھی ہندوستان میں پیدا ہونے والے انگریزوں سے بھرتی کر لئے جاتے۔

اضلاع کا نظم و نسق صوبائی نظام سے منسلک تھا، اور صوبائی حکومت اپنے سیکریٹریٹ کے ذریعہ حکومت ہند سے وابستہ تھی۔ صوبائی حکومت کے کئی سیکرٹری ہوتے تھے، جن میں سے ہر ایک کے ذمہ وسیع اور روز افزوں شعبے تھے۔ سیکریٹریٹ یکجہتی اور یکسانیت قائم کرنے کے لئے اضلاع کے نظم و نسق کی نگرانی کرتا تھا، اور جیسے ضرورت پڑتی صوبائی یا مرکزی حکومت کو مشورہ دینے اور اطلاعات بہم پہنچانے کے کام بھی آتا تھا۔ سیکرٹری اور انڈر سیکرٹری سب بالعموم سول سروس کے عہدہ دار ہوتے تھے۔

فرنگی راج کا قانون

یہاں خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ سرکاری ملازمین کا ایک مختصر سا گروہ جس کے باہمی تعلقات ذاتی اور سرکاری دونوں لحاظ سے اس قدر گاڑھے ہوں، جو سب کے سب ایک ہم جنس طبقہ سے بھرتی کئے گئے ہوں، اور جن کے اختیارات تمام امورِ سلطنت پر حاوی ہوں، وہ ضرور اپنا اقتدار نفسانی، شخصی، یا فرقہ وارانہ اغراض و مقاصد

کے لئے استعمال کرے گا، اور حکومت کے حق میں ایک خطرہ ثابت ہوگا، لیکن ایسا نہ ہوا۔ کیوں ایسا نہ ہوا؟ اس کے اسباب پر یہاں غور کرنا ضروری نہیں۔

اس عہد میں قانون سازی کا کام بھی زیادہ تر صوبوں کے لئے گورنر مع کونسل، اور بقیہ ملک کے واسطے گورنر جنرل مع کونسل، کے ہاتھ میں ہی تھا۔ تاہم فوری یا عارضی فرمانوں کے ذریعہ قانون سازی نہ کی جاتی تھی، بلکہ اس مقصد کے لئے باقاعدہ اور رسمی غور و خوض ہوتی تھی۔ جو قوانین وضع کر دیئے جاتے، اُن کا متعلقہ صوبہ کی عدالتِ عالیہ کے پاس رجسٹر کروانا بھی لازمی تھا۔ ایسے قوانین جب تک براہِ راست کسی سلطانی قانون کے متضاد نہ ہوں قابلِ نفاذ سمجھے جاتے تھے، ہاں کمپنی کے ڈائریکٹر انہیں کالعدم قرار دے سکتے تھے۔

ہندوستان میں عدالتیں دو قسم کی تھیں: ایک تو کمپنی کے ماتحت جن کے متعلق صوباتی شہروں سے باہر کا تمام علاقہ تھا، اور جن کے جج دیوانی عہدے دار ہوتے تھے۔ دوسری سلطانی عدالتیں جو صوباتی شہروں میں واقع تھیں۔ اِن کے جج بیرسٹر یا ایڈوکیٹ ہوتے تھے، جنہیں مرکزی حکومت نامزد کرتی۔ کمپنی کو اگرچہ عملاً

حاکم اعلیٰ کے اختیارات حاصل تھے، لیکن قانون کی نگاہ میں وہ حاکم اعلیٰ نہ تھی۔ اس لئے سلطانی عدالتوں میں کمپنی پر مقدمہ دائر کیا جا سکتا تھا۔ یوں کمپنی کے افسروں سے جواب طلبی ممکن تھی۔ ہاں اعلیٰ ترین عہدیداران عدالتوں کی تعزیر سے باہر تھے۔ قانوناً ان بلند مرتبہ افسروں کے خلاف الزامات کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک خاص ٹریبونل مقرر تھا۔ اگرچہ عملاً کبھی اس ٹریبونل کو کام کرنے کی تکلیف نہ دی گئی۔ دارالعوام کو دارالامراء کی عدالت میں قانونی باز پرس کا اختیار (جسے وارن ہسٹنگز کے خلاف استعمال کیا گیا تھا) آج بھی حاصل ہے۔ علاوہ ازیں قانونی مفروضات کی رو سے انگلستان کی سلطانی عدالتیں ضرورت محسوس کریں تو بحور اربعہ کے باہر جرائم کا بھی مواخذہ کر سکتی ہیں۔

فرنگی کی فوج

فوج کے تمام افسر انگریز ہوتے تھے۔ کمپنی کے پاس چند فرنگی رسالے تھے۔ اس کے علاوہ برطانیہ کے کچھ سرکاری رسالے بھی تھے جن کی تعداد کمپنی کے اپنے فرنگی سپاہیوں سے کچھ زیادہ تھی۔ دفاعِ ہندوستان کی اصلی ذمہ داری ہندوستانی افواج پر تھی۔ ان وسیع افواج کی بھرتی ہندوستان کے ہر حصہ اور گرد و نواح کے علاقوں

سے کی جاتی تھی۔ غدر کے وقت اس ہندوستانی فوج کی تعداد اڑھائی لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اس کے مقابلہ میں فرنگی سپاہیوں کی تعداد کاغذ پر پچاس ہزار تھی۔ ہندوستانی افواج یک رنگ نہ تھیں۔ فوجی لحاظ سے بھی اس فوج کے بعض حصّے زیادہ کارآمد تھے، اور بعض کم کارآمد۔ ہر رجمنٹ کے وہ تمام افسر جن کا تقرّر ملک معظم کی منظوری کے بغیر کیا جاتا ہندوستانی ہوتے تھے۔ صرف ایک سارجنٹ یوروپین ہونا لازمی تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی افسروں کی ایک دوسری جماعت بھی تھی، جن کا تقرّر کمپنی کے نام پر ہوتا تھا۔ اس دوسری قسم کے تمام ہندوستانی افسروں کا رتبہ ملک معظم کے نام پر مقرّر ہونے والے یوروپین افسروں سے ادنٰی تھا۔ یہ یوروپین افسر کمپنی کے مستقل ملازم تھے۔ اِن کی علیحدہ جماعت تھی۔ اِن کا تقرّر بعینہٖ دیوانی عہدے داروں کی طرح کیا جاتا تھا۔ اِن کا چناؤ بھی انگریز قوم کے اُنہیں طبقات سے کیا جاتا تھا جن سے دیوانی عہدہ دار منتخب ہوتے تھے۔ انگلستان میں جنگجو طبیعت کے کئی ایسے نوجوان تھے جو آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رکھتے تھے، اور اس لئے زمانہ امن میں انگریزی افواج میں ملازمت حاصل کرنے کا اِن کے لئے کوئی امکان نہ تھا۔ واضح رہے کہ اِن دنوں انگریزی

فوج میں ملازمتیں نیلام ہوتی تھیں۔ یہ نوجوان ہندوستانی فوج میں بڑے شوق سے ملازمت اختیار کرتے تھے۔ بالعموم ایسے نوجوان فوجی افسروں کی اولاد ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستانی افواج کے دیسی ملازموں کی طرح اُن کے انگریز افسر بھی اکثر پشتینی سپاہی ہوتے تھے۔ ایک طرف تو ہندوستانی افواج کے یوروپین افسروں اور کمپنی کے دیوانی عملہ کے یوروپین عہدیداروں میں باہم حسد رہتا تھا، دوسری طرف خود افواج کے سلطانی افسروں اور کمپنی کے ملازم یوروپین افسروں میں رشک پایا جاتا تھا۔ جنگ کے دنوں میں انگریز نوجوانوں کے لئے ہندوستانی افواج میں ملازمت خوب دلپسند تھی، لیکن جوں جوں ایک فوجی افسر کی عمر بڑھتی جاتی یہ ملازمت بھی دوبھر معلوم ہونے لگتی۔ ترقی کی رفتار سست تھی، اور فرائض کیا تھے؟ کولہو کے بیل کا وہی ایک چکر تھا جو روز کاٹتے کاٹتے طبیعت بھی اکتا جاتی۔ اِن وجوہات کی بنا پر اکثر ذہی استعداد نوجوان افسر رجمنٹ سے پیچھا چھڑا کر یا تو فوج کے غیر مرتّب رسالوں میں جا شامل ہوتے، اور یا پھر کوئی دیوانی یا نیم دیوانی عہدہ قبول کر لیتے۔ رجمنٹوں میں بس وہی لوگ رہ جاتے جو سپہ گری سے عشق رکھتے تھے، اور یا وہ مردہ دل بڈھے یہیں پڑے رہتے جنہیں عرصہ

سے چھٹی مل جانی چاہیئے تھی۔

سرکاری محکمے

آجکل ہندوستان جن سرکاری محکموں کی بھرمار ہے۔ اِن میں سے سوائے طبّی محکمہ کے تب ایک بھی نہ تھا۔ کمپنی اپنے دیوانی اور فوجی ہر دو قسم کے ملازمین کو مفت طبّی امداد مہیّا کرتی تھی۔ اس لئے فوجی طبّی معالجوں کی ایک جماعت مجبوراً ملازم رکھی جاتی تھی۔ یہ سب طبّی معالج یوروپین ہوتے تھے۔

کمپنی کو جو تجارتی مراعاتِ خصوصی حاصل تھیں وہ بتدریج گھٹاتے گھٹاتے آخرکار بالکل اڑادی گئیں۔ انگلستان کے صوبہ مانچسٹر کی رائے عامہ چاہتی تھی کہ تجارت بغیر کسی روک ٹوک کے ہونی چاہیئے اس عقیدہ کی پیروی کرتے ہوئے تمام دنیا کو ہندوستان سے تجارت کرنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔ کمپنی کو گذرے وقتوں میں تجارت سے جو لہماک تھا اب اُس کی بچی کھچی نشانیاں افیون اور نمک کی اجارہ داریاں باقی رہ گئی تھیں۔

ہندوستان میں انگریزی نظام حکومت کی خوبیاں

یہ تھا ہندوستان میں سلطنت انگلشیہ کا نظام۔ چند چھوٹی موٹی تبدیلیوں کو چھوڑتے ہوئے ابھی پچھلے دنوں تک یہ نظام علی حالہٖ قائم تھا۔

یہ ایک استبدادی نظامِ حکومت ضرور تھا، لیکن ساتھ ہی یہ نظام استبداد کے تمام نقائص سے مبرا تھا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ استبدادی نظامِ حکومت ایک آزاد قوم کے قانون کی رو سے معرضِ وجود میں آیا تھا۔ جس طاقت نے اسے بنایا تھا، جو طاقت اسے برقرار رکھتی تھی، وہی طاقت اِسے کسی وقت ختم بھی کر سکتی تھی۔ اس نظامِ حکومت کو مامور من اللہ یا ایشور سروپ ہونے کا کوئی دعویٰ نہ تھا۔ اس نظام کے چلانے والے ہر شخص کو علم تھا کہ اُنہیں اِس نظام کا وجود اور اس کی حکمتِ عملی انگلستان کی رائے عامہ کی نظروں میں جائز ثابت کرنی ہوگی۔ انہیں یہ بھی خوب علم تھا کہ انگلستان کی رائے عامہ کبھی ظلم و ستم روا نہ رکھے گی۔

دوسری بات یہ کہ اس نظامِ حکومت کے حکامِ اعلیٰ اور کمپنی کے ڈائریکٹر ایسے لوگ تھے جن کی تربیت ایک حریت پسند ریاست کے ماحول میں ہوتی تھی۔ انگلستان کی یہ ریاست ایسی حریت پسند تھی کہ وہاں مربیانہ نظامِ حکومت کو بالخصوص ناپسند کیا جاتا تھا اس لئے ہندوستان میں سلطنتِ انگلشیہ کا نظامِ حکومت اُن افسروں کے ہاتھ میں تھا جو کبھی آسانی سے ظلم و ستم کے کل پرزے

بنتا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ اِن میں سے ہر ایک کو دوگونہ فرائض کا احساس تھا۔ ایک طرف وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں اپنے تئیں انگلستان کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے۔ دوسری جانب اُنہیں ہندوستان کی بہتری کے لئے اپنی ذمہ داری کا بھی احساس تھا۔ اِنہیں یقین تھا کہ ہر وہ شخص جس کے دماغ میں رتی بھر بھی عقل ہے تسلیم کرے گا کہ اگر وہ ہندوستان سے متعلقہ فرائض بدرجۂ احسن سرانجام دیں تو وہ یقیناً انگلستان کے سامنے بھی سرخرو ہونے کے مستحق ہوں گے۔ انگلستان کو ہندوستان سے کسی خراج وصول کرنے کی حاجت نہ تھی۔ اُسے خاص مراعات کی بھی ضرورت نہ تھی۔ انگلستان تو خالی یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کی قابلِ قدر تجارتی منڈی خوشحالی اور دولت میں ترقی کرے۔ جہاں تک انگلستان کے مادی فائدے کا تعلق تھا وہ بھی ہندوستان کی ترقی سے ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ جہاں تک نیک نامی اور اطمینانِ قلب کا تعلق ہے، اِس کے لئے یہ تصور کافی تھا کہ انگلستان تیس کروڑ بنی نوع انسان پر حکومت کر کے اِنہیں فائدہ پہنچا رہا ہے۔

تیسری بات یہ کہ نہ صرف اس نظام کی تخلیق ایک آئین کے ماتحت ہوئی تھی، بلکہ خود اس استبدادی نظام کو بھی اپنی تمام

کارروائی قانونی حدود کے اندر رہ کر سرانجام دینی ہوتی تھی۔ اوّل تو اس نظام پہ فرامینِ سلطانی کی قیود تھیں۔ پھر خود حکومتِ ہند کے بنائے ہوئے قوانین بھی تھے۔ چونکہ یہ مؤخرالذکر قوانین جب ضرورت ہو حکومتِ ہند کی مرضی سے تبدیل کئے جا سکتے تھے، اس لئے اِن کی پابندی اور بھی سختی سے کی جاتی تھی۔ حکومت کو کوئی خاص شاہانہ اختیارات حاصل نہ تھے۔ حکومت کی کوئی کارروائی اُس وقت تک قانون کے مطابق نہ سمجھی جاتی تھی جب تک واقعی اُسے آئین کے ماتحت سرانجام نہ دیا گیا ہو۔ اس طرح حکومت کی ہر کارروائی پر سلطانی عدالتوں کی نگرانی رہتی تھی۔

چوتھی بات یہ کہ استبدادی حکومت پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ خود اپنی جڑیں کھوکھلی کر ڈالتی ہے۔ استبدادی حکومت زیادہ قابل ہوتی ہے۔ اس کا کام زیادہ آسانی سے چلتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زود یا بدیر رعایا میں نہ سرکاری کام کرنے کی قابلیت باقی رہتی ہے، اور نہ اس کی مشق۔ کوئی خاص استبدادی نظام حکومت جتنی زیادہ قابلیت سے کام کرے، اُس کی رعایا پہ یہ بُرا اثر اُتنا ہی جلد ظاہر ہوتا ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وقت پڑنے پر جب اس استبدادی حکومت کو بھی اپنا ناخدا اور اپنا عملہ اسی شدّت

رعایا سے چھننے کی نوبت آتی ہے، تو رفتہ رفتہ اُس کی قابلیت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ قوم تباہ ہونے لگتی ہے، اور یوں پایانِ کار استبداد بھی مٹ جاتا ہے۔ ہندوستان کے نظامِ حکومت پر ایسا کوئی اعتراض عائد نہ ہو سکتا تھا۔ اوّل تو رعیّت پہلے ہی ہزار ہا سال کے استبداد سے ناکارہ ہو چکی تھی۔ پھر موجودہ استبدادی نظامِ حکومت کے اعلیٰ افسر یا ناخدا اس رعیت میں سے منتخب ہی نہ ہوتے تھے حکومت ہند کا تعلق ایک دوسری آزاد قوم سے تھا، اور اس لئے یہ حکومت اپنے اعلیٰ عہدے پُر کرنے کے لئے ہمیشہ اِس آزاد قوم کی بے عیب انتظامی قابلیت سے فائدہ اُٹھا سکتی تھی۔

پانچویں بات یہ کہ یورپ میں استبدادی نظامِ حکومت زیادہ تر اس لئے ناپسند کیا جاتا ہے کہ اِس سے رعایا کے ذاتی عقائد کی آزادی، بالخصوص مذہبی آزادی میں دخل اندازی کا اندیشہ رہتا ہے۔ ہندوستانی استبداد میں تعصب رتّی برابر نہ تھا۔ حکومت رعیت کے افعال و عقائد سے تب تک ہرگز کوئی باز پرس نہ کرتی تھی جب تک وہ امنِ عامہ کے منافی نہ ہوں۔ حکومت کا استبدادی ہونا ہندوستانیوں کے نزدیک مطلقاً قابلِ اعتراض نہ تھا۔ اہلِ مشرق کسی اور طریقۂ حکومت کا تصوّر ہی نہیں کر سکتے۔

یوں تو قدیم اور مشہور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس کے تمام ہی قصّے سبق آموز ہیں، لیکن ایرانی درباریوں کی وہ مفروضہ گفتگو جو وہ سمر دیث کی وفات پر کرتے ہیں سب سے بازی لے گئی ہے۔ اہلِ مشرق اوّل تو جمہوریت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ کہیں اُن کی سمجھ میں آ بھی جائے تو وہ اِسے خلافِ مذہب طوائف الملوکی قرار دیں گے۔ اُمراء کی حکومت اُن کے نزدیک رہزنوں کی جتھہ بندی کا دوسرا نام ہے۔ اُنہیں تو ہمیشہ ایک آقا کی تمنّا رہتی ہے۔ آقا کا فرض ہے کہ وہ مذہب اور رواج کے مطابق حکومت کرے۔ اگر وہ اس کے خلاف عمل کرے تو اُسے معزول کر دیا جائے گا۔ کیونکہ جہاں بادشاہ کے اختیارات کی کوئی حد نہیں، وہاں مذہب اور رواج سے علاوہ اُس کی ذات میں کوئی تقدیس بھی نہیں۔

ہندوستانی اجنبی حاکموں کے عادی تھے

اگر ہندوستان میں سلطنتِ انگلشیہ کے اعلیٰ عہدوں پر صرف فرنگی ہی فائز تھے، تو ہندوستانیوں کے لئے یہ کوئی اچنبے کی بات نہ تھی۔ نہ ہی وہ اِس کا بُرا مناتے تھے۔ وہ تو اجنبیوں کی اطاعت کے عادی تھے۔ اُنہیں یہ بات نہایت مناسب معلوم ہوتی تھی کہ حاکم اپنے قبیلے کے لوگوں کی پرورش کرے، اور ملازمت میں اُن اشخاص کو ترجیح

دے جو اُس کے ہمجنس ہونے کے باعث اُس کے نزدیک زیادہ قابلِ اعتماد ہو سکتے ہیں۔ حکومت ضرور بےچین تھی کہ اُن کے زیرِ انتظام ہندوستانیوں کو اپنی قابلیت کے اظہار کا پورا موقعہ نہیں ملتا، لیکن اِس کا علاج کچھ ممکن نہ تھا۔ آغاز میں حکومت نے ہندوستانیوں کو اعلیٰ دیوانی اور فوجی عہدوں پر فائز کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن جلد ہی ثابت ہو گیا کہ یوں کام نہ چلے گا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے ماحول میں پلے ہوئے ہندوستانی جب اعلیٰ منصبوں پر پہنچے تو یہاں اُن کو چاروں جانب ایسی تحریصات نظر آئیں جن کے سامنے نہ اُن کی دیانت برقرار رہتی تھی اور نہ وفاداری۔ پھر اِس دور کے ہندوستانی، اس نئی حکومت کے ماتحت ملازمت کے قابل بھی نہ تھے۔ اِن ملازمتوں کے لئے تھوڑی بہت تعلیم تو لازمی تھی، اور یہاں سوائے الّا ماشاء اللّٰہ کے بہادر قوم کے ہندوستانی، چاہے ہندو ہوں چاہے مسلمان، دونوں یکساں تعلیم سے نفور تھے۔ آج اگرچہ ہندوستان میں کئی ایسی قومیں ہیں جو بہادر بھی ہیں اور تعلیم یافتہ بھی، لیکن تعلیم کی یہ کمی ابھی تک ایک لاینحل معمّہ ہے۔ کلائیو اور ہسٹنگز کے زمانہ کے اجڈ ہندوستان کو سنبھالنے کے لئے اعلیٰ درجہ کی انتظامی قابلیت درکار تھی جو پڑھے لکھے ہندوستانیوں میں

نہ تب تھی اور نہ آج ہے۔ مزید برین یہ تو نہ انگلستان کا منشاء تھا اور نہ کمپنی کا کہ مغربی علوم و فنون اور انگریزی عساکر کی امداد سے ایک مشرقی استبدادی حکومت قائم کر دی جائے۔ وہ تو ہندوستان میں ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے جو ایک فرنگی اور عیسائی سلطنت کے ماتحت ایک مشرقی ملک کے لئے موزوں اور قابلِ عمل ہو سکتی تھی۔ ایسی حکومت کے انتظامی عہدے سنبھالنے کے لئے ایشیائی باشندے جو تب مغربی تمدن کی موجودہ چاشنی سے بھی کورے تھے کسی طرح موزوں نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں اِن عہدوں سے علحدہ رکھا جاتا تھا۔ حکومت اپنی تسلی اس خیال سے کر لیتی تھی کہ ہندوستان کا ایک وسیع حصہ ملکی راجاؤں کے ماتحت ہے۔ اہلِ وطن اپنی قابلیت کا اظہار کرنے کے لئے اِن راجواڑوں میں عہدے حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ حکومتِ ہند کی غیر مانوس اور ناپسندیدہ پالیسی میں ملوث اور شریک ہونے یا اس پالیسی میں خلل انداز ہونے سے بھی بچے رہیں گے۔

عوام انگریز افسروں سے خوش تھے

صدیوں سے بد دیانت عملے کے ہاتھوں ستائی ہوئی رعایا کیلئے اُن کے ہموطنوں کی اعلیٰ انتظامی عہدوں سے علیحدگی ایک بڑا آرام

تھا۔ انہیں کچھ شکایت تھی تو یہ کہ انہیں ان ادنیٰ ہندوستانی عہدیداروں سے بھی کیوں نجات نہیں دلائی جاتی جن سے نئے دور میں ہر قدم پر واسطہ پڑتا تھا۔

ایک ایسے ملک میں جہاں خویش پروری نہ صرف ممنوع نہیں بلکہ ایک مقدّس فرض کی حیثیت رکھتی ہے، ملک کے بڑے بڑے افسروں کے رشتہ داروں اور متعلقین کی فوج کی خاطرداریوں کی مصیبت سے چھٹکارا کوئی تھوڑی نعمت نہیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مذہبی اور نسلی تفرقات کی تلخی نے قدم قدم پر دشمنیاں پیدا کردی ہوں، یہ معلوم کرکے بڑی تسلّی ہوجاتی ہے کہ آخری فیصلہ ایک ایسے افسر کے ہاتھ میں ہے جسے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں میں دُور کی دلچسپی بھی نہیں۔ ہندوستانی اپنے کسی ہموطن کو غیر جانبدارانہ تسلیم کر ہی نہیں سکتے۔ ان کے خیال میں غیر جانبداری کے واہمہ کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے پیاروں کی حمایت نہ کرنا شرافت سے بعید ہے۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ خیالات کی رو سے دیکھا جائے تو اُس وقت کا انتظامِ سلطنت ایک حد تک قدامت پسندی اور جمود کا پہلو لئے ہوئے تھا۔ ہندوستان میں آنے والے انگریز افسر

انگلستان سے کٹ جاتے تھے۔ انگلستان کی آزاد خیالی سے بھی اُن کا رشتہ منقطع ہو جاتا تھا۔ اُن کی زندگی کا اکثر حصّہ ایک محدود حلقۂ احباب میں بسر ہوتا تھا۔ اُن کی تنخواہ باقاعدہ تھی۔ جیسے جیسے ملازمت کے دن گذرتے اُن کی ترقی از خود ہو جاتی۔ اچھّے سے اچھّے مناصب ملتے۔ اِن حالات میں اگر وہ کسی حد تک کنویں کے مینڈک بن جاتے تو اس میں تعجب کی بات نہیں۔ وہ حکومت کا انتظام اُسی طرح چلائے جاتے جیسے اِن سے پہلے چل رہا ہوتا۔ وہ نئے نئے تجربات نہ کرتے تھے۔ ایسے تجربات سے کسی ذاتی فائدے کی اُمیّد نہ تھی۔ ہاں ذاتی نقصان اٹھانے کا امکان ضرور تھا۔ پھر اس کی ضمانت کیا تھی کہ نئے تجربہ سے ضرور اچھے نتائج ہی نکلیں گے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یوں ہندوستان میں رہنے والے فرنگی ذہنی لحاظ سے کسی حد تک اہلِ مشرق کی عادات اختیار کر لیتے تھے۔ جن لوگوں نے اہلِ مشرق پر حکومت کرنا ہو، اُن کے لئے یہ تبدیلی کچھ ایسی قابلِ اعتراض بھی نہیں۔ ہندوستان ایک قدامت پسند ملک تھا۔ وہاں اجنبیوں کی مسلّط کی ہوئی تبدیلیاں سخت ناپسند کی جاتی ہیں۔ اِن حالات میں تیز رفتاری سے ترقی کی کوشش قرینِ مصلحت نہ تھی۔

۱۹۵۷ کا انقلاب

یہ تھی جنگِ پلاسی سے لے کر غدر تک تین نسلوں میں حکومتِ ہند کی تاریخ، اور ترقی کے مختلف مدارج۔ غدر کی تاریخ کا مطالعہ یا غدر کے اسباب کی چھان بین غیر ضروری ہے۔ گھوڑا کیوں کبھی کبھی بگڑ کر سیخ پا ہو جایا کرتا ہے؟ شاہسوار کیوں نشست میں جم کر تو نہیں بیٹھ سکتا لیکن گرتا بھی نہیں۔ جب تک ایسے حادثات میں گھوڑا زخمی نہ ہو جائے، یا سوار اپنے اوسان خطا نہ کر بیٹھے، تب تک ان کی پروا نہ کرنی چاہیے۔ غدر ہرگز کوئی قومی بغاوت نہ تھی۔ ہاں اودھ میں ضرور غدر کا اثر ہر طبقہ پہ تھا۔ غدر خالی فوج کی سرکشی سے بپا ہوا۔ باغی سپاہیوں کے ساتھ ملک کے کچھ بدامن عناصر بھی مل گئے، لیکن معزز باشندوں کی غالب اکثریت بدترین حالات میں بھی غیر جانبدار تھی۔ نواب راجا تھوڑی طبعی ہچکچاہٹ اور حفظِ ماتقدّم کی پیش بندی کے بعد بخوشی اس فریق کی امداد پر تیار ہو گئے۔ جس کی کامیابی یقینی نظر آ رہی تھی۔ جب بغاوت کی فوجی طاقت ٹوٹ چکی تو امن قائم کرنے میں بھی دیر نہ لگی۔ واقعات نے ثابت کر دیا کہ دنیا کی کوئی طاقت تو کمپنی کے اقتدار میں خلل ڈال نہیں سکتی۔ مشرق ایک مدت کی عارضی صلح کے بعد اب پھر مغرب سے اپنی مادی طاقت

آزمائی کی جنگ تازہ کرنے کی فکر میں تھا۔ اب دیکھنا صرف یہ باقی تھا کہ اس جنگ میں اگر دنیاوی قوتیں مشرق کی سازگار نہیں، تو کیا عالمِ روحانیت سے کوئی مددگار بھی اُس کا ساتھ دینے کو آسکتا ہے؟ شاید کوئی دیوتا مدد کرنے آجائیں۔ لارڈ کیننگ اور مسٹر کلائڈ جو انگریزوں کی جانب سے سلطنتِ ہندوستان کا انتظام کر رہے تھے، یوں تو بڑی خوبیوں کے آدمی تھے لیکن ظاہر ہے کہ دیوتاؤں سے پورا اُترنا اِن غریبوں کی طاقت سے سراسر باہر تھا۔

ہندوستان میں فرنگی راج ایک مصنوعی نظامِ حکومت تھا

ہندوستان کی حکومتِ انگلشیہ میں کمزوری یہ نہ تھی کہ وہ ایک استبدادی حکومت تھی۔ کمزوری یہ تھی کہ یہ ایک مصنوعی حکومت تھی۔ یہ حکومت قوم کے طبعی وجود سے قدرتی طور پر نشو ونما پاتے ہوئے موجودہ شکل تک نہ پہنچی تھی۔ یہ آدمی کی بنائی ہوئی حکومت تھی، جسے اجنبیوں نے نافذ کر رکھا تھا۔ یوں تو تاریخ میں کئی ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں مصنوعی حکومتیں قابلِ تعریف اور اچھی خاصی کامیاب ثابت ہوتیں۔ مثلاً روس میں سقلابیوں کی حکومت، یا اٹلی سے باہر رومیوں کی سلطنت، لیکن ایک دانا محقق کی نظر میں یہ مثالیں خطرناک امراض کے خطرناک علاجوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

اگر کسی قوم کی حالت اتنی خراب ہو چکی ہے کہ وہ بیرونی دشمنوں سے اپنی حفاظت اور داخلی امن و امان قائم رکھنے کی خاطر کوئی برا بھلا طبعی نظامِ حکومت بھی برقرار نہیں رکھ سکتی، تو ان حالات میں شاید اس قوم کے لئے فوری موت کے بجائے کسی مصنوعی حکومت کو قبول کر لینا ہی بہتر ہو۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک باہمّت قوم نے مصنوعی حکومت میں بھی زندگی کی روح پھونک کر اسے اپنا لیا، لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ مصنوعی اشیاء، چاہے کیسی ہی کاریگری سے بنائی جائیں اور چاہے کیسی ہی احتیاط سے رکھی جائیں، آخر کار ایک روز گھس پٹ کر کوڑے کے ڈھیر میں جا پہنچتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گو موٹر کار ایک مریل ٹٹو کی نسبت یقیناً بہتر سواری ہے، لیکن آج سے دس سال بعد آپ کی نفیس موٹر زنگ خوردہ لوہے کا ایک انبار ہوگی، اور بیچارے ٹٹو کی نسل سے شاید پھر بھی اُس کا پوتا یا پڑپوتا کام دے رہا ہو۔ قدرت کی بنائی ہوئی اشیاء کا ایک وصف تو ناقابلِ انکار ہے، یعنی زندگی۔ اور پھر جب تک سانس تب تک آس۔ اس لحاظ سے انگریز ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کرتے وقت ہندوستانیوں کے کسی سیاسی نظام کو ختم کر دیتے تو یقیناً وہ تاریخ کی عدالت میں مجرم قرار پاتے، چاہے یہ سیاسی نظام کتنی ہی ابتدائی یا نامکمل صورت

میں کیوں نہ ہوتا۔

ہندوستان میں کوئی ایک قوم آباد نہیں

میری رائے میں انگریز قوم کسی ایسے جرم کی مرتکب نہیں ہوئی۔ اُن دنوں ہندوستان میں کوئی سیاسی نظام تھا ہی نہیں۔ اہلِ ہند جس قعرِ مذلّت، تنزّل، اور ذہنی جمود میں گرفتار تھے، اُس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ کسی بیرونی حملہ آور کی مداخلت سے پہلے انہیں جو قلیل وقفہ ملتا، اُس میں وہ ہرگز کوئی ایسی قومی حکومت قائم نہ کر سکتے جو انہیں اغیار کی دستبرد سے محفوظ رکھتی۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اگر کسی اتفاق کی بنا پر ملک بیرونی حملہ سے محفوظ رہتا، تب بھی سوائے اس کے کہ ایک دو صوبوں میں کوئی باہمّت شخص زبردست سلطنت قائم کر لیتا، کسی بہتر صورتِ حال کی توقع نہ تھی۔ قومی حکومت کے قیام کے لئے کم از کم کسی قوم کا وجود تو ہونا چاہیئے۔ ہندوستان میں کسی ایک قوم کا وجود ہی نہ تھا۔ ہندوستان اُنہیں معنوں میں ایک وحدت ہے جن معنوں میں یورپ کو ایک وحدت کہا جا سکتا ہے۔ ایک ہندوستانی قوم کا تصوّر ایک یوروپین قوم کے تصوّر سے کسی طرح کم تمسخر آمیز نہیں۔ جس طرح سوائے بیرونی وباؤ کے کوہِ بلقان کے شمال اور دریائے وسٹولا کے مغرب میں بسنے

والی قومیں کبھی ایک ریاست کے ماتحت متحد نہیں ہوں گی، اسی طرح یہ ایک بیرونی فاتح ہی کی طاقت تھی جس نے کچھ عرصہ کے لئے ہندوستان کو بظاہر ایک ملک بنا دیا۔ دیکھنے میں یہ مسئلہ ابھی تک متنازعہ فیہ ہے لیکن مجھے اپنی رائے کی درستی اور صحت کا یقین ہے۔

اس لئے ہندوستان میں سلطنت انگلشیہ قائم کرنے میں انگریزوں کا کچھ قصور نہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ سرسبز درختوں کا جھنڈ کسی عمارت کی شہتیریوں سے زیادہ دیدہ زیب ہوتا ہے۔ یہ بھی مانا کہ درخت قدرت نے بنائے ہیں، اور شہتیریاں انسان کی ناقص صنعت کا نمونہ ہیں لیکن رات کا وقت ہو، آندھی اور بارش کا طوفان برپا ہو، تو ایسے میں ایک تھکا ماندہ مسافر یقیناً ان مصنوعی شہتیریوں سے بنے ہوئے کمرہ کو سرسبز درختوں پر ترجیح دے گا۔ علیٰ ہذا القیاس انگریزوں نے بھی سلطنت مغلیہ کے کھنڈروں سے نسل انسانی کی اتنی کثیر تعداد کی سہولت کی خاطر ایک نیا نظام کھڑا کر دیا تو اس میں گناہ کیا تھا؟ یہ تو یقینی بات تھی کہ اس نظام نے ایک روز فنا ہو جانا ہے۔ وقت آنے پر اس کے ختم ہو جانے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ چاہے یہ موت انسان کے ہاتھوں آتی، چاہے قدرت کے ہاتھوں، چاہے کسی حادثہ کی صورت میں، اور چاہے عمر لمبی ہو جانے کے باعث، لیکن ایک دن اس نے آنا ہی تھا۔ بہرحال جب

کی جیب کے ساتھ۔ ابھی تو ہندوستان میں سلطنتِ انگلشیہ دشمنوں سے محفوظ، ظالموں سے ماموں، انصاف سے معمور، شاہانہ کرّ و فر سے بھرپور، ایک دیوتاؤں کی بستی تھی۔ اگر اس کی حفاظت ٹھیک طرح کی جاتی تو شاید پانسو برس یا ہزار سال تک یونہی چلی چلتی۔ اس کے بعد اگر یہ سلطنت تباہ بھی ہو جاتی تو کیا تعجب! آخر کسے فنا نہیں!! غیر فانی تو ایک اللہ کی ذات ہے!!!

باب سوم

سلطنتِ ہندوستان میں خلل رونما ہونے کے اوّلین آثار

مشرق و مغرب کی تاریخی کشمکش

دنیا کی تاریخ میں مشرق و مغرب کے مابین اقتدار کی مستقل جنگ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تشریح بیسود، اور انکار ناممکن ہے۔ کوئی نامعلوم طبعی کشش تھی جو ایرانیوں کو یونان، عربوں کو جنوبی فرانس اور ترکوں کو آسٹریا کھینچ لائی تھی۔ کوئی غیبی قوت تھی جو یونان کی فوجیں دریائے سندھ تک اور روما کے لشکر دریائے نیل کے کنارے لے آئی۔ اس مسلسل جد و جہد کے دوران میں بعض دلچسپ اور شاندار وقفے ایسے بھی ہیں جو ساری داستان میں جملۂ معترضہ سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ یورپ میں اہل ایشیا کی بعض عارضی سلطنتیں،

اور صلیبی جنگوں کے دوران میں مشرقِ قریب کے اندر بعض یورپین حکومتوں کا کچھ عرصہ کے لئے قیام ایسے ہی واقعات ہیں۔ شاید ہندوستان میں سلطنتِ انگلشیہ کا تسلط بھی اسی فہرست میں داخل سمجھنا چاہیئے۔

گزشتہ دو سو برس سے اہلِ مغرب مسلسل برسرِ عروج رہے تھے۔ یہ امر مشرق میں بے چینی کا باعث ہو رہا تھا۔ ہندوستان پر فی الحال ایک بے حسی اور جمود چھایا تھا، لیکن بعض لوگ ایسے بھی تھے جو کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ اس سرکش عنصر کو ہم پنڈت جی کے فرضی نام سے یاد کریں گے۔

پنڈت جی کون تھے؟

پنڈت جی ذات کے برہمن تھے۔ انہیں لاکھوں انسانوں پر حکومت کا پیدائشی حق تھا۔ ان کی حکومت کسی دنیاوی طاقت کی محتاج نہ تھی اس لئے ان کے اختیارات کی بنیادیں اور بھی محکم تھیں۔ موجودہ حالات میں انہیں اپنا اقتدار خطرہ میں نظر آ رہا تھا۔ اجنبی حکومت بذاتِ خود ان کے اقتدار میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اجنبیوں کی حکومت تو پہلے بھی تھی، لیکن پنڈت جی کے وقار کو تورانیوں، افغانوں اور مغلوں نے مضبوط ہی کیا تھا، کوئی ٹھیس نہ پہنچائی تھی۔ اب جن اجنبیوں سے واسطہ تھا انہیں برہمن مہاراج کی خاطرداری کا کچھ دھیان ہی نہ تھا۔

وہ اپنے عدل وانصاف کی مساوات پر نازاں تھے۔ اصولاً ان کے نزدیک ایک بھنگی اور ایک برہمن دونوں یکساں تھے۔ اِن کی رائے سارے ہی ہندوستانیوں کی انتظامی قابلیت کے متعلق اچھی نہ تھی صاف نظر آرہا تھا کہ اِن کے راج میں برہمنوں کا حصّہ معمولی مناصب تک محدود رہے گا۔ انہیں اِس ذات پر بھروسہ نہ تھا۔ وہ مسلمانوں اور بسا اوقات نیچ ذات کے ہندوؤں کو بھی برہمنوں پر ترجیح دے جاتے تھے۔ سیاسی منصب سے پنڈت جی کی یوں بے دخلی یقیناً اِن کے لئے بڑے نقصان کا باعث ہوتی۔ سیاسی منصب میں نہ صرف بجائے خود وارے نیارے تھے، بلکہ دربار میں پنڈت جی کا رسوخ اور کئی حلقوں میں بھی اُن کے اقتدار کی ضمانت تھا۔ نئی حکومت پنڈت جی کے اس اقتدار کی بیخکنی کر رہی تھی۔ نئے حکمران چاہے برائے نام سہی، لیکن آخر تھے تو عیسائی۔ وہ ذات پات کے دشمن تھے۔ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ تو نہ کرتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ جو عقیدہ حاکموں کے دل میں بیٹھا ہو، وہ انتظامی معاملات پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ وہ اپنے تمدّن اور طریقِ معاشرت کو لوگوں میں پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ تمدّن اور طریقِ معاشرت بھی ذات پات کا سخت مخالف تھا۔ قدرتاً پنڈت جی مشرق

ہیں مغرب کے اس دخل در معقولات کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ ہم پنڈت جی کی اس رائے کی بنا پر انہیں خود غرضی کا مجرم نہیں ٹھیراتے۔ آخر ہر انسان کا نیک و بد کا تصوّر اپنے پیٹ ہی کے فائدہ کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں خود غرضی کی کیا بات ہے۔ کوئی شخص بھی کسی ایسے نظام کو پسند نہ کرے گا جس سے اُس کی جیب اور عزت پر بُرا اثر پڑے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص خود اپنے تئیں دھوکہ دے کر سچے دل سے سمجھنے لگے کہ وہ جس نظام تلے کچلا جا رہا ہے اُس کی مخالفت محض حُبِّ وطن، مذہب یا کسی اور مقدّس جذبہ کی بنا پر کر رہا ہے۔ انسان بسا اوقات اپنی مادی ضرورتیں پوری کرنے کی کوشش ایسے ہی شاندار حیلے بہانوں سے ڈھانکنا چاہتا ہے۔

پنڈت جی کو انگریزوں سے نفرت تھی

یوں پنڈت جی فرنگی کے نظامِ حکومت سے نالاں تھے۔ وہ اس سے نفرت کرتے تھے۔ وہ فرنگی کا تمدّن اور طریقِ معاشرت اختیار ضرور کر رہے تھے، لیکن اِن کے دل میں اِسؔ کے لئے سوائے حقارت کے اور کچھ نہ تھا۔ کئی انگریزوں سے اُن کی ذاتی شناسائی تھی۔ وہ اِن سب کو وحشیوں سے کسی طرح بہتر نہ سمجھتے تھے۔ پنڈت جی کو زعم

تھا کہ وہ انگریز کے مجلسی اور سیاسی نظام سے واقف ہیں۔ وہ اِس سیاسی اور مجلسی نظام کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ اِن وجوہات کی بنا پر پنڈت جی کی نگاہ میں سوائے مادی طاقت کے فرنگی حکومت کے قیام ودوام کے حق میں اور کوئی دلیل نہ تھی۔ یہ صرف انگریز کی فاتحانہ قوّت تھی جس کے بل بوتے پر وہ حکومت کر رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج تک کوئی حاکم نسل مادی طاقت کے بغیر حکومت نہیں کر سکی، لیکن محض مادی طاقت کے بل پر دیر تک راج نہیں کیا جا سکتا۔ فرنگی کی یہ مادی طاقت اندرونی بغاوت سے توڑی جا سکتی ہے، بیرونی حملہ آور سے شکست کھا سکتی ہے، یا خود ہی اپنی عمر پوری کر کے ختم ہو سکتی ہے۔

کیا انگریز کی حکومت کا بازوئے قوّت کسی ایسی ہی ترکیب سے مفلوج نہیں کیا جا سکتا؟ اگر محض مادی طاقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو فرنگی حکومت کا وجود کئی مرتبہ مخدوش ہو چکا ہے۔ حیدر علی نے قریب قریب اِن کی فوجوں کی کمر توڑ دی تھی۔ افغانوں اور سکھوں کے ساتھ جنگ کے دوران میں فرنگی کا عسکری تفوق متزلزل ہو گیا تھا۔ غدر کے موقع پر ان کی مادی طاقت کی تباہی میں کونسی کسر رہ گئی تھی۔ یہ درست ہے کہ پہلی تمام کوششیں ناکام ہوئیں، لیکن ایسے مواقع آئندہ بھی تو پیدا ہوتے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ جہاں پہلے

کامیابی کے دروازے تک پہنچ کر ناکام لوٹنا پڑا، اب شاید اُس میں داخل بھی ہو جائیں۔

پنڈت جی لڑنے سے معذور تھے

البتہ ایک وقت تھی۔ وہ یہ کہ پنڈت جی تشدد سے طبعاً نفور تھے۔ خود اِن میں لڑنے کی سکت نہ تھی۔ ملک کے جنگجو طبقے کو اُن پر اعتماد نہ تھا۔ یوں پنڈت جی نے تدبر سے کام نکالنے کی ٹھانی۔ حقیقت یہ ہے کہ پنڈت جی کے تدبر اور اِن کی سیاست میں ایک ہی کسر تھی۔ وہ سولھویں صدی کے اطالوی مدبرین کی طرح خالی باتیں بنا کر، شیخیاں بگھار کر، اور چالاکی سے اپنا مطلب نکال لینے کی اُمید رکھتے تھے۔ وہ بھول جاتے تھے کہ سیاست کی بساط پر سب سے بڑا مُہرہ عسکری قوت کا ہوتا ہے۔ یہ مشرقی مکڑی کتنے ہی جالے بنتی رہی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ جب وہ اپنے نفیس جالے کو مکمل تن چکی تو ایک اُجڈ بھڑ نے اُس میں پھنستے ہی چند ثانیوں کی کشمکش کے بعد اچانک سارا چمکدار تانا بانا توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

بایں ہمہ پنڈت جی کے لئے عدم تشدد سے اپنا مقصود حاصل کر لینا ممکن ضرور تھا۔ شرط صرف یہ تھی کہ انگریز قوم یا اُن کے مدبرین کو قائل کر دیا جائے کہ ہندوستان پر انگریزی گماشتوں کے ذریعہ

حکومت کرنا نہ صرف غیر ضروری بلکہ خطرناک ہے۔ اصولاً ہندوستان پر حکومت ہندوستانیوں کی ہونی چاہیئے۔ اِس سے کسی کو انکار نہ تھا۔ پنڈت جی اہلِ مغرب کو یہ تسلیم کروا لینے کی اُمید رکھتے تھے کہ حکومتِ ہند کا نظم و نسق ہندوستانیوں کے سپرد کر دینا نہ صرف انصاف کی رُو سے بلکہ خود حکومت کے عملی مفاد کے لئے لازمی ہے۔ اگر یہ منزل طے ہو گئی، تو باقی کام آسان ہیں۔ پنڈت جی کی دنیاوی اور روحانی سیادت ہمیشہ کے لئے مسلّم ہو جائے گی۔ اگر بیرونی حملہ آوروں سے ہندوستان کا بچاؤ، بلکہ اندرونی امن و امان کا قیام بھی انگریزی فوجوں کے ہاتھ بدستور رہے تو پنڈت جی کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اجنبیوں کا بدیشی مذہب خود ہی مٹ جائے گا، بلکہ ممکن ہے کہ توڑ مروڑ کر یہ مذہب بھی پنڈت جی کے مفاد کے مطابق بنا لیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ بدیشی تمدّن موجودہ صورت میں پنڈت جی کے لئے خطرناک تھا۔ لیکن اگر اسی غیر ملکی تمدّن پر قابو پا لیا جائے تو پنڈت جی کے بیرونی حریفوں اور اندرونی دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اُن کے ہاتھ ایک زبردست ہتھیار آ جائے گا۔

پنڈت جی نے سوانگ رچایا

اس مقصد کے لئے پنڈت جی کو ایک سوانگ رچانا پڑے گا۔

بظاہر دنیا کو یہ قائل کرنا ذرا مشکل ہوگا کہ پنڈت جی جن کا سارا دارومدار ہی ذات پات کے امتیاز پر ہے سچ مچ جمہوریت کے خواہاں ہیں۔ کون مانے کہ شیولنگ کی پوجا کرنے والے اور تعدّدِ ازدواج کے حامی پنڈت جی مغربی تہذیب کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ کسے یقین آئیگا کہ پنڈت جی اپنے بلند اور موہوم فلسفہ کے معتقد ہونے کے باوجود واقعی مغرب کی سطحی مادہ پرستی کے مدّاح ہیں۔ لوگوں کو ان متضاد باتوں کا قائل کرنا مشکل ضرور ہے، لیکن انسان دل لگا کر کوشش کرے تو کیا ممکن نہیں۔ پھر ایسی مقدّس مہم میں تو جتنی بھی کوشش کی جائے کم ہے۔ جس طرح پنڈت جی نے اپنے برہمن ہونے میں ذرہ بھر کمی کئے بغیر، منہ سے اللہ اکبر کہتے ہوئے اکبرِ اعظم کو جنئو پہنا دیا تھا، جس طرح انہوں نے جہانگیر کی محفلِ عشرت میں فارسی شاعری کی ٹانگ توڑنے میں کسر نہ اٹھا رکھی تھی، ویسے ہی "جمہوریت، حرّیت، حبِّ وطن اور قومیت" کا سبق رٹ لینا بھی کیا مشکل ہے۔

فتنہ اندیشی کند عقلِ غلام

جب یونانی غلام پہلے پہل اپنے رومی آقاؤں کے گھر پہنچے تو انہیں یہ معلوم کرنے کی فکر ہوئی تھی کہ یہاں رہنے والوں میں کون کون سی کمزوریاں ہیں۔ آقا کے دوست کون لوگ ہیں۔ آقا کے سیاسی مقاصد

کیا ہیں۔ بیوی جی کن کن بانکے چھیلوں سے راہ و رسم رکھتی ہیں صاحبزادی صاحبہ کدھر تحفے بھیجنے کی مشتاق ہیں، اور چھوٹے میاں ابا جان کی وفات کے متعلق کس جوتشی سے مشورہ لیتے ہیں۔ اگر دیوتاؤں کی کرپا شاملِ حال رہے تو اسی طرح ایک دن گھر کے بھیدی بن کر غلام رہتے ہوئے بھی حکومت ہی کریں گے۔ علیٰ ہذا القیاس پنڈت جی نے بھی تہیہ کر لیا کہ جن لوگوں کے ہاتھ قسمت نے اُن کی چوٹی پکڑوا دی ہے اُن کے عقائد اور خیالات کا گہرا مطالعہ کیا جائے۔ جس طرح وہ یونانی غلام اگر عقل رکھتا تھا تو آقا کی کمزوریاں معلوم کرتے کرتے ساتھ ہی اپنے ساتھی غلاموں کی خصلتوں سے بھی واقفیت پیدا کرتا تھا، بالخصوص داروغہ جی سے توشناسائی لازمی تھی، اسی طرح پنڈت جی بھی اپنے ہموطنوں کے رجحانات اور سرکارِ ہند کی عادات کا مشاہدہ کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ متحابہ معاملہ ذرا خطرناک۔ اگر کہیں آقا کو وقت سے پہلے غلام کے ارادوں کا پتہ چل گیا تو پھر وہ اس فتنہ اندیش کی اُمیدیں بر آنے سے پہلے ہی اُس کا گلا گھونٹ دے گا۔ تاہم کامیابی ہو جائے تو انعام بھی کچھ کم نہ تھا۔ تمام اہلِ مشرق اور بالخصوص پنڈت جی کی فطرت سازش سے ایک طبعی مناسبت رکھتی ہے۔ چاہے کچھ حاصل ہو یا نہ ہو، انہیں سازش کرنے میں بذاتِ خود ایک لطف آتا ہے۔ سازش

کا یہ شوق ہندوستانیوں کی جبلت میں ودیعت ہے۔ اہلِ مغرب بالعموم اس حقیقت سے ناآشنا رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چاہے سازشیں روزِ روشن میں اُن کے سامنے جاری ہوں اُنہیں اس کا یقین نہیں آتا۔ یہ سازشیں ہوتی بھی طفلانہ ہیں۔ اپنی ساری قابلیت کے باوجود پنڈت جی آخر میں تو ایشیائی ہی! اُن کا طریقِ کار اور حربے بھی ایشیائی ہیں۔

مطالعہ اور مشاہدہ کے اس شوق نے پنڈت جی کی توجّہ سب سے پہلے انگلستان کی جانب مبذول کی۔ ہندوستان کی چابی اب ہرات، دلّی، یا کلکتہ میں نہیں، بلکہ لندن میں ہے۔ ہندوستان میں حکومتِ انگلشیہ کا قیام و دوام انگریز قوم کی قوّتِ ارادی اور استقلال سے وابستہ ہے۔ فرنگی کی فوجی قوّت میں شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی ہندوستانیوں کے لئے کھلی بغاوت کرنا بے سود تھا۔ مزید بریں ہندوستان میں ایسا کوئی طبقہ نہ تھا جو بغاوت کے قابل، یا بغاوت پر آمادہ ہوتا کسی بیرونی حکومت سے امداد کی اُمید نہ تھی۔ سمندر پر برطانیہ کا بحری بیڑا مسلط تھا۔ روس چاہے کتنا ہی دھمکاتے اور موقعہ کی تلاش میں رہے لیکن فی الحال جنگ مول لے کر خود اپنا وجود خطرے میں ڈالنے پر آمادہ نہ تھا۔ جنگ وہ گھٹالی ہے جس میں قوم کے جوہروں کی شدید ترین پرکھ ہوتی ہے۔ روس بالفرضِ محال اس جوئے پر بازی لگانے

پر آمادہ بھی ہو جاتا تو اس قدر افواج کہاں سے لاتا جو کوہ ہندوکش عبور کر کے تمام ملک میں پھیل سکتیں۔

بغاوت میں پنڈت جی کا زیان تھا

ایک دوسرا غدر بپا کرنا ممکن بھی ہو جاتا تو اِس صورت میں یہ خطرہ ہر وقت درپیش تھا کہ چاہے اِس کے ساتھ کسی بیرونی حملہ آور کی امداد شامل ہو، اور چاہے نہ ہو، ممکن ہے کہ فرنگی مشتعل ہو کر اپنے مخالفین کو تشدّد سے فی الفور کچل دینے اور تباہ کرنے کی ٹھان لے۔ اس میں شک نہیں کہ ظلم و تشدّد کا ردِّ عمل بھی ہوگا۔ شاید انگریز قوم میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ: "یقیناً ہماری حکومت میں ناقابلِ برداشت سقم ہوں گے جن سے اہلِ مشرق جیسے مرنجان مرنج لوگ ہمارے مشفقانہ راج کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہو گئے" اور شاید اسی عقیدہ کے ماتحت وہ اپنے طرزِ حکومت میں کچھ تبدیلیاں بھی کر دیں، لیکن اس کی کیا ضمانت تھی کہ وہ تبدیلیاں پنڈت جی کے حسب منشأ ہوں گی؟ ممکن ہے ریاستوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ اس سے پنڈت جی کو تو کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ ثابت ہوا کہ بغاوت چاہے اُس میں بیرونی حملہ آور کی مدد شامل ہو یا نہ، اگرچہ ممکن تھی لیکن، مفید مطلب نہ ہو سکتی تھی۔ حکومتِ ہند کو ہندوستان میں شورش بپا کر کے ختم کرنا

ممکن نہ تھا۔ ہاں یہ ممکن تھا کہ حکومتِ ہند کا نظم و نسق مفلوج کر کے اُسے کام کرنے کے ناقابل بنا دیا جائے۔ یہ ہو گیا تو اندرونی تبدیلیاں ضرور ہونگی۔ ان داخلی تبدیلیوں کی ضرورت لندن میں محسوس ہو گی۔ یوں حکومتِ ہند اور حکومتِ انگلستان کے مابین چپقلش پیدا کر کے، اور برطانوی پارلیمنٹ کی مختلف سیاسی پارٹیوں سے باری باری اپیل کر کے، حکومتِ ہند کے نظم و نسق میں داخلی تغیر و تبدّل مشکل نہ ہو گا۔ اس صورت میں یہ توکوشش کی ہی جائے گی کہ اِن تبدیلیوں سے پنڈت جی کی مرادیں بر آئیں۔

انگلستان کا سیاسی انحطاط

پنڈت جی انگلستان کی سیاسی نبض کی رفتار سے ناواقف نہ تھے صورتِ حال کی بابت ان کا اندازہ حسبِ ذیل تھا، یہ آپ کا اختیار ہے کہ آپ اِس اندازے کو غلط سمجھیں یا درست۔

۱۸۳۲ء میں انگلستان کی پارلیمنٹری اصلاحات سے بڑے سے بڑے امراء کی طاقت فنا ہو گئی تھی، اور بادشاہ بھی اب شاہِ شطرنج سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ قریبًا نصف صدی سے انگلستان میں متوسّط طبقہ کا بول بالا تھا۔ یہ متوسط طبقہ کی حکومت تھی تو بہت اچھی، بس ذرا عالی ہمّت نہ تھی۔ اس عہد میں ملک کی مجلسی اور مالی حالت نے بیشک ترقی کی لیکن بیرونی ممالک کے مقابلہ میں متواتر

شکستیں اور خجالت اٹھانی پڑی۔ خود برطانیہ کی وسیع سلطنت کے اندر بھی کوئی واضح لائحۂ عمل سامنے نہ تھا۔ پارلیمنٹ کی مختلف پارٹیوں کے مابین اب کوئی حقیقی اور مخلصانہ اختلافِ رائے باقی نہ رہ گیا تھا وزارت کے تغیّر و تبدّل کے معنی فقط یہ تھے کہ سب پارٹیاں باری باری اقتدار کا جھولا جھول سکیں۔ جب خیال ہوتا کہ میاں کلّو کافی عرصہ وزارت کی شیرینی پر ہاتھ لگا چکے ہیں تو پھر میاں للّو کو اپنا حصّہ وصول کرنے کی اجازت مل جاتی۔ پانچ پانچ سال کے وقفہ سے یہ 'جھا' 'نا' کا کھیل جاری رہتا۔ جس طرح پارٹی سسٹم کی حکومت وہاں ناکام ہو جاتی ہے جہاں دو پارٹیوں میں بنیادی اختلافات پائے جاتے ہوں، کیونکہ ایسے موقعہ پر ایک حریف دوسرے کی وزارت کے ماتحت رہنے کی نسبت تلوار کھینچنے کو ترجیح دیتا ہے، اسی طرح جب حزب الاختلاف اور وزارت میں اختلاف کی بنا کسی اصول پر نہ ہو بلکہ محض حصولِ اقتدار کی جنگ ہو تب بھی پارلیمنٹری نظامِ حکومت فقط ذاتی دشمنیوں کا اکھاڑا بن کر رہ جاتی ہے۔ حکومت کا مقصد قوم کی خدمت کے بجائے ذاتی منفعت رہ جاتا ہے۔ کلّو اور للّو پھر اس بات پر نہیں جھگڑتے کہ حکومت کس طرح کرنی چاہیئے، بلکہ بنائے نزاع تو یہ بن جاتی ہے کہ وزارت کسے ملنی چاہیئے۔ ایسی صورتِ حال میں حبِّ وطن اور اصول کی پاسداری عنقا

ہو کر، ہر دلعزیزی کا معیار دھڑا بندی رہ جاتی ہے - ظاہر ہے کہ جب ایسا ہو تو قومی مفاد کو کوئی بھی نہیں پوچھتا۔

سیاسی پارٹی بازی کا گورکھ دھندا

مختلف انتخابی قوانین سے رائے دہندگان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، لیکن سیاست میں اس سے کچھ فرق نہ آیا۔ "عوام" کو ابھی اپنی طاقت کا احساس نہ ہوا تھا۔ الغرض سیاسی سمندر میں اتار چڑھاؤ کے کوئی آثار نہ تھے۔ جوں جوں یہ وزارت کی گدّی پر باری باری بیٹھنے کی رسم پختہ ہوتی گئی، سیاست کی کشش بھی کم ہو گئی۔ رائے دہندگان کی تعداد بڑھی تو بغیر پارٹی کے نظام کی امداد کے ترقّی کرنا محال ہو گیا۔ پارٹیوں کا نظام بجائے خود اس قدر پیچیدہ ہو گیا کہ ایک گورکھ دھندا بن گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لیاقت رکھنے والے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی نہ ہوئی تو اُنہوں نے سیاست کو بطور پیشہ اختیار کرنا ہی ترک کر دیا۔ یوں ملک کی باگ ڈور روز بروز پارلیمنٹ کے پرانے اور بڈھے ممبروں کے ہاتھ آتی گئی - اِن بڑے میاں کے نزدیک اگلے مباحثہ میں رائے شماری کا نتیجہ، یا بہت بلند پروازی کی تو آئندہ الیکشن میں کامیابی، کسی مستقل پالیسی کے نسبت زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ غرض دن رات کسی ایسے "اچھے نعرے" کی فکر رہتی تھی جس سے الیکشن جیتا جا سکے، یا پارلیمنٹ میں کثرت رائے حاصل کی جا سکے۔

تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اس مقصد کے لئے بہترین نعرہ "پیٹ کی پکار" ہوتی ہے۔ جو مفت کھلانے کا وعدہ کرے گا، مخلوق اُسی کے راگ گائے گی۔

اس دور کی دون ہمتّی کی بہترین مثال اس زمانہ کی شاعری ہے۔ اس شاعری کو دیکھ کر بے اختیار حسین میر یاد آجاتے ہیں، جن کے ہر شعر میں قلیہ، کباب، یا چائے کا ذکر ہوتا ہے۔ ملک الشعرا کا کلام دیکھئے تو خیال ہوتا ہے کہ جنّت کے نظارے باورچی خانے سے ملتے جلتے ہوں گے۔

برطانوی سیاست بلند ہمتی سے گر کر "سودا بازی" کی جانب متوجہ ہو گئی

اِن حالات میں جنگ سے پہلوتہی کرنا ملکی مدبّرین کا اوّلین فرض تھا یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ اِن لوگوں کو اپنی اِس کمزوری کا علم تھا، ورنہ جیسا کہ کریمیا کی جنگ نے ثابت کر دیا، جن مدبّرین کے پیشِ نظر سوائے سیاہی سربلندی کے اور کوئی مطمح نظر نہ ہو، وہ کبھی جنگیں نہیں جیت سکتے۔ قوم کی یہ حالت ہو چکی تھی کہ جنگ میں تو کوئی عذر نہ تھا، صرف یہ خواہش تھی کہ فریقِ مخالف میں ہتھیار اٹھانے کی سکت نہ ہو۔ برطانیہ کی عالمگیر سلطنت کے حُسن و قبح پر بحث کا معیار یہ تھا کہ اِس سے وصول کیا ہونا ہے! غالبًا وصول تو کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ بہر صورت عام خیال

یہی تھا کہ نوآبادیات، "غم نداری بُز بخر" کے مصداق ہیں، اور اِن سے جس قدر جلد چھٹکارا حاصل کر لیا جائے، اُتنا ہی بہتر ہے۔ یہاں پھر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انگلستان کی حکومت نے مقبوضات کے مسائل میں زیادہ دخل نہ دیا تو یہ برطانیہ کی عالمگیر سلطنت کی خوش قسمتی تھی۔ جہاں کہیں دخل دیا گیا، اُس کے نتائج ایسے تباہ کن ثابت ہوئے کہ اگر جلد یہ پالیسی بدلی نہ جاتی تو مقبوضات میں رہنے والے بغاوت پر مجبور ہو جاتے۔

ہندوستان ہی ایسا مقبوضہ تھا جہاں سے بہت کچھ حاصل ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز قوم کو سلطنتِ ہندوستان کی پروا بھی تھی۔ نہ صرف ہندوستان سے بہت کچھ وصول ہوتا تھا، بلکہ سلطنتِ ہندوستان انگریزوں کی مستقل ناموری کی ضمانت بھی تھی۔

انگریز قوم کو اس خوابِ غفلت سے ناگوار واقعات نے یکے بعد دیگرے جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ جنگِ روم و روس، غدر کے بعد ملکہ وکٹوریہ کا قیصرۂ ہند کا لقب اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کرنا، کریمیا اور سوڈان کی رسوا کن شکستیں، آئرلینڈ کی ہوم رول ایجیٹیشن، افریقہ میں یورپین حکومتوں کی لوٹ کھسوٹ، بوئروں سے جنگ، اِن سب پریشانیوں نے مل جل کر وہ پہلی لاپروائی اور پُرامید توکل دور کر دیا۔

انگریز قوم کو اپنی عالمگیر سلطنت سے ایک نئی دلچسپی پیدا ہوئی۔ پنڈت جی نے جانچ لیا کہ اس جاہلانہ دلچسپی سے عجیب و غریب مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

انگریز رائے دہندگان جن کے ہاتھ قدرت کی ناقابلِ فہم ستم ظریفی نے کُل بنی نوعِ انسان کی باگ ڈور سپرد کر دی تھی، افسوسناک طور پر حقیقتِ حال سے ناواقف اور صحیح رہنماؤں سے محروم تھے۔

پہلی جنگ عظیم

ملکہ وکٹوریہ کی وفات کے وقت یہ تھی صورتِ حالات۔ اس کے بعد کشمکش اور جدّ وجہد کا ایک عجیب دور آیا۔ قدیم نقش چاروں جانب مٹتے جا رہے تھے۔ آنے والی تباہی کے روز افزوں احساس سے قوم کو جدھر سر چھپانے کا امکان دکھائی دیتا، ادھر ہی کو بے تحاشا دوڑ پڑتی۔ سیاسی اکھاڑے سے پرانی صورتیں بسرعت تمام اُٹھتی جا رہی تھیں۔ پرانے نعرے بھی ختم ہو رہے تھے۔ ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ جلد ہی ایک طرف تو ملک کے اندر تہذیب و تمدّن کو تباہی سے بچانے کے لئے جدّ و جہد کرنا ہو گا، اور دوسری طرف ملک سے باہر ایسے خطرات کا ہجوم ہو رہا ہے کہ اُن سے نپٹنے کے لئے گھر کے سب جھگڑے ترک کر دینے ہوں گے۔ اس کے بعد آئی جنگِ عظیم، جس نے اگر کچھ ثابت کیا تو یہ کہ قوم میں ابھی جان ہے۔ قوم کے

افراد کسی نصب العین کے لئے کٹ مرنے پر آمادہ ہیں۔ جنگ ہی نے یہ راز افشاء کیا کہ حکومت کا چرخہ کیسا بوسیدہ اور کرم خوردہ ہو چکا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کبھی کبھی ایک زبردست قوم کے رہنما کیسے پست لوگ ہوتے ہیں۔ جنگ اور مابعد کے واقعات نے پرانی پارٹیوں کے آخری آثار بھی مٹا دیئے۔ اب روز روشن کی طرح واضح تھا کہ انگلستان میں دو ہی پارٹیاں باقی رہ گئی ہیں: ایک طرف تو قدامت پسند ہیں، اور دوسری طرف قوم کی جڑیں کھوکھلی کرنے والے۔

ٹوری پارٹی

ٹوریوں کی پرانی سیاسی پارٹی جس میں کم از کم اتنی خوبی تھی کہ اُن کا لائحۂ عمل تعمیری تھا، اب مٹ چکی تھی۔ اس پارٹی کو اس کے لیڈروں کی دوبار غدّاری نے فنا کر دیا۔ اگر کچھ کسر رہ گئی تھی تو ۱۸۳۲ء میں پہلے ریفارم بل کی شکست نے پوری کر دی۔ ٹوریوں کے جانشین قدامت پسند تھے، جنہیں ایک تیسری غدّاری نے ایسا کمزور کر دیا کہ بیس سال تک گھسٹ گھسٹ کر، آخر جو مٹھی بھر ممبر بچے وہ بھی اتحاد پارٹی میں جذب ہو گئے۔ اتحاد پارٹی کا نام ہی ظاہر کرتا ہے کہ خواجہ شرف ہر دو طرف کے مصداق تھی۔ اس پارٹی کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایک ناجائز اور دکھاوے کے اتحاد کو کسی نہ کسی طرح قائم رکھا جائے۔ جوں ہی آئرلینڈ کی طرف سے منتخب ہو کر آنے والے

پارلیمنٹ کے اراکین کا ووٹ انگلستان کی حکومت کی قسمت کا فیصلہ کرنے لگا، یہ دکھاوے کا اتحاد بھی ختم ہو گیا۔ اِدھر اتحاد پارٹی نے پہلی مرتبہ ایک تعمیری، واضح، اور مثبت حکمتِ عملی اختیار کی، اور اُدھر خود پارٹی کا وجود مٹ گیا۔

لبرل پارٹی

اتحاد پارٹی کا دعویٰ تھا کہ اُسے برطانیہ کی عالمگیر سلطنت سے خاص وابستگی ہے۔ لبرل پارٹی کی خاصی تعداد یہ دعویٰ تسلیم نہ کرتی تھی۔ لبرل پارٹی میں دراصل تو برطانیہ کی عالمگیر سلطنت کا کوئی سچا حامی تھا ہی نہیں۔ جو لبرل لیڈر برطانیہ کی عالمگیر سلطنت کے برائے نام حامی تھے، اُن کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ لبرل پارٹی کے اکثر پیرو ابھی تک یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ عالمگیر سلطنتیں قائم کرنا نہ صرف خطرناک ہے، بلکہ شرمناک بھی ہے۔ لبرل وزارت نے اپنے پیشروؤں کی خارجی حکمتِ عملی جاری رکھی، لیکن وہ ذرائع فراہم نہ کئے جن کے بغیر ایک شاندار خارجی حکمتِ عملی چلانا ناممکن ہے۔ لبرل وزارت برطانیہ کی عالمگیر سلطنت بھی وسیع اور مستحکم کرنے کا اشتیاق ظاہر کرتی تھی۔ نظر آ رہا تھا کہ عزم و استقلال اور طاقت کے بغیر "شاندار خارجی حکمت عملی" اور "عالمگیر سلطنت" کا یہ شوق جڑوں کے بغیر پیڑ اُگانے کا جنون ہے۔ اس میں کامیابی محال ہے۔

پنڈت جی نے سوچا کہ لبرل پارٹی کی اس سلطنت پرستی کی نئی پالیسی کے خلاف پرانے لبرلوں کو اُکسانا چاہیئے۔ ممکن ہے کوئی بڈھا تجربہ کار لبرل لیڈر اس جھانسہ میں آجائے کہ برطانیہ کی عالمگیر سلطنت کے خلاف لبرل پارٹی کی پرانی پالیسی ہی ٹھیک تھی۔ شاید برطانیہ کی عالمگیر سلطنت کے حامی لبرل بھی ایک نئی تعمیری حکمتِ عملی ایجاد کرنے کے شوق میں پنڈت جی کا دھوکہ کھا جائیں۔ آخر انہیں یہ ثابت کرنے کی فکر تو ہے ہی کہ سلطنت پرست بن کر بھی وہ لبرل اصولوں سے منحرف نہیں ہوئے۔

یہ ٹھیک ہے کہ پارلیمنٹ میں ہندوستانیوں کو ایک ووٹ بھی حاصل نہ تھا۔ اندریں حالات قدامت پسندوں اور لبرلوں، دونوں سے توقع نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ ہندوستانیوں پر زیادہ توجہ دیں، لیکن یہ امر بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ جمیکا کے جزیرہ کے حبشی غلاموں کو بھی تو ایوان میں کوئی ووٹ حاصل نہ تھا۔ اُن کے آقاؤں کے ہاتھ میں برطانوی پارلیمنٹ کے کئی ممبروں کے ووٹ تھے۔ باوجود اس کے انگریز قوم کے ضمیر کا فیصلہ یہی تھا کہ غلاموں کو آزادی ملنی چاہیئے۔ بوئروں کو بھی برطانوی پارلیمنٹ میں ایک ووٹ حاصل نہ تھا، لیکن باوجود اس کے اُنہوں نے حکومتِ برطانیہ کو ایک شرمناک معاہدہ پر دستخط کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ یقیناً لبرل پارٹی کے بھانت بھانت کے چڑیا خانے میں سے کوئی نہ کوئی

خدا کا شیر ایسا بھی تو نکل آئے گا جو ہندوستان کا مسئلہ پنڈت جی کی مرضی کے مطابق حل کر دے۔

وہگ پارٹی

سترھویں صدی کے آخر کے آئینی انقلاب کے ساتھ ہی عظیم الشان وہگ پارٹی معرض وجود میں آئی تھی۔ ۱۸۶۵ء میں اس پارٹی نے اپنی ابتدائی موت کے بعد تیس سال کی نیم مردہ زندگی ختم کرتے ہوئے خودکشی کر لی۔ اس پارٹی کو ہندوستان کی قسمت سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ انھوں نے صرف ایک مرتبہ فوکس کا انڈیا بل پیش کر کے ہندوستان سے آنے والی دولت اور وہاں کی ملازمتوں پر اپنا قبضہ جمانے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش ان کے مخالفین نے غیر آئینی ذرائع سے ناکام بنا دی۔ اس کے بعد وہگ پارٹی ہندوستان سے حاصل ہونے والے مفاد پر قبضہ کرنے کے بجائے ان مفاد میں سے ایک حصّہ لینے پر ہی قانع ہو گئی۔ ہندوستان کا مسئلہ اب ایک غیر جماعتی اور متفقّہ مسئلہ شمار ہونے لگا تھا۔ ہندوستان کے بورڈ آف کنٹرول کی صدارت کبھی ٹوری پارٹی کے کسی رکن کے سپرد ہوتی تھی، اور کبھی وہگ پارٹی کے کسی ممبر کو سونپ دی جاتی۔

ایک سچّے وہگ کو اس بات کا کچھ افسوس نہ تھا کہ ہندوستان استبدادی حکومت (ہماری مراد آئینی استبدادی حکومت سے ہے)

کے ماتحت ہے۔ جس طرح یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ جلوۂ طور اور وعدۂ جنت فقط یہود کا ورثہ ہے، غیر یہودیوں کا اس میں کچھ حصّہ نہیں، اسی طرح دہگ پارٹی کا خیال تھا کہ ۱۶۸۸ء کا آئین خاص وحی کے ذریعہ صرف انگریزوں پر نازل ہوا ہے۔ ہیمپڈن، رشل، سڈنی، اور ٹیٹس اوٹس جیسے خدا رسیدہ شہداء نے اس مقدّس شریعت کے تحفظ کے لئے جانیں دیں۔ اس پاک قانون سے سکاٹ لینڈ میں رہنے والے بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں آئرلینڈ میں بسنے والے اور برطانوی نوآبادیات کے باشندے بھی اس کی برکات میں شریک ہو جائیں تو ہرج نہیں، لیکن غیر ملکی اجنبیوں اور کالے رنگ کی نسلوں کا تو اس میں ذرّہ بھر حصّہ نہیں۔

وہگ پارٹی کا پروگرام

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو وہگ پارٹی کا یہ عقیدہ کچھ ٹھیک ہی تھا۔ اِن کے موٹے موٹے اصولوں کا آرام اور فائدہ ایک محدود طبقہ تک محدود تھا۔ اس طبقہ سے باہر کے لوگ دہگ پارٹی کے زاہدانہ اور متکبّرانہ پروگرام کو پسند نہ کرتے تھے۔ لوگوں کو وہگ پارٹی کی حکومت و رعونت کا انداز بھی گوارا نہ تھا، لیکن وہگ پارٹی کے یہ غیر مقبول اُصول اُن کے پروگرام کا مغز نہ تھے۔ وہگ پارٹی کے پروگرام کا مغزِ سخن حسب ذیل تھا:۔ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے لازمی ہے کہ لارڈ

گوئٹر کی اولاد کو اعلیٰ مناصب مہیّا کیے جائیں۔

آپ پوچھیں گے کہ یہ تو ہواوہگ پارٹی کے پروگرام کا مغزِ سخن لیکن وہ عام زاہدانہ اور متکبّرانہ پروگرام کیا تھا جس کا فائدہ اور آرام ایک محدود طبقہ تک محدود تھا۔ مغزِ سخن تو پارٹی کے خاص آدمیوں کے سوا کوئی نہ جانتا۔ باقی پروگرام جو لوگوں پر ظاہر کیا جاتا تھا، اُس کے اصول سو سال تک شاہانِ سٹوئرٹ اور بڑے بڑے امراء کی باہمی کشمکش کے دوران میں واضح ہوئے تھے۔ اِن امراء میں مالدار شہروں کے سردار اور بڑے بڑے زمیندار دونوں شامل تھے۔ اِن اصولوں کا لبِّ لباب حسبِ ذیل ہے:۔

حکومت ہماری مخالف ہے۔ لہٰذا ہمارا مطالبہ ہے کہ کسی شخص پر بغیر جیوری کے مقدمہ نہ چلایا جا سکے، ورنہ بادشاہ اپنے ججوں کی مدد سے ہم کو سزائے موت دے گا۔

ہم اصرار کرتے ہیں کہ سب کو مذہبی آزادی ہونی چاہئیے، خاص طور پر پروٹسٹنٹ مذہب سے چھوٹے موٹے مسائل میں اختلاف کرنے والوں کو ضرور یہ آزادی ملنی چاہئیے ہمارے اس اصرار کی وجہ یہ ہے کہ مذہب میں نئی اُپج نکالنے والوں سے ہمیں ووٹ ملنے کی اُمید ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں شک ہے کہ قومی کلیسا اپنا تسلّط جمانا

چاہتا ہے۔

ہم ایک مستقل فوج بھرتی کرنے کے خلاف ہیں کیونکہ ایسی فوج ہمیں کچلنے کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے۔

ہم اخبارات کی مکمل آزادی کے حامی ہیں تاکہ جب ہمارے سیاسی مخالفین برسرِ اقتدار ہوں تو ہم اخبارات کے ذریعہ اِن کی خبر لے سکیں۔

ہم جنگ کو اچھا سمجھتے ہیں، بشرطیکہ سمندر پار ہو، اور ہم پر زیادہ ٹیکس نہ لگائے جائیں۔ ہم میں سے اکثر متموّل سوداگر پیشہ شہری ہیں۔ ہمیں جنگ کے زمانہ میں فائدہ رہتا ہے۔

ہم قانونِ وقت کی سختی سے پابندی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہمارا یہ مطالبہ اُسی نوعیّت کا ہے جیسے ایک تاش کا کھلاڑی اصرار کرتا ہے کہ بازی کے قواعد پوری طرح مدِنظر رکھے جائیں۔ ہماری جماعت میں لائق قانون دان بکثرت موجود ہیں۔ اِن کی امداد سے ہم قانون کی مومی ناک جدھر چاہیں گے موڑ سکیں گے۔

ہم ہمیشہ نئے نئے قانون بناتے رہنے کے مخالف ہیں کیونکہ اس سے سارا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ کوئی بات یقینی نہیں رہتی۔ بھلا ایسی تاش کی بازی میں کیا لطف آئے گا۔ جہاں ہر مرتبہ کھلاڑیوں کی کثرت

دائے سے کھیل کے نئے قواعد گھڑ لئے جائیں۔

چونکہ بادشاہ ہمارے مخالف ہے، اور حکومت کی طاقت، چاہے برائے نام سہی، فی الحال سلطانی ہاتھوں میں ہے، لہذا ہمیں ملوکیت ختم کر کے پنچائتی راج قائم کرنے کے مطالبہ کی اصولی حمایت کرتے رہنا چاہئے۔ خاص طور پر جب تک ہم حزب الاختلاف میں ہیں۔ تب تک تو ہم پنچایت راج پر خوب زور دیتے رہیں گے۔ ہم اس قسم کے پنچائتی راج کے حامی ہیں جو روما کے آخری دنوں میں وہاں رائج تھا، یا ہمارے زمانہ میں آجکل وینس میں پایا جاتا ہے۔ جمہوریت اور عوام پرستی ابھی آنے والے زمانہ کی باتیں ہیں۔ فی الحال ہم پارلیمنٹ کے ذریعہ بادشاہ کے اختیارات پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں ہماری اکثریت ہے۔ ہم یہ اکثریت برقرار رکھیں گے۔

ہم حکومت کے اختیارات کے استعمال پر نہایت احتیاط، بلکہ بدگمانی سے نگرانی رکھیں گے۔ مبادا ہماری غفلت سے جور واستبداد کا دور شروع ہو جائے۔

ظاہر ہے اِن اصولوں میں بہت سی باتیں کام کی ہیں۔ یہ اصول اُس زمانہ میں وضع ہوئے تھے جب وِگ پارٹی حزب الاختلاف تھی، لیکن اِن پر عمل اُس وقت بھی جاری رہا جب یہ پارٹی برسرِ اقتدار آگئی۔ بنیادی

طور پر یہ اصول منفی نوعیت کے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اِن میں مزید ارتقا کی گنجائش نہ تھی۔ جو اصول اور پروگرام محدود طبقات تک محدود ہوں، وہ ہمیشہ منفی اور اُن کی ترقّی کا راستہ مسدود ہی ہوا کرتا ہے۔

سیاست کا معیار لیاقت کے بجائے ہر دلعزیزی بن گئی

محدود طبقات کی حکومتیں جن کا اقتدار وراثت کے طور پر باپ کے بعد بیٹے کو منتقل ہوتا رہے ہمیشہ لائق اور منتظم حکمران پیدا کرتی ہیں، بشرطیکہ اس محدود طبقہ میں باہر سے شامل ہونے کا راستہ بالکل مسدود نہ ہو۔ وہگ پارٹی بھی ایک ایسا ہی برسرِ اقتدار محدود طبقہ تھا، اور اس نے کئی لائق اور منتظم حکمران پیدا کئے۔ اس پارٹی میں اوسط درجہ کی سیاسی قابلیّت خاصی تھی۔ محدود اور برسرِ اقتدار طبقات کو غیر معمولی قابلیّت کی شخصیتوں سے ہمیشہ خدائی بیر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہگ پارٹی بھی گو لائق شخصیتوں سے اپنا کام چلانے میں عذر نہ رکھتی تھی، لیکن اُسے غیر معمولی قابلیّت رکھنے والے لیڈروں سے بدگمانی ہی رہتی تھی، بالخصوص اگر یہ غیر معمولی قابلیّت والے لیڈر پارٹی کے مقدّس حلقہ کے باہر سے آ کر پارٹی میں شامل ہوئے ہوں، اور اُنہوں نے اپنی لیاقت کے زور سے اپنی جگہ پیدا کی ہو، تو پارٹی اُن سے شدید خدشہ محسوس کرتی تھی۔

وہگ پارٹی کے اصولوں کے پلندے میں ہندوستان کے مسئلہ کا

کوئی حل نہ تھا۔ حکومت رعایا کی بہتری کے لئے ہونی چاہیئے۔ اِس اصول کو وہگ پارٹی سے خصوصیت تو نہ تھی، لیکن وہگ پارٹی کے عقائد کی رو سے اس اصول کو ثابت کرنا زیادہ آسان ضرور تھا۔ بہرحال وہگ اور ٹوری دونوں پارٹیاں ہندوستان کے مسائل حل کرنے میں اس اصول کو مدِنظر رکھتی تھیں۔

وہگ پارٹی کی پالیسی اِس کے اپنے حلقوں سے باہر کچھ ایسی مقبول نہ تھی۔ جس طرح بنی اسرائیل کا مذہب یونانیوں سے متاثر فلسطین کے باشندوں میں پھیلنا شروع ہوا تو جلد ہی عیسائیت کی شکل اختیار کر کے ارضِ موعود کی محدود حدود پھاندتا ہوا ایک عالمگیر مذہب بن گیا، اِسی طرح وہگ پارٹی کے عقائد پیدا تو انگلستان میں ہوئے لیکن تھوڑی مدت میں چار وانگِ عالم میں پھیل گئے۔ لندن اس نئے عالمگیر دین کا مرکز، اور ارضِ مقدس تھا۔ امریکہ میں برطانوی مقبوضات نے بغاوت کی تو یہی وہگ پارٹی کے عقائد اُن کا سرکاری مذہب تھے۔ امریکہ کے انقلاب نے اسی دین کی رو سے دنیا کے سامنے اپنا جواز ثابت کیا، اور آخر اسی کی طفیل کامیابی حاصل کی۔ فرانس نے اسی پاک عقیدے کا مطالعہ کر کے اِسے ایک عالمگیر شکل دے دی اور اِسے عوام میں مقبول بنا دیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہگ پارٹی کی یہ معنوی اولاد جب

انقلابِ فرانس کی صورت میں اُس کے سامنے آئی تو خود وہگ پارٹی اُسے دیکھ کر دہشت سے بھوچکی رہ گئی۔

انتہا پسندوں کی تخریبی ذہنیت

وہگ پارٹی کبھی تن تنہا نہ تھی۔ ابتدا میں جب اس کے پیرو مٹھی بھر لوگ تھے، اِس نے جنونیوں، باغیوں، قاتلوں، جعلسازوں، بیرونی حکومتوں کے جاسوسوں، حتیٰ کہ برطانیہ کے بیرونی دشمن ممالک سے بھی مدد لینے میں کبھی دریغ نہ کیا تھا۔ اس میں برائی بھی کیا تھی؟ جو لوگ ایک مقدس اور عظیم الشان جنگ میں مصروف ہوں، اُنہیں شکست کے روز مددگار ڈھونڈنے میں زیادہ احتیاط نہ کرنی چاہیئے۔

بعد میں جب اِس پارٹی نے عروج حاصل کر لیا، تب بھی اِس میں ہمیشہ انتہا پسندوں کی ایک بہت بڑی تعداد شامل رہی۔ انتہا پسندوں کے عقائد سے وہگ پارٹی کے لیڈروں کو بھی ویسی ہی نفرت تھی جیسی کہ ٹوریوں کو، لیکن وہگ لیڈر انتہا پسندوں کے انقلابی جوش و خروش سے مدد مانگنے پر مجبور تھے۔ انقلاب پسندوں کا خیال تھا کہ ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ تو حکومت کرنے نہیں دیتی، ایں دریں حالات چلو وہگ پارٹی کے اصولوں سے کام لے کر حکومت کو مفلوج کرنے کی کوشش ہی کریں۔ وہگ جانتے تھے کہ ان سر پھروں کی کوششوں سے

حکومت کا نظام تو ٹوٹنے سے رہا، ہاں موجودہ صورتِ حالات کے خلاف پوری مدد کا وعدہ کر کے فسادیوں کے جوش، اور غیر جانبدار رائے دہندگان کی حمایت حاصل کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ اس طرح ہمارے ہی اقتدار کے دن نزدیک آئیں گے۔ ہمارا ہی رسوخ پھیلے گا۔ یوں وہگ پارٹی میں انتہا پسندوں کی تعداد روز افزوں تھی۔ یہ موچھیں کس طرح ڈاڑھی سے بڑھ گئیں، انہوں نے کس طرح بالآخر ڈاڑھی کو لوگوں کی نظروں سے ہی غائب کر دیا، غریب ڈاڑھی پہ کیا گزری، اور انجام کار خود موچھوں کا کیا حشر ہوا، یہ ایک ایسی داستان ہے جو آپ تاریخِ سیاست کی کسی کتاب میں پڑھ سکتے ہیں۔

آج وہگ پارٹی فنا ہو چکی ہے، اور اس کا محبوب فرزندِ بے تحقیق لبرل ازم بھی راہی ملکِ بقا ہو رہا ہے، لیکن دونوں نے اپنے پیچھے زبردست پارٹیاں چھوڑی ہیں جو اپنے تئیں اُن کا جائز وارث تصوّر کرتی ہیں۔ یہ نئی پارٹیاں اپنے آباؤ اجداد کے برعکس ہندوستان کے مسائل میں دخل دینے سے باز نہیں رہتیں۔ اس لئے ان جدید پارٹیوں اور اِن کے اصولوں پر بھی کچھ روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

بال کی کھال اتارنے والے قانونچی

کسی حد تک ہر ایک انگریز ایک وِگ ہے۔ برطانیہ کا موجودہ آئین

وہگ پارٹی کی اختراع ہے، اور سچ یہ ہے کہ ایک بڑے قابلِ تعریف نظام کی اختراع ہے۔ اس آئین نے دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حکومت کی بنیاد دھڑابندی پر رکھی۔ دھڑابندی انسان کی فطرت میں ہے، اگرچہ اس سے عوام کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔

ہم برطانوی پارلیمنٹ میں انقلاب کا ڈرامہ کھیلنے اور جوش و خروش کے مناظر دیکھنے کے ایسے عادی ہو چکے ہیں، ہمارے نزدیک ہمارے آئین کا یہ اصول کہ حکومت کا کوئی اہم کام ہمارے شہریوں کی غالب اکثریت کی تائید حاصل کئے بغیر نہ ہونا چاہئے اتنا مسلم ہے، ہم اتنے مباحثے سُن چکے ہیں جو بظاہر سنجیدہ نظر آتے تھے، ہم بنیادی اختلاف اور تضاد کے باوجود اتنی مرتبہ مصالحت ہوتی دیکھ چکے ہیں، کہ ہندوستان کی خاموش، ٹھیک کام کرنے والی، اور بآسانی چلتے رہنے والی استبدادی حکومت ہمیں ایک بھیانک دیوی کے روپ میں نظر آتی ہے۔ انگلستان میں غیر پیشہ ور قانون ساز، اور غیر پیشہ ور منتظم اتنی دیر سے اچھا بھلا کام چلا رہے ہیں کہ ایک اوسط انگریز دفتری حکومت کو اپنے ملک میں نیست و نابود تصور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح ہندوستان میں ماہرِ فن اور مستقل سرکاری ملازمین حکومت کا تمام کاروبار سنبھالے بیٹھے ہیں، اِسے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ہندوستان میں مقدمات کا فیصلہ کرنے میں جیوری کوئی دخل نہیں دیتی۔ وہاں جیوری کا رواج ہی نہیں۔ جج سارے کے سارے سرکاری ملازم ہیں۔ حکومت جب چاہے انہیں برطرف کر سکتی ہے۔ ایسے حالات میں غریب ہندوستانیوں کی جان و مال کیا خاک محفوظ ہوں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہاں اخبارات آزاد ہیں۔ پارٹیاں قائم کرنے کی ممانعت نہیں۔ تقریر کرنے کی آزادی ہے۔ مذہب آزاد ہے لیکن یہ سب آزادیاں حکومت کی عنایت کی محتاج ہیں۔ جس طرح حکومتِ ہند کی مہربانی سے یہ تمام آزادیاں حاصل ہیں، اصولاً اسی طرح جب حکومت چاہے ان پر پابندی بھی لگا سکتی ہے۔

غرض بال کی کھال نکالنے والے قانونچی حکومتِ ہند کے آئینی نظام سے کچھ مطمئن نہ تھے۔ انگریز کاروباری قوم ہے۔ انہیں حکومتِ ہند پر ناز تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ حکومت انگلستان اور ہندوستان دونوں کو ان گنت فائدہ پہنچا رہی ہے۔ اس میں شک کی گنجائش نہیں۔ اس لئے باوجود بدگمان ہونے کے وہ اس کی مخالفت نہ کرتے تھے۔

استبدادی حکومت کی مخالفت

ہندوستان میں استبدادی حکومت کی کامیابی سے کئی قانونی دماغوں کو فکر لاحق ہو رہی تھی۔ وہ کہتے اگرچہ استبداد اور دفتری

حکومت ہندوستان میں کامیاب ثابت ہو گئے تو کیا ایک روز اس سے
یہ خدشہ نہیں کہ خود برطانیہ میں بھی ایسا ہی نظام مسلّط ہو جائے گا جنہیں
تاریخ سے کچھ واقفیت تھی وہ جانتے تھے کہ روما میں جمہوریت کا جنازہ
اس کے بیرونی صوبوں کے استبدادی نظامِ حکومت کے کندھوں پر ہی
نکلا تھا۔ دراصل یہ خطرہ بے بنیاد تھا۔ ہندوستان میں جن اسباب کی
بنا پر استبدادی حکومت کی ضرورت تھی، وہ انگلستان میں مفقود تھے۔
علاوہ ازیں ہندوستان میں استبدادی حکومت کو انگلستان کی جمہوری
حکومت نے بے ضرر اور کامیاب بنا رکھا تھا، انگلستان میں قائم ہونے
والی استبدادی حکومت کو یہ سہارا کہاں سے ملتا۔ چاہے کوئی شخص حکومتِ
ہند کا کتنا ہی مدّاح کیوں نہ ہو، وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ خود مختار، جمہوری
ملکوں میں بھی ایسا ہی نظام رائج ہونا چاہئے۔ استبداد اور دفتری حکومت
تو جاں بلب اقوام کا آخری علاج ہیں، وہ بھی عارضی علاج، کیونکہ ان
سے یقینی موت تو ٹل نہیں سکتی۔ اچھی بھلی تندرست اقوام کو یہ دار وئے
تلخ استعمال کرنے کی کیا حاجت ہے۔ اس لئے یہ قانونی دماغ بھی گو
ہندوستان سے بدظن تھے لیکن حکومتِ ہند کے عام نظام میں خلل نہ ڈالتے
تھے۔ صرف جب کبھی وہ محسوس کرتے کہ حکومتِ ہند برطانوی نظامِ حکومت
کے بالکل ہی برعکس کوئی کارروائی کرنے لگی ہے تب وہ ضرور مداخلت

کرتے۔ اس مداخلت سے گو تھوڑا بہت نقصان بھی ہوتا لیکن فائدہ بے انداز پہنچتا۔ ہاں جب ہندوستان میں شورش برپا کرنے والوں کو پتہ چل گیا کہ وہ انگلستان میں ایک طاقتور گروہ کی مدد سے حکومتِ ہند کی خاص خاص کارروائیوں میں خلل ڈال سکتے ہیں، تب یہ مداخلت خاصی مضرّت رساں بن گئی۔ ورنہ جب تک کسی خاص مسئلہ میں دخل دیئے بغیر عام نگرانی اور رہنمائی کی جاتی تھی، تب تک اس مداخلت سے فائدہ ہی فائدہ تھا۔ بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو یہ قانونی دماغ ہمیشہ حکومت کا نظام علیٰ حالہٖ قائم رکھنے کے لئے ہی دخل دیتے تھے۔ ہاں جب اعلیٰ مناصب پر متمکّن انگریز مدبّرین بھی کہنے لگے کہ ہندوستان کے نظم و نسق کے کارخانہ کو جدید سیاسی عقائد کے مطابق بدل دینا چاہیئے، تب اِن قانونی دماغوں نے بھی تبدیلی کی اس تجویز سے ہمدردی کا اظہار کیا، گو انہیں انگریز مدّبرین کے اس ذہنی انقلاب پر تعجّب ضرور ہوا۔

میاں "ہمچو ما دیگرے نیست"

وہگ پارٹی کے دوسرے بچے کھچے عناصر نے جذباتی یا تخریبی جامہ پہن لیا۔ اِن دونوں شکلوں میں اُنہوں نے ہندوستان کی قسمت پر خاصہ اثر ڈالا ہے، اور ایسا نظر آتا ہے کہ آئندہ ان کا یہ اثر اور بھی بڑھ جائے گا، اس لئے اِن کا ذکر ذرا تفصیل سے کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے

"میاں، ہمچو ما دیگرے نیست" کی ذی وجاہت لیکن تنِ تنہا شخصیت کے متعلق ذرا کچھ سن لیجئے!

ہندوستان میں ہم "میاں، ہمچو ما دیگرے نیست" اور ان کے تمام ہمجنس لوگوں کو اس نام سے نہیں پکارتے، بلکہ ایک ایسا لفظ استعمال کرتے ہیں جسے یہاں کتاب میں نقل بھی کیا جائے تو میں ہتک عزت کا مجرم سمجھا جاؤں گا۔ اس لئے اب میں ان کا یہ لمبا چوڑا لقب ہی بار بار استعمال کروں گا۔ اس سے میری مراد ایک خاص طبقہ کے لوگ ہیں۔

"میاں، ہمچو ما دیگرے نیست" ایک بلند انسان ہیں، بہت ہی بڑے انسان، اتنے بلند کہ وہ اپنی قوم اور اپنے زمانہ کی عام صفات سے بھی بالاتر ہیں! انسان میں کئی جبلتیں ایسی ہیں جن کی بنا عقل پر نہیں، بلکہ فطرت پر ہوتی ہے۔ "میاں، ہمچو ما دیگرے نیست" ایسی جبلتوں سے سراسر عاری ہیں۔ یہ فطری خصلتیں دراصل قوم یا نسل کے تجربات کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ جس عادت نے قوم کے اکثر افراد کو ترقی کرنے، یا اپنی حفاظت کرنے میں بار بار مدد دی ہو وہ آئندہ کے لئے قوم کی جبلت کا رتبہ اختیار کر لیتی ہے۔ ایسی فطری خصلتوں کی جڑ انسانی خصلتوں کی جڑ انسانی شخصیت میں بہت گہری ہوتی ہے۔ بالعموم

اِن خصلتوں سے فائدہ ہی پہنچتا ہے۔ یہ خصلتیں پیدا ہی اس طرح ہوئیں کہ ایک مدّت تک قوم یا نسل کو اِن کی عادت رکھنے سے اپنی بقا میں مدد ملتی تھی۔ اب اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ اِن خصلتوں سے فائدہ کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہے تو ظاہر ہے کہ بارِ ثبوت اِس نئے دعویٰ کرنے والے کی گردن پر ہے۔ جب تک وہ اپنے دعوے کا کافی ثبوت مہیا نہ کر سکے، تب تک تو قومی جبلّتیں علیٰ حالہٖ قائم رہنی چاہئیں۔

"میاں ہمچو ما دیگرے نیست" یا تو اِن قومی جبلّتوں سے طبعاً محروم ہیں، یا اُن کی راہنمائی اور ہدایت قبول کرنے کو تیار نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جو اصول اب انہوں نے اپنی ذاتی رائے کی بنا پر قائم کئے ہیں۔ قوم اُن پر عمل پیرا ہو۔ نسل پرستی، حبّ وطن، اور غیرتِ قومی اُن کے خیالِ مبارک میں سب لعنتیں ہیں۔ بالعموم تنومند قومیں جن طریقوں سے اپنے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں، اپنے اندر انتشار پیدا کرنے والوں کو سزا دیتی ہیں، یا بیرونی دشمنوں کو ختم کرتی ہیں، وہ سب اِن کے نزدیک گناہ سے ملوث ہیں۔ قومی نصب العین، قومی مذہب، اور قومی اخلاق کو وہ تنگ خیالی کی زنجیریں تصوّر کرتے ہیں، اور اس لئے انہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ دستور اور رواج کی اُن کی نظر میں کچھ

وقعت ہی نہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ہر مسئلہ پہ بحث ہو سکتی ہے۔ اصولوں کے مفید یا غیر مفید ہونے کا فیصلہ تجربہ سے نہیں بلکہ عقل و نقل اور منطقی استخراج سے ہونا چاہیئے۔

"میاں، ہمچو ما دیگرے نیست" بڑے اچھے مناظر ہیں۔ وہ دو طریقوں سے بحث کرتے ہیں۔ ایک قسم تو اپنے اخلاقی نظریات گنتی کے مفروضات اور چند تصوّرات کی تعریف سے ایک اور ایک دو کی طرح ثابت کر دیتی ہے۔ اِن تصوّرات کی خامیاں، اور ان مفروضات کی غلطیاں عام سننے والوں کی نظر سے اوجھل رہتی ہیں۔ "میاں، ہمچو ما دیگرے نیست" کی ایک دوسری قسم زورِ خطابت سے جذبات بھڑکا کر رائج الوقت خیالات کی نامعقولیت اور تضاد کا مذاق اڑاتی ہے۔ اس صورت میں مغالطہ یہ ہے کہ رائج الوقت دستور اور عقائد، عقل پر نہیں، بلکہ فطری احساس پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہیں خلافِ منطق ثابت کرنے سے اِن کی سچائی میں فرق نہیں آتا۔ کئی مخلص اور راسخ الاعتقاد "میاں، ہمچو ما دیگرے نیست" واقعی انسانیت کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں۔ اگر اِن کا وجود مٹ جائے تو دنیا سونی ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی فطری جبلّتوں کا جائزہ اور امتحان لیتے رہنا چاہیئے۔ کئی جبلّتیں فی زمانہ غیر ضروری ہیں، اور انہیں ترک

کر دینا چاہیئے۔ کئی مثالیں ایسی بھی ہیں جہاں عادات میں ایک خصوصیت تو باقی ہے، لیکن اس کے پیچھے جو فطری احساس تھا وہ مٹ چکا ہے۔ ایسی صورت میں یہ اندھی عادت فائدہ کے بجائے نقصان کا باعث ہو سکتی ہے۔ یہ "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کی کوششوں ہی کی برکت ہے کہ انسانیت اپنی بے سود عادتیں چھوڑتی جا رہی ہے۔

"ہمچو ما دیگرے نیست" کی تاریخ

یورپ کی بعض عظیم ترین شخصیتیں "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کی ذیل میں آتی ہیں۔ قدیم روما میں کیٹو ایسی ہی ہستی تھا۔ سسرو نے کیٹو پر چوٹ کرتے ہوئے جو کچھ کہا تھا وہ ایک ہی جملہ میں "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کی شخصیت کا لبِ لباب سمجھ لیجئے۔ سسرو نے کہا تھا: کیٹو سمجھتا ہے کہ وہ افلاطون کی خیالی عدل و انصاف، نیکی، حسن اور فارغ البالی کی بستی میں بیٹھا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ فی الحال اُس کا قیام روما کے گناہگار شہر میں ہے۔ روما کا مشہور شاعر ڈانٹے بھی "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" ہی کی برادری سے تھا۔ وہ کیا فخر سے کہتا ہے کہ میں دنیا میں اپنی سائے کا ایک ہی آدمی ہوں جب اُس نے پاپائے روم کا ساتھ چھوڑ کر شہنشاہ کی حمایت اختیار کی تب بھی وہ دونوں سے یکساں نفرت کرتا تھا۔ انقلابِ فرانس کے

بعد اعتدال پسندوں کی ایک جماعت بھی "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" سے ہی ملتی جلتی تھی۔ یہ اِسی جماعت کی شامتِ اعمال تھی جس نے یوروپ میں لبرل ازم کو پنپنے نہ دیا۔ لوگوں نے فطری طور پر محسوس کیا کہ اس راستہ پر چلنا ممکن نہیں۔ انہوں نے کہا: یہ تعلیم ہے تو بڑی قابلِ تعریف، لیکن اس میں حقیقت کچھ نہیں۔ کیوں نہ اِس کے بجائے کیتھولک یا سوشلسٹ پارٹی کو ووٹ دیا جائے جو کم از کم روز مرہ کے مسائل سے شناسا تو ہیں۔

انگلستان میں لبرل ازم کو جو زبردست طاقت حاصل رہی اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں اس پارٹی کے بانی عملی مدبرین تھے۔ فقط خیالی پلاؤ پکانے والے شیخ چلّی نہ تھے۔ انگلستان میں ہمیشہ سے بہتیرے "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" موجود رہے ہیں، لیکن آج سے تھوڑا عرصہ پیشتر یہاں اُن کا رسوخ ناقابلِ اعتنا تھا۔ آج ہمارا قومی نظام رو بہ انتشار ہے۔ اس انتشار کا باعث علم کی افراط نہیں، بلکہ بعض اقتصادی عوامل ہیں جو واضح نہیں۔ اس انتشار کا فائدہ اٹھا کر "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" برسرِ اقتدار آ رہے ہیں۔ رواج، دستور اور فطری احساس کی رہنمائی انگلستان کے موجودہ مسائل کا حل تلاش کرنے میں آج کامیابی کی ضمانت دینے سے قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ عوام اشتیاق سے کسی قلبی روشنی کی تلاش میں ہیں۔

مشرق میں "میاں ہیچو ما دیگرے نیست" ناپید ہیں۔ وہاں فطری احساس، رواج اور دستور کے مقابلہ پر کوئی نہیں ٹھیر سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ مشرق میں بھی بعض دلیر منکروں اور کئی نئی تعلیمات کے پیشواؤں نے بسا اوقات انسانوں کے کثیر گروہوں کو اُن کے قدیم رسوم و رواج سے منحرف کر کے جدید سانچوں میں ڈھالا ہے۔ لیکن ایسے منکرین کبھی اپنے شکوک و شبہات بغیر کسی اوٹ کے ظاہر نہیں کر سکے، اور نئی تعلیم پھیلانے والے بھی کبھی محض استدلال سے کام نہیں لیتے رہے۔ مشرق میں "میاں ہیچو ما دیگرے نیست" کے مسلک کی حمایت میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، یا جہاں تک اُن کی پیروی کے مدعی پائے جاتے ہیں، اِن کے دعووں کی بنیاد ہرگز اخلاص پر نہیں۔ ظاہر ہے کہ "یہ تصنیف" اور "یہ تلمذ" محض اُن مطلب کے پکے مشرقیوں کی چال ہے جو اپنے مغربی آقاؤں کی ایک بارسوخ پارٹی کی حمایت حاصل کرنے کے لئے یہ سوانگ رچا لیتے ہیں۔ وہ خود اس تصنّع کا اقرار کرتے ہیں۔

زمانۂ قدیم میں "میاں ہیچو ما دیگرے نیست" کچھ زیادہ ہر دلعزیز نہ تھے۔ یونان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تو اِن کے خلاف قوانین

موجود تھے۔ اناطیس نے سقراط کے خلاف مقدمہ میں جو دلائل پیش کئے تھے، آج اُن کا ترجمہ کیا جائے تو ان کا مفہوم یہی نکلے گا کہ سقراط کو "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" ہونے کے جرم میں ہی سزائے موت دی گئی تھی۔ سقراط کے بعض مکالمے بالکل روما کی قدیم تقریروں اور آج کل کے اخبارات کی نکتہ چینی سے مماثلت رکھتے ہیں۔ یہ سقراط کا علم الکلام ہی تھا، جس نے قدیم دنیا کے تمام عقائد تہس نہس کر کے رکھ دیئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں سقراط کے شاگردوں کی تعلیمات نے قدیم فلسفہ کی جگہ لے لی۔ سقراط عالمِ قدیم کے تباہی کے فرشتہ کا رتبہ رکھتا ہے۔ جب رومیوں نے عیسائیوں سے بیزار ہو کر اپنے آبا کی بت پرستی اور نسل پرستی کی جانب رجوع کیا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ عیسائیوں میں تقویٰ کی کمی واقع ہو گئی تھی، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ عیسائیوں نے "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کی عادتیں اختیار کر لی تھیں۔

میاں نصا جب تختِ حکومت پہ بیٹھنے کی نسبت کتبخانے میں زیادہ زیب دیتے ہیں

آجکل مجرموں کو سزا دینے میں نرمی برتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امن کے زمانہ میں "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کو کسی قسم کا خطرہ درپیش نہیں۔ انقلاب کے زمانہ میں البتہ اُن کا پس جانا یقینی ہے۔ انگلستان میں بسنے والے "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" خاصے محفوظ ہیں۔ اس

کی دو وجوہات ہیں۔ اوّل تو اس لئے کہ ہم نے خالی خولی نکتہ چینی کرنے والوں کا سچ جھوٹ نکھارنے کا خوب انتظار کر رکھا ہے۔ دوسرے ہمارے ہاں انقلاب برپا ہو تو خون بہانا شرط نہیں۔ امریکہ میں بھی آج تک "میاں ہیچو ما دیگرے نیست" کو زیادہ سے زیادہ یہی سزا دی گئی کہ منہ کالا کر دیا، یا جانوروں کے پر چپکا کر سوانگ بنا دیا۔ جن ممالک میں سیاسی انقلاب کے ساتھ "موت کا کھیل" لازم و ملزوم ہے، وہاں "میاں ہیچو ما دیگرے نیست" کی جان بمشکل ہی سلامت بچتی ہے۔ بالعموم انقلاب کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ "میاں ہیچو ما دیگرے نیست" موجودہ نظام کے خلاف تخریبی نکتہ چینی کی مہم کا آغاز کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں اُن کا ہر فرمان بمنزلہ الہام تسلیم کیا جاتا ہے۔ انقلاب پسند انہیں اپنا روحانی پیشوا تصور کرتے ہیں۔ جب کشمکش بڑھ جاتی ہے تو روز بروز انتہا پسندوں اور جنونیوں کا اقتدار ترقی کرتا ہے۔ جنونی لوگ کبھی نکمّی اور تخریبی نکتہ چینی برداشت نہیں کرتے۔ غرض "میاں ہیچو ما دیگرے نیست" کی شامت آجاتی ہے۔ عام مخلوق اُن کو سزا ملنے پر بے انتہا خوشی کا اظہار کرتی ہے۔ دیرپا انقلاب وہی ہوتے ہیں جو کچھ عرصہ بعد انتہا پسندوں کی دو جماعتوں میں ایک توازن قائم کر دیں۔ جب یہ مرحلہ آجائے تو "میاں ہیچو ما دیگرے نیست" سخت کبیدگیٔ خاطر میں مبتلا ہو جاتے

ہیں۔ گو ہمیں اُن سے ہمدردی ہے، تاہم یہ فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کی مناسب جگہ لکچر گھر ہے، یا پھر کوئی کتب خانہ، تخت نشینی اُنہیں راس نہیں آتی۔

ہندوستان میں سلطنتِ انگلشیہ مدّتوں "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کی نکتہ چینی سے محفوظ رہی۔ ایک دستور قرار پا گیا تھا کہ برطانیہ کی وسیع عالمگیر سلطنت میں سے صرف ہندوستان ہی ایک ایسا مقبوضہ ہے جس پر تخریبی نکتہ چینی نہیں کرنی۔ جب خود انگلستان میں مختلف پارٹیوں کے اختلافات زیادہ تلخ ہو گئے تو اب اس دستور کا برقرار رہنا بھی ممکن نہ تھا۔ غرض حکومتِ ہند کے نظام پر بھی نکتہ چینی ہونے لگی۔ یہ نکتہ چینی کرنے والے وہی لوگ تھے جو ہمیشہ خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں۔

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ فی زمانہ "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کے اصول و عقائد کیا ہیں۔ پھر ہم اِن اصول و عقائد کا اطلاق ہندوستان کے موجودہ حالات پر کر کے یہ فیصلہ کریں گے کہ انگلستان میں "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کو جو اقتدار حاصل ہو چکا ہے، آیا اس کے پیشِ نظر ہندوستان میں سلطنتِ انگلشیہ کا باقی رہنا ممکن ہے؟ "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کی پارٹی آجکل انگلستان میں ایک زبردست پارٹی ہے

اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اُن کا رسوخ روز افزوں ہے۔

سادہ لوحی ضرر رسانی کی آڑ بن سکتی ہے

یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح ہر شخص سر منڈا کر، اور جُبّہ پہن کر قلندر نہیں بن سکتا، اسی طرح "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کے عقائد کا وظیفہ کرنے والے تمام لوگ ہرگز اُن کے ہمسر قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ حقیقی "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" اعلیٰ دماغی قابلیّت اور نہایت پاکیزہ چال چلن کے مالک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا میں ہمیشہ تنہا رہتے ہیں۔ لیکن اِن کی پارٹی میں ہر قسم کی جہنّمی مخلوق آشامل ہوتی ہے: امن کے وہ حامی، جو دراصل امن کے حامی نہیں بلکہ بزدل ہوتے ہیں؛ ضمیر کا نام لے کر اعتراض کرنے والے جن کا اپنا کوئی ضمیر ہی نہیں ہوتا۔ بین الاقوامیّت کا پرچار کرنے والے جن کی اپنی بین الاقوامیّت تجارت اور نفع تک محدود ہوتی ہے، انسانی ہمدردی اور نرم دلی کے مبلّغ جن کی چھان بین کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شکنجہ اور جیلخانہ کی مخالفت کرنے کی خود انہیں ذاتی طور پر اشدّ ضرورت ہے؛ وہ انتہا پسند جن کا خیال ہے کہ سماج کی بنیاد ہی انہیں ستانے کے لئے رکھی گئی تھی؛ وہ دلّال جو سلطنتوں کو تباہ ہوتا دیکھیں تو سوچتے ہیں

کہ بچے کھچے سامان سے بساطی کی دوکان خوب چل سکتی ہے۔ وہ بیروزگار اور باغی جوہر موجودہ کو مفقود کرنے کے درپے ہیں اور جو کسی قسم کے نظام کو برداشت نہیں کر سکتے؛ وہ مسخ شدہ ذلیل انسان جن کی سیاہ کاریوں سے اُن کی رگیں گناہ کی کھجلی میں مبتلا ہو چکی ہیں، اور اب اُنہیں اطمینان سے اپنی خواہشات پوری کرتے رہنے کے لئے دنیا کی تمام سلطنتوں میں دوستانہ تعلقات اور عالمگیر امن و امان کی ضرورت ہے، چاہے اس طرح قوم کو اپنے مفاد ہی قربان کرنے پڑیں، یا اپنے عقائد سے ہی غدّاری کی ضرورت محسوس ہو؛ وہ عاق شدہ اور محروم گروہ جو اپنے عاق کرنے والوں اور محروم کرنے والوں کے خلاف ہمیشہ انتقامی تجویزیں سوچتے رہتے ہیں؛ یہ سب اور اِن کے کئی دوسرے بھائی بند جو ہمیشہ سے منچلے سازشیوں کے آلۂ کار رہے ہیں، "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کی پارٹی میں آگھستے ہیں۔ یہ سب گروہ آج انگلستان میں بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اِن کے درمیان ایک ایسا باہمی اتحاد ہے جو ملک کے دوسرے طبقات کو میسّر نہیں۔

جمہوریت کے ڈھول کا پول

جو لوگ اس مہم کو چلا رہے ہیں، اُن کے لیڈروں کا نقشۂ جنگ دریافت کرنا نہایت ضروری ہے۔ خوش قسمتی سے میرے پاس

ایک کتاب ہے۔ جس کی مدد سے یہ کام آسان ہے۔ اس کتاب سے "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کے ایسے تمام عقائد معلوم ہو سکتے ہیں جن کے مطابق وہ برطانیہ کی عالمگیر سلطنت کو ڈھالنا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب انگلستان کے ایک سابق بادشاہ کی سوانحعمری ہے۔ اس کا مصنّف ایک ایسا شخص ہے جو "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کے عقائد سے خوب واقف معلوم ہوتا ہے۔ یوں تو اس کتاب کے مطالعہ سے انسانی امراض کے متعلق بھی خاصی واقفیّت بہم پہنچائی جا سکتی ہے، لیکن یہاں میں اس کے وہی حصّے پیش کروں گا جنہیں "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کی "کتابِ عقائد" یا "شکست خوردہ ذہنیّت رکھنے والوں کی بیاض" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ کتاب اور کسی کام کی نہیں۔ میں خود اِس کتاب سے بڑی حد تک متفق ہوں، لیکن مجھ میں بھی "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کے کئی اوصاف پائے جاتے ہیں، اور میں ہمیشہ سے شکست خوردہ ذہنیت کا شکار رہا ہوں۔

اِس کتاب اور اس قسم کی دوسری تصنیفات سے میں نے مسئلہ زیرِ بحث کے متعلق جو عقائد جمع کئے ہیں اُن کا لُبِّ لباب ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

(۱) دنیا میں نسل کوئی شئے نہیں۔ انگریز اُن انسانوں کا نام ہے جو انگلستان میں پائے جاتے ہوں۔ فرانسیسی وہ لوگ ہیں جو فرانس میں بستے ہوں۔ انڈمانی وہ ہیں جو جزائر انڈمان کے باشندے ہوں۔ اگر انڈمان کے رہنے والوں کا ایک خاندان گلاسگو میں لاکر آباد کر دیا جائے تو بغیر مخلوط توالد و تناسل کے بھی اِس خاندان کے بچے اِسکاچ قوم کے افراد بن جائیں گے۔

(۲) ہر نسل کے افراد کو حقِ خود اختیاری حاصل ہونا چاہئے۔ اُس کے آباؤ اجداد کے وقت سے جو علاقے اُس کے قبضہ میں چلے آ رہے ہیں، اُن پر اِس کا تسلّط برقرار رہنا چاہئے، چاہے وہ اِن علاقوں میں کچھ ہی کیوں نہ کرے۔ اگر کوئی بیرونی حکومت اِن کے معاملات میں دخل دیتی ہے تو یہ ظلم و ستم ہے۔ اگر برطانیہ ایسا کرے تو اور بھی بُرا ہے۔

(۳) باوجود اس کے دنیا کی ہر نسل کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ہمارے خیالات کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اُسے اچھی عادتیں اختیار کرنی چاہئیں، اور بُری عادتیں چھوڑ دینی چاہئیں۔ اچھا وہ ہے جسے ہم اچھا کہیں۔ بُرا وہ ہے جسے ہم بُرا کہیں۔ اگر بوئر جنوبی افریقہ میں انگریز آبادکاروں کا حقِّ رائے دہندگی چھین لیں تو یہ درست ہے، لیکن

اگر رومانیہ والے یہودیوں سے یہی سلوک کریں تو غلط ہے۔ افریقہ کے حبشی یوروپ سے آنے والے آبادکاروں کو مار ڈالیں تو کچھ ہرج نہیں۔ ترک اگر یونانیوں یا آرمینیوں کو قتل کریں تو یہ سخت ناواجب حرکت ہے۔

(۴) جمہوری فلسفہ فقط نظامِ حکومت ہی کی ایک صورت نہیں بلکہ جمہوریت پرستی ایک دین ہے۔ جس طرح عیسائیوں کے نزدیک عیسائیت کی تعلیمات ہر وقت اور ہر جگہ یکساں برحق ہیں، اسی طرح جمہوریت کا فارمولا ہمیشہ اور ہر قسم کے حالات میں قابلِ نفاذ ہے اکثریت جس بات کا مطالبہ کرے وہی عقل کا نچوڑ ہے۔

(۵) چند لوگوں کا حکومت کرنا ہمیشہ غلط ہوتا ہے، بالخصوص جبکہ نظامِ حکومت مطلق العنان ہو۔ روس کی مطلق العنان حکومت اس قاعدہ سے مستثنٰی ہے۔ جو لوگ اعتزال کی راہ اختیار کریں وہ بالعموم وسیع القلب ہوتے ہیں۔ وسیع القلب انسان ہمیشہ جمہوریت پرست ہوتے ہیں۔ زارِ روس نہ کلیسائے انگلستان کا پیرو تھا، اور نہ کلیسائے روم کا معتقد۔ اس لئے وہ معتزلی تھا، بلکہ اعتزال کا ایک مسلّم مبلّغ۔ اس لئے روس کی حکومت درپردہ ایک جمہوریت ہے۔

(۶) عوام ہمیشہ حق پر ہوتے ہیں۔ صرف برطانیہ کے عوام گذشتہ پچاس سال کے لئے گمراہ ہو گئے تھے۔ اس گمراہی کے دوران میں وہ جنگ پرستوں اور زر پرستوں کے چنگل میں پھنسے رہے۔

جنگ اور طاقت ایک گناہ ہے

(۷) جنگ کبھی جائز نہیں۔ جارحانہ جنگ لڑنا تو ناقابلِ معافی گناہ ہے۔ جنگ کا امکان ہو، تب بھی جنگ کی تیاری اتنی ہی بُری ہے۔ ظاہر ہے کہ جنگ کی تیاری نہ ہو گی تو جنگ بھی نہ ہو گی۔ اس طرح اس ناقابلِ معافی گناہ کا ارتکاب روکا جا سکتا ہے۔ دوسرے ممالک کے عوام ہمیشہ برحق ہوتے ہیں۔ اس لئے انگلستان کے خلاف جارحانہ جنگ کا کوئی خطرہ نہیں۔ اگر کوئی حکومت انگلستان پر حملہ کر ہی دے تو یہ صرف اُسی صورت میں ممکن ہے جب وہ حملہ آور طاقت حق پر ہو۔ اس صورت میں مدافعت گناہ کے مترادف ہو گی۔ غرض جنگ چاہے جارحانہ ہو، چاہے مدافعانہ، جنگ کے حامی ہر دو حالتوں میں گناہگار ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو جنگ پرست کہا جاتا ہے۔ جنگ پرست بالعموم احمق ہوتے ہیں۔ ربسا اوقات جنگ پرست بدمعاش بھی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی طفلانہ خواہشات پوری کرنے کی خاطر عوام کے پست ترین جذبات مشتعل کر دیتے

ہیں۔ جنگ پرست، زرپرستوں کے آلۂ کار ہوتے ہیں، یا اُن کے ساتھ شریکِ گناہ۔ زرپرست نہایت خطرناک لوگ ہوتے ہیں جو شخص روپیہ قرض دے کر، واپسی کی بھی توقّع رکھتے، ظاہر ہے کہ وہ کمینہ اور بدفطرت ہے۔ یہ ایسی واضح سچّائی ہے کہ اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ جب کوئی حکومت کسی زرپرست کے بیرونی مقروضوں سے اُس کا روپیہ برآمد کروانے کی خاطر اُس کی حمایت کرے تو ایسی حکومت ضرور بدنیّت ہوتی ہے۔

(۸) طاقتوروں کے لئے اپنی طاقت کا استعمال ناجائز ہے۔ حقوق کا مطالبہ ہمیشہ حدود و قیود کے اندر رہنا چاہیئے۔ اگر آپ اپنے توشہ خانے میں کسی چور کو پکڑ لیں تو اُس کے ساتھ مصالحت کر لینی چاہیئے پیچھے اُسے لے جانے دیں، بشرطیکہ کانٹے اور کفگیریں وہ آپ کے لئے چھوڑ جانے پر رضامند ہو شکست خوردہ دشمن پر حد سے زیادہ سختی کرنا بہادروں کا شیوہ نہیں۔ شاید دشمن ہی حق پر ہو۔ علاوہ ازیں دشمنوں پر سخت گیری میں خطرہ بھی ہے حکومتوں کو بالخصوص سخت گیری سے احتراز کرنا چاہیئے جب تک کسی حکومت کے ارکان "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" نہ ہوں تب تک عام طور پر یہی سمجھنا چاہیئے کہ حکومتیں

بالعموم غلطی پر ہوتی ہیں۔

حکومت کی ضرورت نہیں

(۹) ابھی تک خالص جمہوریت کو دنیا میں مستقل اور عالمگیر غلبہ حاصل نہیں ہوا۔ اس وجہ سے اکثر حکومتیں بالعموم غلطی پر ہوتی ہیں۔ جنگ پرستوں اور زر پرستوں کو اِن حکومتوں میں ضرورت سے زیادہ غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ اِن حالات میں تمام حکومتیں ظلم و ستم کی جانب میلان رکھتی ہیں۔ اُن سے ظلم و ستم کچھ بعید نہیں۔ اِس لئے اُن کے ظلم و ستم کا جو بھی الزام سننے میں آئے، چاہے اُس کی شہادت کیسی ہی مشکوک یا مبہم کیوں نہ ہو، اُس پر اعتبار کر لینا چاہیئے۔

اگر کسی حکومت پر ظلم و ستم کا الزام ہے وہ ادنیٰ اقوام پر حکمران ہے تو پھر اُس کے خلاف یہ الزام مزید آسانی سے قبول کر لینا چاہیئے۔

(۱۰) اگرچہ عوام ہمیشہ بھلے اور عقلمند ہوتے ہیں، باوجود اس کے افراد حریص، ظالم، خود غرض، بدچلن، اور غاصب ہیں۔ انسان کو بدی کا موقعہ ملنا چاہیئے پھر وہ فوراً اپنی سیاہ باطنی کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ یہ مقولہ انگریز قوم کے افراد پر اور بھی زیادہ صادق آتا ہے۔

(۱۱) میرے خیالات برحق ہیں۔ جو شخص مجھ سے اختلافِ رائے رکھتا ہے، وہ غلطی پر ہے، لہذا میرے مخالفوں کے متعلق حسنِ ظن سے کام لیا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ احمق ہیں۔ میرے خیالات کی سچّائی ایسی مسلّم ہے کہ میرے مخالفوں کو صرف بیوقوف نہیں سمجھنا چاہئے۔ وہ جان بوجھ کر حق سے روگردان ہو رہے ہیں۔ ایسے لوگ ضرور بدنیّت اور کمینہ فطرت ہوتے ہیں۔

حاکم خود حکومت چھوڑ دیں

جہاں تک ہمارے موضوعِ سخن کا تعلق ہے۔ مندرجہ بالا عقائد نامہ سے ہمارے زمانہ کے "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" کے اعتقادات سے اچھی خاصی واقفیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ پھر ہمارا مقصد تو صرف یہ اندازہ کرنا ہے کہ موجودہ عہد کے "میاں ہمچو ما دیگرے نیست" ہندوستان کے حال اور مستقبل کے متعلق کیا خیالات رکھتے ہیں۔

ان اعتقادات پر تنقید لاحاصل ہے۔ یہ تو صاف نظر آ رہا ہے کہ ان میں ایک خاص کشش ہے۔ بھلائی کی توقع رکھنا اچھی بات ہے۔ انسانی فطرت کی بلندی پر اعتقاد رکھنا کسی طرح قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ظلم و ستم سے نفرت کرنا کوئی بری بات نہیں۔ فاتح مفتوحوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیں تو کیا ہرج ہے۔ اگر رائے عامہ حکومتوں

کو بھی اخلاقی قانون کا پابند رکھے تو ہمیں خوش ہونا چاہیئے۔ صرف یہ خیال رکھنا ہے کہ اس قسم کے اعتقادات زبردست تباہی کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔ اگر ان اصولوں پر عمل کرنے والے بے غرض اور سنجیدہ اشخاص نہ ہوں، بلکہ منچلے سازشیوں کا گروہ یہ کام سنبھال لے تو ظاہر ہے کہ اِس سے ایک طرف تو مادی تباہی پھیل جائے گی اور دوسری طرف اخلاقی خرابیاں بھی رونما ہوں گی۔

شیطان کی معنوی اولاد ابھی تک اپنے والدِ ماجد کی عیاریاں نہیں بھولی۔ اُس بد بخت کی طرح اُنہیں یہ سبق خوب یاد ہے کہ میٹھے میٹھے بولوں سے ایک مرتبہ انسان غفلت کی نیند سو جائے تو

؎ صد مرض پیدا شد از بے ہمّتی
کوتہ دستی، بے دلی، دوں فطرتی

اسی غفلت اور تنزّل کو امن کہنا غلطی ہے۔

باب چہارم

سلطنتِ ہندوستان میں انتشار پیدا ہوتا ہے

خدا ترسوں کی پارٹی

انگلستان میں ایک اور پارٹی ایسی تھی جو حکومتِ ہند پر شک کی نگاہ رکھتی تھی۔ اس پارٹی کو ہندوستان سے ایک جذباتی دلچسپی تھی ہندوستان میں سلطنتِ انگلشیہ کی بقا میں اس پارٹی کو خاصا دخل ہے۔ انگلستان کی رائے عامہ کا کوئی عنصر بھی کھلی اور جانی بوجھی ستم رانی روا نہ رکھتا۔ باوجود اس کے یہ خطرہ ہمیشہ تھا کہ نسلی تعصب یا مالی لالچ سے اندھے ہو کر انگلستان کے حکمران کہیں ہندوستان میں ظلم و ستم سے آنکھیں نہ میچ لیں۔ ممکن تھا وہ ظلم و ستم ہوتا دیکھ کر بھی کہہ دیں کہ یہ تو ظلم و ستم نہیں۔ یہ ہندوستان میں

سلطنتِ انگلشیہ کی خوش قسمتی تھی کہ ایسے مواقع پر انصاف اور انسانی ہمدردی کی حمایت کرنے کو ایک زبردست اور بارسوخ جماعت موجود تھی۔ یہ جماعت ہنگامہ بھی خوب برپا کر سکتی تھی۔

اس جماعت کا ذکر ذرا تفصیل سے کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ انہیں خداترسوں کی جماعت کہنا چاہیئے۔ کسی نے آج تک جذبات پرستی کی تاریخ نہیں لکھی، گو اس کے لئے مواد فراہم کرنے میں غالباً کوئی ایسی دقّت نہیں۔ قدیم یونان اور قدیم روما میں بھی جذبات پرستی کے آثار ملتے ہیں۔ یوریپیڈیز کو شاید جذبات پرست کہا جا سکتا ہے، لیکن یوریپیڈیز تو یونان چھوڑ ایتھنز کے خیالات کا بھی نمائندہ نہیں کہلا سکتا۔ روما کی تاریخ میں بعض واقعات سے ضرور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اس شہر میں بے رحمی اور سنگدلی کا دور دورہ تھا، وہاں کبھی کبھی جذبات پرستی کا بھی اظہار کیا جاتا تھا۔ بیرحمی کی ایک مثال تو روما کا مشہور ایمفی تھیٹر ہی تھا۔ رحم دلی کی ایک مثال یہ ہے کہ پمپی اس نے بہت سے ہاتھی مروا ڈالے تو روما کے باشندوں نے بڑا درد محسوس کیا۔ پیڈانی اس کے غلام قتل ہوئے تو اس سے بھی رائے عامہ میں غیظ و غضب پھیل گیا۔ شروع شروع میں عیسائیوں کو سزائے موت کا حکم ملا تو اِس پر

صدائے احتجاج بلند کی گئی تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں جذبات پرستی خانقاہوں تک محدود تھی، بلکہ ہر خانقاہ بھی اس درد میں مبتلا نہ تھی۔

انگلستان میں ملکہ الزبتھ یا شاہ جیمز کے دور تک کسی اچھّے مصنّف کی تحریر سے جذبات پرستی کے آثار کا پتہ نہیں چلتا۔ سترھویں صدی کے آخری حصّہ اور اٹھارویں کی ابتدا میں تو یہ بہ ہیّت روز افزوں تھی۔ انگلستان کی سرکاری سالانہ تاریخ کی جلدیں ۱۷۵۸ء سے آگے دیکھی جائیں تو اِن سے اِس مسئلہ پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ شروع شروع میں انسانی دکھ درد کے واقعات کا ذکر اس لیے توجہی سے پایا جاتا ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ پھر بعد میں حبشی غلاموں کی رہائی کے مسئلہ پر جذبات پرستی کا پورا اظہار ہونے لگتا ہے۔ ہندوستان پر واقعی اور خیالی، مظالم بھی کچھ دنوں جذبات پرستی کا زبردست موضوع تھے یہ جذبات تھے تو نہایت بلند صرف خلافِ عقل تھے۔

جذبات پرستی

جذبات پرستی کو اس کی موجودہ شکل میں رائج کرنے والے فرانسیسی تھے۔ روسیو اس مذہب کا پیغمبر تھا، اور اس کی تصنیف: انسائیکلو پیڈیا اس دین کی کتاب قرار دی جا سکتی ہے۔ بعض لوگ اس عقیدہ کے پیرو بن گئے۔ اکثر درمیانی طبقہ کے لوگ اِن عقائد کو شک و شبہ

کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بالعموم جذبات پرست بدچلن اور بدکار ہوتے تھے۔ انگلستان میں جذبات پرستی نے تبھی رواج پکڑا جب یہ پابندیٔ اخلاق اور ایک خاص قسم کی عیسائیت کا رنگ اختیار کر چکی تھی۔ بہر صورت لبرل پارٹی کے بانیوں کے عقائد کا جذبات پرستی سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

یہ مانا کہ بے انصافی اور ظلم سے بیزاری کا حق ہر انسان کو حاصل ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جن لوگوں کے کندھوں پر رعایا کے معاملات کا انتظام کرنے کا بوجھ ہو اُن میں انصاف پرستی کا احساس زیادہ بیدار ہونا چاہیئے، لیکن یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ قانون کے خلاف چلنے والوں کو سختی سے سزا دینا، باغیوں کو جلد از جلد بغیر کسی رعایت کے کچل دینا، اور سرکشوں کے دماغ درست رکھنا بھی نظم و نسق کے لئے اتنا ہی لازمی ہے۔ جہاں شک کی گنجائش ہو، وہاں بعض طبائع سختی کی طرف رجحان رکھتی ہیں، اور بعض کا میلان نرمی کی جانب ہوتا ہے۔ یہاں دقّت صرف یہ ہے کہ جب کسی مستعد عہدیدار کو ڈر ہو کہ نظم و نسق کے دوران میں ہر سختی کے لئے اُسے ایک زبردست، بدگمان، اور مشتعل رائے عامہ کے سامنے صفائی پیش کرنی ہوگی، تو اُس کے فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ واقع

ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جذبات پرستی کی حیثیت ایک نگہبان کی سی ہے اور اُسے اپنی حدود سے تجاوز نہ کرنے دیا جائے، یعنی عدالت کا منصب اُسے نہ سونپ دیا جائے تو اس سے بہت اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ کمزور اور بزدل عہدیدار تو پھر کچھ عرصہ سلطنت کا کاروبار چلا ہی لیں گے، لیکن جس سلطنت میں ہمیشہ ظلم وستم اور بے انصافی کا راج ہو، وہ تو شیطان کی بستی ہوئی۔ بے غرض، دانا لوگ ایسے نکتہ چینوں سے ناراض نہ ہوتے تھے، بلکہ اِن کے ممنون تھے۔

پرہیزگاروں کی اصلیت

لبرل پارٹی کے انتہا پسند اراکین کچھ ایسے خوشگوار رفیق نہ تھے۔ نوجوان سرکاری ملازمین یہی سمجھتے تھے کہ یہ لوگ زندگی کے تجربات سے محروم ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ شہوت رانی بیوی کے ساتھ بھی اتنی ہی ممکن ہے، جتنی کہ رنڈی کے ساتھ۔ چوری جنگلوں میں بھی اُسی طرح کی جا سکتی ہے جس طرح کہ شہروں میں۔ جبر و استبداد مرمریں محلات میں بھی اتنا ہی ممکن ہے جتنا کہ سنگین قلعوں میں۔

یہ انتہا پسند لوگ کون تھے؟ کچھ تو اِن میں سے وہ بدقسمت

تھے جن کی گھر والیاں بدصورت یا بوڑھی تھیں، یا ادھیڑ عمر کی رانڈ عورتیں، جن کے چہرے زرد ہوتے تھے اور ہاتھ پلپلے۔ بعض غریب بدمزاج اور تنہائی پسند بیبیوں کے شوہر تھے۔ بعض ایسے خاوند تھے جن کی جورو سے بنتی نہ تھی، یا جن کی عورتیں درشت مزاج تھیں۔ پھر اس میں تعجب کیا ہے کہ یہ لوگ "پاکیزگی" کا ذکر اپنی محفلوں میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی کرتے تھے۔ جرائم پیشہ افراد پر نظر رکھنے والی اور بیرونی ممالک سے آنے والے اجنبیوں کی چھان بین کرنے والی پولیس کو اس قسم کے لوگوں کے نامۂ اعمال کی تفتیش کرنے کی ضرورت اکثر پیش آتی رہتی ہے۔ ان حضرات کو ظلم و ستم اور بدچلنی کے عجیب و غریب قصّے سُننے اور سنانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ایسے قصّوں پر آسانی سے یقین بھی کر لیتے ہیں۔

اس قسم کے جذبات پرستوں کے مذہبی عقائد سے کئی لوگوں کو سخت گھِن آتی ہے۔ خدا کے متعلق اُن کا تصوّر یہودیوں کی طرح یہ نہیں کہ وہ شریعت کی پابندی کا تقاضا کرتا ہے، بلکہ خدا کو وہ اندر مہاراج جیسا دیوتا خیال کرتے ہیں، جو گناہوں سے چشم پوشی کر لیتا ہے۔ اُن کا خدا زانیہ سے بھی درگذر کر لیتا ہے۔ اُسے سنگساری کی سزا نہیں دیتا۔ اِس خدا کا مقدّس شہر برباد ہو جائے تو وہ اِس

کی دیوار کے سہارے کھڑا ہو کر آہ و زاری کرنے لگتا ہے۔ بغاوت اور بدچلنی کرنے والوں کے خلاف اپنی فوجیں بھیج کر انہیں تباہ و برباد نہیں کر دیتا۔ ایسے لوگوں کو عالمِ نزع میں شہیدوں کے آنسوؤں اور دردِ و کرب کا ذکر کرنے اور اس پہ زار زار رونے سے ایک خاص قسم کی راحت محسوس ہوتی ہے۔ روما کے ظالم حکمران غریب عیسائیوں کو کس طرح کوڑے مارا کرتے تھے۔ یسوع مسیح کا خون کس بے دردی سے زمین پر گرایا گیا۔ ایسے تذکرے ہر وقت ان کی زبان پر رہتے ہیں۔

بعض ستم ظریف تو اِن انتہا پسندوں کے متعلق پھبتی کے طور پر کہا کرتے ہیں کہ اِن کے نزدیک کسی ماہ جبیں لڑکی کے لبِ لعلیں کا بوسہ لینا مہا پاپ ہے، لیکن کسی کالے کلوٹے حبشی کی پابوسی اور احترام ثوابِ عظیم ہے۔ یہ پھبتی تو شاید اُن کے ساتھ زیادتی ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی انگریز قتل کر دیا جائے، یا کسی انگریز عورت پر مجرمانہ حملہ ہو جائے، اور یہ مجرمانہ حملہ کرنے والا کوئی حبشی یا ایشیائی ہو تو اِن جذبات پرستوں کی انسانی ہمدردی کو اُس وقت نیند آ جاتی ہے۔

حکومت رعب سے ہوتی ہے ترس سے نہیں!

اِس پارٹی کو ہندوستان میں سلطنتِ انگلشیہ کے متعلق ہمیشہ شکوک و شبہات لاحق رہتے تھے۔ کبھی تو لارڈ ویَن ٹارٹ کے دنوں کے ظلم و ستم اور تحیلِ مجرمانہ کا ذکر ہوتا تھا۔ کبھی برک اور میکالے کے لگائے ہوئے الزامات دہرائے جاتے تھے۔ کبھی غدر سے پہلے کے اُن انگریز افسروں کو یاد کیا جاتا جنہوں نے ہندوستان میں عیسائیت کے قوانین اور اخلاق کے خلاف زندگیاں بسر کی تھیں۔ کبھی موجودہ کوہستانی تفریح گاہوں (شملہ وغیرہ) کے افسانے بڑھا چڑھا کر سنائے جاتے، اور واویلا ہوتا کہ دیکھو کس طرح اخلاق کی مٹی پلید کی جاتی ہے۔ کالی بھیڑیں تو ہر طبقہ میں پائی جاتی ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ وقتاً فوقتاً ایک آدھ افسر رشوت بھی لے لیتا، اور ظلم و ستم بھی کرتا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ چونکہ نظم و نسق قانون کا سختی سے پابند تھا، اس لئے مجرموں کو ہمیشہ اس درشتی سے سزا نہ دی جا سکتی تھی جس کا رائے عامہ مطالبہ کرتی۔ علاوہ ازیں کئی افسر ایسے تھے جو دیانتدار تھے، جن کا چال چلن پاکیزہ تھا، اور جو بغیر کسی کی رعایت کے نظم و نسق چلاتے تھے، یا اگر فوجی تھے تو سورما سپاہیوں کی طرح لڑتے تھے۔ لیکن اُن کا رویہ عوام کے ساتھ متکبرانہ اور مغرورانہ

تھا۔ "ڈیم کالا آدمی" ہر وقت اُن کا تکیۂ کلام تھا۔

نظم و نسق کا عام رجحان اور افسروں کا سلوک عیسائی مشنریوں کے ساتھ کچھ اچھا نہ تھا۔ مشنری جذبات پرستوں کی پارٹی کے ساتھی اور اُن کے جاسوس تھے۔ حکومتِ ہند کے مقامی افسر چاہے دیوانی ہوں اور چاہے فوجی، اُن طبقات سے بھرتی ہو کر نہ آتے تھے جن کی جذبات پرستوں کی پارٹی میں اکثریت تھی۔ اگر کوئی افسر خود اِن طبقات سے تعلق رکھتا بھی تھا، تو جلد اِن سے بیزار ہو جاتا تھا۔ انگلستان میں جو اُصول مسلّمات میں شمار ہوتے تھے، وہ ہندوستان میں خلافِ عقل تصوّر کیے جاتے تھے۔

قدیم خیال، اور بالائی طبقہ کے مذہبی لوگوں اور جدید مذہبی خیالات رکھنے والے عوام میں ہمیشہ سے اختلاف رہا ہے۔ مدرسہ سے پڑھ کر نکلنے والوں، اور خانقاہوں میں تربیت پانے والوں میں کبھی نہیں بنتی۔ یہ خدا ترس فرقہ کے لوگ خوب جانتے تھے کہ ہندوستان میں رہنے والے انگریز عیسائیت کے قدیم عقائد کے پیرو تو ہرگز نہیں۔ اُنہیں یہ بھی شک تھا کہ یہ سرے سے عیسائی بھی ہیں یا نہیں۔ پھر جو نظام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو اُس پر بھلا اُنہیں کیسے اعتماد ہو سکتا تھا؟۔

ہر بھلائی کے ساتھ کچھ برائی بھی ہوتی ہے

شاندار محلّات میں بھی مجبوراً بعض کمرے قضائے حاجت کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ خوبصورت مندروں کی تہ میں بھی گندے پانی کے نکاس کے لئے نالیاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح زبردست سلطنتوں میں بعض لوگ جابر اور متکبر بھی ہوتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں خاص اختیارات اور خاص مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ بعض اپنے محدود دائرہ میں ظلم وستم بھی کرتے ہیں۔ ایسے مواقع پر کچھ لوگوں کی نگاہیں ہمیشہ غلاظت اور خباثت پر ہی مرکوز رہتی ہیں۔ وہ تھوڑی سی کوتاہی نظر انداز کر کے اصلی بلندی اور شان و شوکت سے محظوظ نہیں ہو سکتے۔ یہ درست ہے کہ اس کے برعکس بعض لوگ شان و شوکت کے مناظر میں محو ہو کر تصویر کے تاریک رخ کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ جو شخص اپنی نگاہ اور اپنے دماغ میں توازن برقرار رکھ سکتا ہے، وہ یقیناً قابلِ رشک ہے۔ میری رائے میں آسمانی دیوتے اُس شخص سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوتے جو ہمیشہ قضائے حاجت کے کمرے سونگھتا پھرے، یا ہر وقت چلّہ خانہ میں گھسا رہے، بلکہ وہ اس پر مہربان ہوتے ہیں جو دینی اور دنیاوی فرائض دونوں ٹھیک طرح سرانجام دیتا ہے۔

یہ پارٹی دو لحاظ سے ہندوستان کے لئے مضرت رساں تھی۔ ایک تو اُن کا "ہندوستان میں مظالم" کا چرچا کرنے کا جنون، نظم و نسق کے لئے ذمہ دار عہدہ داروں کو جرائم کا انسداد کرنے سے باز رکھتا تھا۔ دوسرے یہ پارٹی حکومتِ ہند کو بعض ایسے اقدامات پر مجبور کر دیتی تھی۔ جو گو اصولاً نہایت قابلِ تعریف تھے، لیکن ہندوستان کے باشندوں کو قبول نہ تھے۔ مخربِ اخلاق رسوم کا انسداد ہندو دھرم یا ہندو خاندان کی روایات پر حملہ کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ کارخانوں کے متعلق سرکاری قوانین بنانے کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ مانچسٹر کے کارخانہ داروں کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کو دبانا مقصود ہے۔ مخالفتِ افیون کے قوانین پر اعتراض یہ تھا کہ لوگوں کی ذاتی عادات میں خواہ مخواہ دخل دیا جا رہا ہے، بلکہ یہ بھی کہا جاتا کہ برطانیہ میں مالِ خام کی درآمد بڑھانے اور ہندوستان کے مالیانہ کو گھٹانے کے لئے اس قسم کی چالیں چلی جاتی ہیں۔ تجارت پر کسی قسم کی پابندیاں عائد نہ کی جائیں تو اس کا مفہوم یہ قرار پاتا کہ ہندوستان کی ترقی کو روکنے کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ صلح پسندی کی توجیہ یہ کی جاتی کہ برطانوی تجارت کے فروغ کے لئے ہندوستان کے دھن اور بل کو ناجائز طور پر ضائع کرنے لئے یہ بہانہ سازیاں ہو رہی ہیں۔ ایسے بیسوں

اقدامات گنوائے جا سکتے ہیں جو بجائے خود بہت اچھے تھے، اور حکومتِ ہند پر ٹھونسے گئے۔ حکومتِ ہند نے طوعاً و کرہاً انہیں اختیار، یا بعض حالات میں مجبوراً انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دونوں حالتوں میں اِس کا اثر برطانیہ کی شہرت پر اچھا نہیں پڑا۔

ہندوستانی مغلوب النفس ہیں

ہندوستان کے سیاست آشنا طبقات اِن جذبات پرستوں کی ہنسی اڑاتے تھے۔ جذبات کی پاکیزگی کے متعلق اس جماعت کا ذوق و شوق ہندوستانیوں کے لئے ایک معمّہ تھا۔ اہلِ مشرق اپنے روزِ پیدائش سے لے کر موت کی گھڑی تک شہوانیات میں ڈوبے رہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مرد و زن کے تعلقات نہ تو ناگوار ہیں اور نہ ہی اِن میں فی نفسہٖ کچھ بُرائی ہے، بلکہ وہ تو اِن تعلقات کو انسانی فرض خیال کرتے ہیں۔ تارک الجماع چاہے مرد ہو، چاہے عورت، اُن کے نزدیک انسانیت کا غدار ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ لا رھبانیت فی الاسلام۔ تاہم مسلمان مسجد کے اندر اپنے پر قابو رکھتے ہیں۔ برعکس اس کے ہندو تو مندروں کے اندر بھی قدرتِ الٰہی کا اظہار زیادہ تر جنسی مظاہر کی وساطت سے ہی

محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً ذاتِ الٰہی کی وحدت اور کثرت بھی جنسی اشارات اور علامات کے ذریعہ بیان کی جاتی ہے۔ دونوں مذاہب میں چند مٹھی بھر لوگوں نے جنسی تعلقات کی سرے سے ممانعت ضرور اختیار کر رکھی ہے، لیکن اِن کی تعداد میرے دعوے کا ثبوت ہے۔

جذبات پرستوں کی عملی ہمدردی کے اقدامات ہندوستانیوں کے لئے مزید تعجّب کا باعث تھے۔ ہمارے ہاں ظلم کا جو مفہوم ہے اِن معنوں میں شاذ و نادر ہی کوئی ہندوستانی ظالم ہوتا ہے ہندوستان کی نسل کے لوگ چاہے مسلمان ہوں چاہے ہندو، اُنہیں خون اور درد کے دیکھنے میں کبھی راحت محسوس نہیں ہوتی۔ بعض مسلمان حکمران اپنے شوقِ خون آشامی کے باعث اس کلّیہ سے مستثنےٰ تھے، لیکن تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں جب کبھی اور جتنا ظلم ہوا اُوہ باہر سے آنے والی نسلوں نے کیا۔ بالخصوص تورانی نسل کے قبیلے اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں۔ تشدّد اور زیادتی میں بھی ہندوستانیوں کو کچھ لطف نہیں آتا۔ بحیثیتِ عدالت، پنچ یا قانون ساز کے اُنہیں خون بہانے یا ایذا رسانی کا کچھ شوق نہیں ہوتا۔

ظلم کا مشرقی تصوّر

یہ ٹھیک ہے کہ ہندوستانیوں کو ایذا پہنچانے سے ایک گونہ نفرت ہے۔ ایذا رسانی سے اِن کی یہ ہچکچاہٹ نسائیت کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، لیکن ایذا پہنچانے سے اُن کا تامّل ایک سوچا سمجھا ہوا اور سنجیدہ فعل ہے۔ جذبات پرستوں کو خون کی بو سونگھ کر جو ہمدردی کے دورے پڑنے لگتے، اُن کو ہندوستانیوں کے خاموش عدمِ تشدّد سے کوئی مشابہت نہیں۔ ہندوستانیوں کو ذاتی طور پر موت کا کوئی ڈر نہیں۔ موت اُن کے نزدیک دنیا کی بدترین برائی نہیں جو کسی انسان کو پیش آسکتی ہے۔

قحط، وبا، بیرونی دشمن کے حملہ، یا کسی ملکی حکمران کے تشدّد سے مخلوق کی بہت بڑی تعداد ماری جائے تو اِس میں تشویش کی کوئی بات نہیں۔ رفتارِ زمانہ سے یوں بھی چند ہی سال میں ظالم و مظلوم دونوں کا خاتمہ ہوتا تھا۔ ہر انسان کو فطرت کی عدالت سے سزائے موت مل چکی ہے۔ اب یہ دیوتاؤں کی مرضی ہے کہ کب اور کس کے ہاتھ سے اس سزا کی تکمیل ہو جائے۔ رہی رنج و درد اور تکلیف کی بات۔ گو ہمیں افسوس ہے کہ انسان کو رنج و درد، غم اور تکلیف سہنے پڑتے ہیں، لیکن زندگی پیدائش سے لے کر موت

تک رنج و آلام اور تکلیف سے پُر ہے۔ جو شخص اس تکلیف سے بچنا چاہے، اُس کے لئے ہمیشہ خودکشی کا راستہ کھلا ہے، بہر حال ہم اس کا کیا علاج کر سکتے ہیں۔ ہم خود تو کسی جاندار کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے، کیونکہ ایسا کرنا ایک مثبت فعل ہے، اور ہمارے عقیدہ میں ہر مثبت فعل ایک گناہ ہے، لیکن ہم قدرت کے بھیجے ہوئے رنج و غم، درد و تکلیف، ایذا اور مصیبت کو دور کرنے کی بھی کوشش نہ کریں گے، کیونکہ ایسی مداخلت بجائے خود ایک مثبت فعل ہے، اور اس لئے ممکن ہے کہ ہمیں اس کا بھی گناہ ہو۔ کم از کم یہ بات تو ہمارے احاطۂ فہم سے باہر ہے کہ انسانی بھائیوں کی تکلیف دور کرنے کا تو ایسا خبط ہو، اور گاؤ ماتا یا غریب کیڑے مکوڑوں کی ذرّہ بھر پرواہ نہ ہو۔

قتلِ عام کا ایشیائی تصوّر

قتلِ عام اگر حکومت کی جانب سے ہو تو اہلِ مشرق اُسے فی نفسہٖ کچھ ایسا مذموم خیال نہیں کرتے۔ ہندوستانیوں کو تو اس کا بہتیرا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ سیاسی قتلِ عام کی کئی قسمیں ہیں ہندوستانیوں کو اِن مختلف اقسام میں سے کسی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ایک قتلِ عام تو وہ ہوتا ہے جس سے کمزور حکومتیں اپنا کام چلاتی ہیں۔ جب

وقتاً فوقتاً جرائم کا انسداد نہیں کیا جاتا، بالخصوص جب کوئی خطرناک تحریک، فی الفور نہیں دبائی جاتی تو پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ حکومت یا تو خود حفاظتی کے لئے اپنے مخالفوں کے ساتھ لڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے، اور یا اُسے اپنا بوریا بندھنا اُٹھانا پڑتا ہے۔ انگلستان کی سیاسی پارٹیوں کے باہمی اختلافات بنیادی نہیں اِس لئے وہاں ایسی نوبت آجائے تو وزارت استعفےٰ داخل کر دیتی ہے۔ اب فرض کیجئے کہ انگلستان میں کوئی ایسی انقلابی پارٹی پیدا ہو جائے جو اپنے آپ کو اتنا طاقتور سمجھے کہ ہم حکومتِ وقت کو بنوکِ شمشیر شکست دے سکتے ہیں، لیکن الیکشن میں اُسے اتنے ووٹ نہ مل سکتے ہوں کہ موجودہ وزارت کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا جا سکے تو کیا ایسی پارٹی قتلِ عام کے ذریعہ اپنا مقصد حل نہ کرے گی؟ انگلستان میں سالہا سال سے یہ صورتِ حالات پیدا نہیں ہوئی، کیونکہ یہاں کی پارٹیوں کے باہمی اختلافات ایک دوسرے کے لئے ناقابلِ برداشت نہیں۔ البتہ تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں کہ انگلستان کی دو پارٹیوں میں ناقابلِ برداشت اختلافات پیدا ہو جائیں تو انگریز بھی قتلِ عام کے ارتکاب میں پورے سفاک ثابت ہوتے ہیں۔ اس قسم کے قتلِ عام کو "سیاسی قتلِ عام" کہا جا سکتا ہے۔ اہلِ مشرق

میں اس قتلِ عام کا خاصہ رواج ہے۔ بالعموم مشرق کے شاہی خاندان سات پشتوں تک برسرِ اقتدار رہتے ہیں۔ پہلی تین پشتیں باہمت اور لائق حکمرانوں کی ہوتی ہیں، جو اپنے دشمنوں کو ختم کر کے، اور جنگیں لڑ کر، تخت حاصل کرتے ہیں۔ آخری دو پشتیں ایسے فربہ اندام اور بُزدِل احمقوں کی ہوتی ہیں جن کے ماتحت مختلف طاقتور پارٹیاں تخت پر قبضہ جمانے کے لئے باہمی کشمکش میں مصروف رہتی ہیں۔ سلطنت اِن پارٹیوں کے ہاتھ میں کھلونا بنی رہتی ہے۔ بیچ کی دو پُشتیں ایسے حکمرانوں کی ہوتی ہیں جو معاملاتِ سلطنت سے تغافل برتتے ہیں، لیکن اتنے نا اہل بھی نہیں ہوتے کہ بآسانی تخت سے معزول کئے جاسکیں۔ اِن دو پشتوں کی حکومت کے دوران میں اکثر سیاسی قتلِ عام ہوتا رہتا ہے۔ حکمران غافل ہوتا ہے۔ مختلف دھڑے بندیاں موقع پاکر طاقت حاصل کرلیتی ہیں۔ آخر کار حاکم کو پتہ چلتا ہے کہ ایک پارٹی خطرناک ہے، لیکن حکومت کے عام وسائل کے ذریعہ اس سے نپٹنا ممکن نہیں۔ حاکم خود مستعفی ہونے پر تیار نہیں ہوتا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ سوائے قتلِ عام کے اور کیا ہوسکتا ہے۔

اہلِ مشرق کو بدنظمی کا ایسا خوف ہے، وہ اپنے تاجدار کو اُس کے مخالفین کے مقابلہ میں برتر دیکھنے کے اتنے شوقین ہیں کہ سیاسی

قتلِ عام اُن کے نزدیک قابلِ نفرین نہیں بلکہ قابلِ تعریف ہے۔ مشرقی مدبرین کی کتابیں دیکھو تو وہ سختی کی نسبت نرمی کرنے والے بادشاہوں کی زیادہ مذمت کرتے ہیں۔

زیاد بن ابیہی

مشرق کے ایک صوبیدار زیاد کے متعلق ایک حکایت اِس مسئلہ کی بابت نہایت سبق آموز ہے۔ چونکہ اِن زیاد صاحب کی ابوّیت کے دعوے دار کئی تھے اس لئے ان کو زیاد بن ابیہی بھی کہا جاتا ہے۔ اُن دنوں خلافتِ اسلامیہ پر بنو سفیان کا قبضہ تھا۔ زیاد صاحب نے بھی کسی حیلہ بہانہ سے اپنا شجرۂ نسب اس قبیلہ کے ساتھ ملا لیا۔ زیاد نے جلد ہی اعلیٰ انتظامی قابلیت کا اظہار کیا، اور خلیفۂ وقت نے اُسے بصرے کا حاکم مقرر کر دیا۔ بصرہ ایک قسم کی فوجی نوآبادی تھی۔ بصرہ کی آبادی نسلی لحاظ سے مخلوط تھی۔ یہاں کی آبادی باغیانہ اور ملحدانہ خیالات رکھتی تھی۔ زیاد نے حکومت سنبھالی تو دیکھا کہ چاروں جانب ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ احکامِ اسلام کی کھلے بندوں خلاف ورزی ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ کے خاندان سے ہمدردی زوروں پر ہے۔ نہ کسی کی جائداد محفوظ ہے، اور نہ عورتوں کی عزت۔ زیاد نے لوگوں کو تنبیہ کی کہ اِن حرکتوں سے باز آجاؤ۔ لوگوں نے آپس میں ہنسی اڑائی۔ زیاد نے

معلوم کیا کہ زیادہ جرائم اور شرارتیں رات کو ہوتی ہیں۔ لوگ سورج چھپتے ہی سو جانے، خانگی فرائض سرانجام دینے، عبادت کرنے، یا مطالعہ کرنے کے بجائے سڑکیں ناپنا شروع کر دیتے۔ کہیں شراب خانوں میں رونق ہوتی، کہیں منقش عورتوں کے ساتھ صحبت ہوتی، کہیں ممنوعہ مذہبی جلسے منعقد ہوتے، کہیں شرفاء کے مکانات پر یلغار کی جاتی، غرض اچھی خاصی شیطانی دھما چوکڑی مچتی۔ زیاد نے یہ دیکھ کر ایک اعلان کر دیا کہ شام کی نماز سے لے کر صبح کی نماز تک کوئی شخص شہر کی کسی سڑک یا چوک پر باہر نہ نکلے۔ لوگوں نے پھر آپس میں اس حکم کی ہنسی اڑائی۔

زیاد نے پہلی رات فوج کا ایک رسالہ ہمراہ لے کر خود شہر کی گشت کی اور چار ہزار باشندوں کو اپنے اعلان کی خلاف ورزی کی سزا میں وہیں قتل کر دیا۔ دوسری رات چار سو آدمی اسی طرح قتل ہوئے۔ تیسری رات جب زیاد گشت کو نکلا تو سارا شہر قبرستان کی طرح خاموش تھا۔ سڑکیں اور چوک سنسان پڑے تھے۔ صبح کی نماز سے تھوڑی ہی دیر پہلے زیاد شہر کے ایک دور دراز حصّہ میں پہنچا جہاں منڈی لگا کرتی تھی۔ یہاں اُس نے دیکھا کہ ایک بوڑھا گڈریا اپنے ریوڑ کے بیچ میں سو رہا ہے۔ حاکم بصرہ نے سوال کیا، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ گڈریے نے

جواب دیا حضور میں رات شہر کے دروازے بند ہونے سے پیشتر یہاں آگیا تھا، تاکہ یہیں چوک میں سو رہوں، اور صبح منڈی میں میرا مال سب سے پہلے بکے۔ حاکمِ بصرہ نے پوچھا: تم نے میرے اعلان کی خلاف ورزی کیوں کی؟ گڈریا بولا: حضور، مجھے اُس کا علم نہ تھا۔ حاکم بصرہ نے سوال کیا: کیا رعایا کا فرض نہیں کہ حاکم کے احکام سے مطلع رہے؟ گڈریے نے عذر کیا: میں ایک دور کے ضلع سے آیا ہوں، لکھنا پڑھنا نہیں جانتا، اس لئے سچ مچ آپ کے نئے اعلان سے بے خبر ہوں۔ زیاد نے کہا: میں تمہیں جان بوجھ کر نافرمانی کرنے کے جرم سے بری کرتا ہوں، لیکن اِس کا کیا علاج کہ بہر حال تم نے نافرمانی کی ہے۔ آج میں تمہارا عذر تسلیم کر لوں، تو کل سے سینکڑوں عذر ہونے لگیں گے۔ بعض بہانے بہت وزنی بھی ہوں گے۔ اس طرح شریعتِ اسلام کی بے حرمتی جاری رہیگی، جن لوگوں کو میں قتل کر چکا ہوں اُن کی موت رائگاں ثابت ہو گی، اور اِس کے بعد جو خونریزی ہو گی اُس کے لئے میں خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گا۔ اس لئے تمہیں بہشت میں ارسال کرنا ہی مناسب ہے! یہ کہہ کر زیاد نے بوڑھے گڈریئے کو قتل کر دیا۔

زیاد بنو امیہ کا زبردست حامی تھا۔ اس لئے مسلمان مؤرخین

بالعموم اُس سے خوش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مؤرخین نے گذرے ہوئے کے ساتھ اُس کے اِس سلوک کی ہلکی سی مذمت کی ہے۔ لیکن جہاں تک امن و امان قائم رکھنے کے متعلق اُس کی عام پالیسی کا واسطہ ہے، سب اُس کی تعریف کرتے ہیں۔

قتلِ عام کی قسمیں

ہندوستان کے ایک بادشاہ محمد تغلق کا ظلم و ستم دیوانگی کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ قطع نظر ظلم و ستم کے وہ ایک زبردست شہنشاہ، عالم، غازی، اور عظیم الشان حکمران تھا۔ مشرق میں حاکم کے ظلم و ستم کے خلاف رعایا شاذ ہی بغاوت کرتی ہے۔ محمد تغلق کے ظلم و ستم کی انتہا یہ تھی کہ جس طرح اہلِ روم نے تنگ آکر اپنے بادشاہ میکسی مین کے خلاف بغاوت کر دی تھی، اسی طرح اِس کی رعایا نے بھی بغاوت کر دی۔ رحم دل اور فاضل مؤرخ ابنِ بطوطہ محمد تغلق کا معاصر تھا۔ بطوطہ دو دفعہ خود تغلق کے ہاتھوں قتل ہوتے ہوتے بچا۔ اُس نے اس عہد کی تاریخ لکھی ہے۔ گو وہ تغلق کے مظالم کی مذمت کرتا ہے لیکن نہایت نرم الفاظ ہیں۔

مشرق قتلِ عام کی ایک اور قسم سے بھی ناآشنا نہیں۔ اسے ہم "مدبرانہ قتلِ عام" کہہ سکتے ہیں۔ سیاسی قتلِ عام اور "مدبرانہ

قتلِ عام" میں فرق یہ ہے کہ مدبرانہ قتلِ عام ناگزیر نہیں ہوتا۔ اِسے بطور حفظِ ماتقدم اختیار کیا جاتا ہے۔ جب کسی پارٹی یا دھڑے کے متعلق خدشہ ہو جائے کہ شاید یہ کبھی خطرناک ثابت ہو، تو اُس کو بر وقت قتل کر دینا بھی بسا اوقات قرینِ مصلحت سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کا قتلِ عام یورپ میں بھی بکثرت ہوتا ہے۔ سینٹ بارتھولومیو کا قتلِ عام اس قسم کی مشہور مثال ہے۔ مشرق کی رائے عامہ بالعموم ایسے قتلِ عام کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھتی ہے۔

قتلِ عام کی تیسری قسم "سازشی قتلِ عام" ہے۔ یہ قتلِ عام حکومت کی فوجوں کے ہاتھوں سرانجام نہیں دیا جاتا، بلکہ حکومت کے حامی اور مددگار خود ہی اپنے مخالفین کو ختم کر دیتے ہیں۔ ایسے قتلِ عام کو ایشیائی سیاسی مصنفین اچھا نہیں سمجھتے۔ وہ ناتجربہ کاروں کی سیاست اور انتظامی کوششوں کے حق میں نہیں۔ اُن کی رائے میں اگر قتلِ عام کی ضرورت ہو تو خود حکومت کو اس کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک سازشی قتلِ عام شروع ہوا، اور بالآخر اُسے خود حکومت نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ایسی صورتوں میں آغاز کی ابتری، انجام کی درستی کے پیشِ نظر قابلِ معافی سمجھی جاتی ہے۔

اگر حاکم ذاتی دشمنی کی بنا پر لوگوں کو فضول اور بغیر کسی وجہ کے قتل کرنا شروع کر دے تو اُسے پسند نہیں کیا جاتا، گو یہ عادت ایک شاہانہ فعل ہے اور اہلِ مشرق اپنے حاکموں کو تمام شاہانہ اوصاف سے مزیّن دیکھنا چاہتے ہیں۔ یحیٰی برمکی کے دونوں بیٹوں جعفر برمکی اور فضل برمکی کے قتل سے عوام میں ضرور دہشت اور ہمدردی پھیل گئی تھی، لیکن اس کی وجہ مقتولوں کی بے گناہی اور شرافت تھی۔ ذرا غور کیجئے کہ سرکاری حسابات کے رجسٹر میں صبح کا اندراج تو یہ ہے کہ جعفر برمکی کو خلعت عطا کرنے کے لئے ایک لاکھ دینار خرچ ہوئے، اور اُسی روز شام کا اندراج یہ ہے کہ جعفر برمکی کی نعش جلانے کے لئے پانچ آنے کا تیل خرچ آیا۔ باوجود اس کے اہلِ مشرق ہارون رشید کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اُس کا نام ظالم بادشاہوں کی فہرست میں ہرگز شمار نہیں کرتے۔

قتلِ عام حکومت کی بدنظمی کا نتیجہ ہوتا ہے

ہندوستانی سیاست دان گو ان خداترسوں کا مذاق اڑاتے تھے لیکن جلد ہی وہ اُن کو اپنی غرض کے لئے استعمال کرنے لگے۔ تجربہ سے ثابت ہوا کہ حکومت چاہے کسی بنا پر سختی کرے، اِس سختی کو بے وجہ قتلِ عام، ظالمانہ سزائے موت، یا بے رحمانہ ایذا رسانی ثابت کیا

جا سکتا ہے۔ یوں حکومت کی انتظامی طاقت مفلوج کی جا سکتی ہے۔ اس سے بدامنی پھیلے گی، اور آخر کار خون کی ندیاں بہیں گی۔

جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے کہیں یہ نتیجہ نہ اخذ کیجئے کہ میں خونریزی یا قتلِ عام کا حامی ہوں، بلکہ مجھے خدا ترسوں اور جذبات پرستوں کے طریقِ کار پر بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس سے بالآخر خونریزی اور قتلِ عام کی نوبت آجاتی ہے۔ مشرقی حکومتوں کے نظام میں قتلِ عام کی مستقل حیثیت کے وجوہات کا جو تجزیہ اوپر کیا گیا ہے اُس کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اِن سب وجوہات کی تہ میں بنیادی وجہ یہی ہے کہ مشرقی حکومتوں کا نظم ونسق کمزور ہوتا ہے۔ جہاں مناسب قوانین سختی اور انصاف سے نافذ کئے جائیں، جہاں حکومت کی طاقت استعمال کرنے کو مستعد عہدیدار اور وفادار فوجیں موجود ہوں، اور جہاں حکومت کے تذبذب یا غفلت کا امکان نہ ہو، وہاں قتلِ عام کی نوبت ہی نہیں آتی۔ برعکس اس کے جو مشرقی حکمران بغاوت کی تبلیغ کرنے والوں کو گرفتار کرنے سے ہچکچاتا ہے یا بلوائی ہجوم کو بروقت منتشر نہیں کرتا، اُسے جلد ہی سماج کا نظام برقرار رکھنے کے لئے خطرناک جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ سوال یہ نہیں رہتا کہ قتلِ عام ہونا چاہئے یا نہیں سوال یہ ہوتا ہے کہ تم قاتل بننا چاہتے ہو یا مقتول؟

مشرقی فسادات

میں نے کئی فسادات سختی سے ختم ہوتے دیکھے ہیں، لیکن میں نے آج تک ایسا فساد نہیں دیکھا جو بروقت مناسب اقدامات سے روکا نہیں جا سکتا تھا ہندوستان سے محبت رکھنے والوں کو یہ دیکھ کر غصہ آجاتا ہے کہ مکار شرارت پھیلانے والے اپنا کام شروع کرتے ہیں تو کوئی دخل نہیں دیتا۔ باغیوں کے عقائد کا کھلے بندوں پرچار ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ رعایا کو آزادیٔ رائے اور آزادیٔ تقریر کے حقوق حاصل ہیں۔ بدامنی کی ابتدا ہوتی ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک عارضی شورش ہے۔ لوگوں کا غصہ نکل جانے دو، خود ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگلے روز چاروں جانب طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ ایک ہجوم بازار لوٹ رہا ہے۔ دوسرا ہجوم مسجدوں میں سؤر ذبح کر رہا ہے۔ تیسرا ہجوم مندروں میں گائے حلال کر رہا ہے۔ شہر کی عمارات سے آگ کے شعلے بلند ہیں۔ اِکّے دُکّے فرنگی جان بچانے کو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے ہیں۔ جو پیچھے رہ جائے ڈنڈے مار مار کر اُس کا بھیجا نکال دیا جاتا ہے۔ عورتیں نیم مردہ کر کے سڑکوں پر چھوڑی جا رہی ہیں۔ وفادار ہندوستانی افسروں کا گھر بار لوٹ لیا جاتا ہے، اور انہیں طرح طرح کی ایذائیں دے کر موت کے گھاٹ اتارا جاتا

ہے۔تب شہر فوج کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ سڑکوں پر مورچے لگ جاتے ہیں۔ سپاہی پہلے تو اپنے ہم قوموں پر گولی چلانے میں توقف کرتے ہیں، پھر گرم ہو کر اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ ہر طرف خونریزی ہوتی ہے۔ عوام کو احساس ہوتا ہے کہ سرکار مر نہیں گئی، ابھی زندہ ہے۔ تمام بدامنی یوں ختم ہو جاتی ہے گویا جادو ہو گیا۔ چاروں جانب تباہ شدہ عمارتیں کھڑی دکھائی دیتی ہیں، یا مرنے والوں کی بکھری ہوئی نعشیں۔ ہر طرف مسکراتے ہوئے چہرے نظر آنے لگتے ہیں۔ ہجوم جھک جھک کر تپاک سے سلام کرتا ہے۔ وہی شرارت پھیلانے والے آگے بڑھ کر انعامات بھی حاصل کرتے ہیں، اور عزت بھی پاتے ہیں۔ انگلستان میں شور مچ جاتا ہے کہ اِن ظالم فوجی اور دیوانی افسروں کو دار پر کھینچنا چاہیئے۔

یہ طریقِ حکومت بیچارے غیر مہذب اہلِ مشرق کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ مجھے بھی یہ کچھ ایسا پسند نہیں۔ جو حکومت برقرار رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً قتلِ عام کی حاجت ہو، اُس میں اور طوائف الملوکی میں فرق ہی کیا ہوا۔ اگر ہندوستان میں طوائف الملوکی ہی رکھنی ہے تو اِس کے لئے اتنا خرچ کر کے ایک اجنبی قوم کو ملک میں لانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہندوستان کے باشندے اپنی سودیشی کوششوں

سے دنیا بھر کے لئے کافی طوائف الملوکی برپا کر سکتے ہیں۔

پونگ پورہ کا رشی

کچھ سال گزرے ایک نیا سبق آموز واقعہ پیش آیا تھا۔ ایک علاقہ تھا، جس کا نام فرض کر لیجئے پونگ پورہ۔ بیچارے پونگ دراوڑ نسل کے سیدھے سادے لوگ تھے، جنہوں نے حال ہی میں جنگلوں کی زندگی ترک کر کے زراعت اختیار کی تھی۔ وہ شراب کے عادی تھے۔ وہ جاہلِ مطلق تھے، اور زراعت بھی اچھی طرح نہ کر سکتے تھے۔ اِن کے زمیندار بدمعاش راجپوت تھے، جو اُن کے ساتھ سخت ظلم اور تکبّر کا برتاؤ کرتے تھے۔ پونگ پورہ براہِ راست انگریزوں کے ماتحت نہ تھا، بلکہ انگریزوں کو وہاں صرف سیاسی اثر حاصل تھا۔ غرض حکومتِ ہند زمیندار اور مزارع کے باہمی تعلقات کے لئے ذمہ وار نہ تھی۔ پونگ قوم کا ایک حصّہ ساتھ کے برطانوی علاقہ میں آباد تھا۔

یکایک ایک رشی رونما ہوگیا۔ اُس نے پونگ قوم کو احکامِ فطرت کی تعمیل کا سبق دینا شروع کیا۔ اُس نے اُن سے شراب ترک کروا دی، اور شہوت رانی کی رسوم پر بھی پابندیاں عائد کر دیں۔ اُس نے اپنے سب چیلوں سے حلفِ وفاداری اُٹھوایا اور ہر ایک کو اُس کے مقامِ معرفت

کے مطابق درجوں میں تقسیم کر دیا۔ جو لوگ درجۂ اول میں تھے اُنہیں عقائد کی تعلیم زیادہ وضاحت سے دی جاتی تھی۔ نچلے درجہ والوں پر یہی لازم تھا کہ چپ چاپ اس نئے مہدی کی اطاعت کریں۔ درجۂ اوّل والوں کو دنیا کی حکومت اور آخرت میں ہمیشہ رہنے والی جنّت کی بشارت دی جاتی تھی۔ اب لوگوں نے زمینداروں کو مالیانہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ بیگار اور چٹّی ادا کرنے میں بھی عار محسوس کرنے لگے۔ زمینداروں اور اُن کے خاندان کے لوگوں نے تشدّد کیا۔ اس کا جواب بھی تشدّد سے دیا گیا، اور زمینداروں کو شہر بھگا دیا گیا۔ ریاست کے راجہ نے حکومتِ ہند کے پاس فریاد کی۔ حکومتِ ہند نے اپنے ایک اعلیٰ افسر کو گفت و شنید کے لئے روانہ کر دیا۔ جب یہ افسر موقعہ پر پہنچا تو سادھو مہاراج فوجِ کثیر کے ساتھ ایک ٹیلہ پر مقیم تھے۔ اُنہوں نے اعلان کر رکھا تھا کہ اس ٹیلہ سے نئی "صبحِ بادشاہی" کا آغاز ہو گا۔ لوگوں نے افسر کی بات سننے سے انکار کر دیا، اور اُس کا تعاقب کر کے اُسے ایک قلعہ میں محصور کر دیا۔ حکومتِ ہند نے ضرورت کے مطابق معقول فوج بھیجی جو سادھو کے ٹیلہ کے قریب پہنچ گئی۔ پونگ قوم کی اکثریت اب خوفزدہ ہو کر بھاگنے پر آمادہ تھی۔ یکایک انگریزی افواج پھر پیچھے ہٹ گئیں۔ فوج

کے کمانڈر کو بذریعۂ تار حکم پہنچا تھا کہ مزید گفت و شنید سے تصفیہ کی راہ نکالی جائے۔ اس اقدام سے پونگ قوم کو اپنے سردار کے خدائی دعووں کا یقین ہو گیا۔ کیا اُس نے بغیر ایک قطرہ خون بہائے، محض اپنی روحانی قوت سے، سرکاری افواج کو پیچھے نہ ہٹا دیا تھا؛ صلح کی گفت و شنید کا تمسخر اڑایا گیا، اور آس پاس کے تمام علاقوں سے پونگ قوم مسلح ہو کر جمع ہونے لگی۔ ہر طرف سے سادھو کے جھنڈے تلے فوجیں جمع ہو گئیں۔ قریب تھا کہ چار اضلاع میں بغاوت پھوٹ پڑے۔ تب دوسرے دن فوجوں کو بڑھنے کا حکم دیا گیا۔ پونگ افواج کے پاس سوائے تلوار، نیزے، اور تیر کمان کے اور کوئی ہتھیار نہ تھا۔ لیکن اب اُنہیں اپنی فتح کا یقین تھا۔ نہ تو اُنہوں نے راہِ فرار اختیار کی، نہ اطاعت قبول کی۔ ٹیلہ پر پہنچنا ناممکن تھا کیونکہ یہاں سادھو کی فوجیں پرے جمائے کھڑی تھیں۔ غرض جب سپاہیوں نے یلغار کی تو بے اندازہ خونریزی ہوئی۔

مجھے جو بھی ہندوستانی ملتا، وہ یہی کہتا کہ حکومت نے لوگوں کے دلوں میں خوف بٹھانے کو جان بوجھ کر قتلِ عام تک نوبت پہنچائی۔ سب یہی کہتے تھے کہ گورنمنٹ ریاکارانہ پالیسی پر عمل کر رہی ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ پہلی مرتبہ فوج اِس لئے واپس بلا لی گئی تھی کہ باغیوں کے حوصلے

بلند ہو جائیں، وہ زیادہ سختی سے مقابلہ کریں، اور ٹیلہ پر اُن کی زیادہ تعداد جمع ہو جائے، تاکہ جب سانپ اپنی بانبی سے منہ نکالے تو اُس کا سر ہی کچل دیا جائے۔ میں اُنہیں بار بار سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ حکومت کا طرزِ عمل بظاہر بزدلانہ تھا بھی، تو در حقیقت ظالمانہ نہ تھا، بلکہ حکومت تو رحمدلی کا سلوک کرنا چاہتی تھی۔ لیکن لوگ ہرگز میری بات کا یقین نہیں کرتے تھے۔ وہ آدابِ مجلس کا لحاظ رکھتے ہوئے بظاہر میری بات مان لیتے تھے، اور پھر گفتگو کا موضوع بدل دیتے تھے۔

خدا ترسوں کی خود غرضی

انگلستان میں اِس پارٹی نے جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے، ہندوستان میں اِس کا ایک اور بُرا نتیجہ نکلتا ہے۔ ہمدردیٔ انسان کے دعویدار جنگ کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اُن کا خیال ہے کہ فوج پر رقم خرچ کرنا شیطانی فعل ہے۔ ہمدردیٔ انسان کے یہ دعویدار اکثر مالدار تاجر ہوتے ہیں۔ انگلستان اور انگلستان کی تجارت کی حفاظت کے لئے بحری اقتدار لازمی ہے۔ اس کے بغیر منڈیوں تک رسائی ممکن نہیں۔ آجکل دنیا کی جو صورتِ حال ہے، اُس کے پیشِ نظر بحری اقتدار اور منڈیوں تک رسائی، فوجی طاقت کے بغیر حاصل کرنا، یا

برقرار رکھنا، ممکن نہیں۔ گذشتہ دو صدیوں سے اکثر انہیں مقاصد کی خاطر جنگ کی نوبت آتی رہی۔ دوسری قومیں تصور کرنے لگتی تھیں کہ سمندر پار کے علاقوں سے برطانوی تجارت کو بے دخل کر کے وہ خود اُس دولت پہ قبضہ کر سکیں گی جو آجکل انگلستان یہاں سے سمیٹ رہا ہے۔ اس طرح سے ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہمدردیٔ انسان کے اِن دعویداروں کے مادی مفاد کسی بیرونی دشمن کے باعث خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ تب یہ لوگ حکومت کو مداخلت پر مجبور کرتے ہیں، یا ایسا ہوتا ہے کہ کوئی خارجی حکومت اپنی رعایا کے قتلِ عام کی مرتکب ہوتی ہے۔ اس پر خداترسوں کی انسانی ہمدردی کا جذبہ جوش میں آجاتا ہے۔ وہ اپنی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ظالم حکومت کو دھمکایا جائے اور اُسے ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ وہ حکومت کو نیکی کے راستہ پر چلنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ حکومت اعلانِ جنگ تو نہیں کرتی، لیکن ظالم حکومت کو دھمکی دی جاتی ہے کہ وہ اگر اپنی حرکتوں سے باز نہ رہی تو اُس کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ ایسے مواقع پر افواج کو چھاؤنیوں میں حاضری کا حکم دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

بغیر طاقت کے دھمکی کارگر نہیں ہوتی

ایسی دھمکیاں اکثر کھوکھلی ہوتی ہیں، کیونکہ برطانیہ کی شاہی فوجوں کی تعداد اتنی ناکافی ہے کہ اُن کے ذریعہ ظالم حکومت کو انگلستان کی بات ماننے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ باوجود اس کے اکثر دھمکی ہی سے کام چل جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسری حکومت دھمکی سے مرعوب نہیں ہوتی۔ تب انگلستان مداخلت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے ایک اوسط انگریز کو انگلستان کی خارجی حکمتِ عملی کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ پھر بھی بسا اوقات ایسے ناگوار واقعات پیش آجاتے ہیں کہ بڑے سے بڑے بے حیا کو بھی شرم آ ہی جاتی ہے۔ ایسے واقعات پہلے اور دوسرے ریفارم بل کی منظوری کے درمیانی وقفہ میں اکثر پیش آتے رہے۔ حال ہی میں جو اِس قسم کے واقعات پیش آچکے ہیں، اُن کا ذکر خلافِ مصلحت ہو گا۔

اہلِ مشرق کھوکھلی دھمکی کا پتہ چلا لینے میں خوب ماہر ہیں۔ خود اُن کے ہاں ایسے لمبے لمبے القابات کا خاصہ رواج ہے جن کے پیچھے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ اُنھوں نے ایسے بہت سے "شاہِ شاہان" دیکھے ہیں جن کا راج دہلی سے لے کر پالم کے قصبہ تک

محدود ہوتا تھا۔

اہلِ مشرق بزدلوں کو حاکم نہیں مانتے

اہلِ مشرق کسی بزدل کو حاکم نہیں مانتے۔ نہ ہی کسی بزدل کو وہ محض اس وجہ سے دلیر ماننے پر تیار ہوتے ہیں کہ وہ اپنی بزدلی کو آمادۂ پیکار ہونے کی گفتگو سے چھپانا چاہتا ہے، یا اپنی کمزوری پر خون آشامی کی مذمّت کر کے پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ اہلِ مشرق سے اگر کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو یہ کہ وہ بھی وہیں دھوکہ کھا جاتے ہیں جہاں کئی دوسری قومیں فریب کھا چکی ہیں۔ آج تک انگلستان کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ ایک حد سے آگے اُس نے کبھی رعایت روا نہیں رکھی۔ اگر کوئی فریق انگلستان کی قوّتِ برداشت پر بہت زیادہ بوجھ ڈالے تو ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب انگلستان سچ مچ لڑائی شروع کر دیتا ہے۔

غرض یہ خدا ترس لوگ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو حکومت کو پریشان کیا جائے۔ وہ انگلستان کے عوام میں تبلیغ کرتے ہیں کہ جنگ ایک شیطانی فعل ہے۔ فوج کی بے رحمی کے واقعات سنائے جاتے ہیں۔ کشت و خون کے ہولناک مناظر کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ جنگ سے تجارت میں پیدا ہونے والے

خلل کی تفصیلات گنوائی جاتی ہیں۔ عوام کو محنت پر مجبور کر کے اُن کے گاڑھے پسینہ کی کمائی ضائع کی جانے کا نقشہ کھینچا جاتا ہے۔

بے بنیاد صلح پر جنگ کو ترجیح حاصل ہے!

اِس کے ساتھ ساتھ چاہے دیرپا نتائج کی توقع نہ ہو، یہ خدا ترس فرقہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ قبل از وقت ہی صلح کر لی جائے۔ اگر ممکن ہو تو اُن کی یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ جس دشمن نے میدانِ جنگ میں شکست پائی ہے، اُسے صلح کے موقعہ پر وہی اقتدار حاصل ہو جائے جو جنگ سے پہلے میسر تھا۔ ہو سکے تو اُسے یہ موقعہ ملنا چاہیئے کہ انگلستان کے اتحادیوں اور دوستوں سے بفراغت اپنا انتقام لے سکے۔

اسی وجہ سے سیاسی ذہن رکھنے والے ہندوستانی سمجھتے ہیں کہ اگر ملک میں عام بغاوت پیدا کر دی جائے تو عین ممکن ہے کہ انگریز خود ہی ملک چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ اُنہیں یہ بھی خیال ہے کہ اگر انگریزوں نے مقابلہ ہی کیا تو جنگ کو ایسی صورت دینا ممکن ہوگا جس سے خدا ترسوں کو مداخلت کا موقعہ مل جائے۔

مشرقی مدبرین کی ذہنیت اکثر طفلانہ ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ قاعدے کُلیئے ہمیشہ خاص حالات پر منطبق نہیں ہو سکا کرتے۔

حکومتِ انگلستان کے ساتھ لڑائی مول لیتے وقت یہ امر خاص طور پر مدِ نظر رکھنا چاہیئے کہ انگلستان کبھی خاص حالات میں قاعدۂ کُلّیہ کے عام اصولوں کے اندر جکڑے رہنے کا قائل نہیں ہوا۔ منطق کی پابندی حکومتِ انگلستان نے کبھی قبول نہیں کی۔ مشرقی مدبّرین یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ شوکت کی ہوس تو سب کو ہوتی ہے۔ ہاں جب شان و شوکت کے حصول کے لئے محنت اور جد و جہد کی نوبت آئے تو کئی لوگ جی ہار کر میدان سے بھاگ جاتے ہیں۔ جس اکھاڑے میں جان ہلکان ہونے کا خدشہ نہ ہو وہاں ہمیشہ اپنی ہمت کے جوہر دکھانے والوں کا ہجوم ہو جایا کرتا ہے۔

تخریب پسندوں کی عالمگیر سازش؟

بعض لوگوں کو وہم ہے کہ اس قسم کے واقعات اس لئے پیش آتے رہتے ہیں کہ دنیا میں تخریب پسندوں کی کوئی باقاعدہ جماعت کام کر رہی ہے۔ محققین کا اندازہ ہے کہ جس نظام کو آسانیٔ بیان کے لئے "تہذیبِ مغرب" کا نام دیا جاتا ہے اُس کو تباہ و برباد کرنے کے لئے ایک منظّم جماعت کوشش کر رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہی منظّم جماعت درپردہ وہ پالیسی وضع کرتی ہے جس کو عملی جامہ پہنانے کے تخریب پسند عناصر سرگرمِ عمل ہیں۔ یہ جماعت ہی

تخریب پسندوں کے لئے منصوبے اور چالیں تصنیف کرتی ہے۔ یہی جماعت تخریب پسندوں کے لیڈر منتخب کرتی ہے، اور یہ جماعت ہی تخریبی مبلّغین کو تنخواہ دیتی ہے، یا کسی اور طریقہ سے اُن کو تخریب پر اُکساتی ہے۔ گذشتہ پانچ پشتوں سے تخریب پسندی کی تحریک کو جو فروغ حاصل ہو رہا ہے، اُس کی تہ میں ضرور ایسی کوششیں کام کر رہی ہیں۔ اِن کوششوں میں ایسا ضبط و نظم پایا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ محض اتفاقی حادثات کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔

اس جماعت کی حقیقت کیا ہے، یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ اُس خفیہ انجمن کی کارستانی ہے جو ۱۷۷۶ء میں قائم ہوئی تھی، اور جو اِلّومیناتی کے نام سے مشہور ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اِن کارروائیوں کی تہ میں فری میسن کے اراکین کا ہاتھ ہے۔ کچھ اور لوگوں کا دعویٰ ہے کہ اِس غارت گری کا سرچشمہ یہودی ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس قسم کی جماعت کے وجود کا ابھی کوئی واضح ثبوت ہمارے سامنے نہیں۔ بعض عقلی وجوہات کی بنا پر میں ایسی جماعت کا وجود مشکوک سمجھتا ہوں۔

جہاں تک اِلّومیناتی کا تعلق ہے، اگر اِس انجمن کی کبھی واقعی کوئی اہمیت تھی تو وہ اُس وقت ختم ہو گئی جب اِس انجمن نے

فری میسن سے الحاق کر لیا۔ اس فرقہ کا بانی ۱۸۳۰ء تک زندہ تھا اُس کی زندگی کے آخری چالیس سال بالکل گمنامی میں گزرے۔ کامیاب نبیوں کا انجام ایسا مجہول نہیں ہوا کرتا۔ شیطان بھی اپنے خادموں کو اس طرح بے سہارا نہیں چھوڑتا۔

فری میسن کی تاریخ

اس میں شک نہیں کہ فری میسن کے بعض فرقے تخریبی عقائد کے حامل رہے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ فری میسن کے بعض حلقوں میں شیطان کی پرستش ہوتی رہی ہے لیکن فری میسن کے خلاف زیادہ تر شکوک اس لئے پیدا ہوئے کہ فری میسن کیتھولک فرقہ کے مخالف تھے بحیثیت پوپ کے پائس نہم کا تقرر فری میسن کے بعض حلقوں کی کوشش سے ہوا تھا لیکن پوپ مقرر ہو جانے کے بعد وہ اپنے پرانے ساتھیوں کے زیر اثر نہ رہنا چاہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اُس کے پرانے ساتھیوں کی پالیسی کلیسا سے متصادم تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس پوپ نے اپنے معتقدین کو فری میسن کی رکنیت اختیار کرنے سے منع کر دیا۔ یوں تو فری میسن کی پالیسی شروع سے ہی دنیا پرستی کی جانب مائل تھی لیکن کیتھولک ممبروں کے نکل جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جماعت سراسر دنیا پرست بن گئی۔ یہی وجہ تھی کہ فری میسن کیتھولک فرقہ کی مخالفت کرتی تھی۔

بدقسمتی سے فری میسن کی بہت سی روایات حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر بیت المقدس سے وابستہ تھیں۔ ان روایات کے باعث وہمی مزاج کیتھولک فرقہ کے پیروؤں کو شک ہو گیا کہ

فری میسن شاید یہودیوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ علاوہ ازیں یہودیوں کے متعلق جو عجیب و غریب اور جھوٹے قصّے پہلے سے مشہور تھے، وہ اب فری میسن سے منسوب کئے جانے لگے۔

فری میسن کچھ تو اپنے آپ کو نہایت پرانی تحریک ثابت کرنے کے شوق میں، کچھ پوپ کے جاسوسوں کو مغالطہ میں ڈالنے کے خیال سے، اور کچھ اپنے گرد ایک بھول بھلیاں پیدا کر لینے کی جستجو میں اِن افواہوں کی تردید نہ کرتے تھے۔ گو یہ قرینِ قیاس ہے کہ فری میسن اور اُن سے ملتی جُلتی بعض دوسری انجمنیں کیتھولک فرقہ کی مخالف تھیں، دنیا پرست بھی تھیں، اور شاید مذہب کا مذاق اڑاتے ہوئے بعض مُشرکانہ حرکات کی بھی مرتکب ہوتی تھیں، لیکن بعض کیتھولک مصنفین کی یہ ثابت کرنے کی کوشش بالکل غلط ہے کہ فری میسن کی بنیاد سکاٹ لینڈ کے شیطان پرستوں کے اعتقادات پر اُستوار ہوئی۔ نہ ہی اُن کا یہ بیان صحیح ہے کہ فری میسن کا مقصد ہی تہذیبِ مغرب کی تباہی ہے۔ اگر کوئی شخص کیتھولک فرقہ کا مخالف، اور دنیا پرست ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ یورپ کا تمدّن برباد کرنے کے درپے ہے۔ یورپ کا تمدّن بغیر کسی دین کے سہارے بھی زندہ رہ سکتا ہے، اگر تمدّن کے قیام کے لئے کسی خدائی فوجدار کا وجود

ایسا ہی لازمی ہے، تو یہ ضرورت اپالو دیوتا، متھرا دیوی، کسی عیسائی فرقہ کے معبود، یا کسی فرشتۂ عذاب کے تصور سے بھی پوری کی جا سکتی ہے۔ یوروپ کی تہذیب کے مبادیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بھی موجود تھے، اور غالباً عیسائیت کا نام ونشان مٹ جانے کے بعد بھی یوروپ کی تہذیب بدستور قائم رہے گی۔

کیا شرارت کی جڑ یہودی ہیں؟

ہاں یہودیوں کو ساری جڑ قرار دینے کے لئے زیادہ معقول دلائل موجود ہیں۔ تخریب کے اکثر حامی یہودی گذرے ہیں۔ تاہم اس امر کی کوئی فیصلہ کن شہادت نہیں کہ غارت گری کی تمام قوتوں کی راہنمائی کوئی ایسی جماعت کر رہی ہے جس میں صرف یہودی شامل ہوں۔ "دانشورانِ یہود کے میثاق" کے نام سے جو کتاب چھپی ممکن ہے اُس کی شائع کرنے والے نیک نیتی سے اُس کی صحت کے قائل ہوں۔ لیکن یہ کتاب دراصل بعض ایسی جعل سازیوں پر مبنی ہے جو جان بوجھ کر گھڑی گئی تھیں۔ اس بات کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ یہودی نسل جس نے گذشتہ صدی میں ہر طرح تہذیبِ مغرب سے فائدہ اُٹھایا ہے، اب اس تہذیب کو تباہ کرنے کے درپے ہو۔

اگر کئی داعیانِ تخریب یہودی تھے، تو اس میں کچھ تعجب کی بات نہیں۔ مظلوم بغاوت پر آمادہ ہو جائیں تو اِس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ اگر معلحوں کی بغاوت کامیاب ہو جائے، اور وہ ظالموں سے انتقام پر مائل ہوں تو اس پہ متعجّب نہ ہونا چاہیئے۔ یہودی محروم ہیں۔ وہ بحیثیتِ مجموعی غریب ہیں۔ ہماری معاشرت کا موجودہ نظام اپنے دوسرے باشندوں کو ترقّی کے جو مواقع دیتا ہے، اُن سے اِس ذہین نسل کو محروم رکھتا ہے۔ ہاں جو یہودی مالدار یا بارسوخ ہیں، اُنہیں عام حقوق سے محروم نہیں رکھّا جاتا۔

معاشرت کے جس نظام میں کثیر باشندوں کو محروم رکھّا جائے اُس کے وجود کے لئے ایسے پسماندہ لوگ خطرناک ثابت ہوا کرتے ہیں۔ اگر محروم طبقہ میں ہزارہا اشخاص ایسے موجود ہیں جنہیں اپنی غیر معمولی قابلیّت کا احساس ہے، لیکن اِن قابلیتوں کو کسی سودمند طریقہ سے استعمال کرنے کا موقعہ نہیں ملتا، تو یہ خطرہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ ہر اونچی ذات والے بغیر کسی خوف کے نیچ ذاتوں سے اُن کے گھر، اُن کی زمینیں، اُن کا روزی کمانے کا حق، اور ہتھیار استعمال کرنے کا اختیار ــــ چھین سکتے ہیں۔ ہم صدیوں سے ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ نیچ ذاتیں اب اس سلوک سے بُرا نہیں مناتیں۔

اللہ کی مرضی یہی ہے کہ ہمیں سب کچھ میسّر ہو، لیکن اُنہیں کچھ نہ ملے۔ دیوتا نیچ ذاتوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر نیچ ذاتوں نے بغاوت کی تو ہم اُن کو آئندہ بھی اُسی طرح کچل دیں گے، جس طرح پہلے کچل دیتے رہے ہیں۔ دو ٹانگوں والا جانور، جس سے دیوتا نفرت کرتے ہیں، اونچی ذات والوں کی دولت، علم، اور اتحاد کے مقابلہ میں کس طرح جیت سکتا ہے۔ ہاں اگر نیچ ذاتوں میں بھی کچھ ذہین لوگ پیدا ہو گئے (چاہے تو اونچی ذات والوں میں سے کچھ ذہین لوگ جنہیں اونچی ذات میں سے نکال دیا گیا ہو، نیچ ذاتوں میں جا ملیں، اور چاہے نیچ ذات والوں میں خود بخود کچھ ذہین لوگ پیدا ہو جائیں) تو کیا اِس صورت میں ایک مہلک خطرہ نہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اگر یہ سلسلہ پھر اسی طرح جاری رہا حتیٰ کہ نیچ ذات والوں کو بھی ایسے لیڈر میسّر آ گئے جن کی ذہانت ہمارے مقابلہ میں کم نہ ہوئی، تو اس صورت میں یہ دیکھتے ہوئے کہ نیچ ذات والوں کی تعداد پہلے ہی ہمارے مقابلہ میں ایک اور دس کے تناسب سے زیادہ ہے، کیا گھی اور دودھ کے مالکوں اور بستی کے اَن داتاؤں کا اقتدار خطرہ میں نہ پڑھ جائے گا۔

یہودی غیر یہودیوں کو حقیر سمجھتے ہیں

میری رائے میں مذکورہ بالا اسباب ہی کا نتیجہ ہے کہ یہودی ہر انقلاب میں حصّہ لیتا ہے۔ یہ فرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ تہذیبِ مغرب کے خلاف یہودیوں نے کوئی عام سازش کھڑی کر رکھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بنی سام کی تہذیب بھی مغربی یورپ کے تمدّن سے کچھ ایسی مختلف نہیں۔ یہ درست ہے کہ بنی سام کے ہاں "ربّ" کا تصور کچھ مختلف ہے۔ اور عورتوں کے رتبہ کے متعلق بھی اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ شاید اہلِ مشرق کے ہاں خواتین کو کسی حد تک کم رتبہ سمجھا جاتا ہے۔ پھر بھی بنی سام کے تمدّن اور تہذیبِ مغرب میں کچھ ایسا فرق نہیں جیسا کہ منگل نسل اور مغرب کے تمدّن میں فرق ہے، یا ابتدائی سقلاب تہذیب اور مغرب کے تمدّن میں فرق تھا۔ ہماری تہذیب و تمدّن کا اکثر ساز و سامان بالواسطہ یا بلاواسطہ بنی سام سے مستعار لیا گیا ہے۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہودی اگرچہ ہمارے تمدّن سے فائدہ حاصل کر لیتے ہیں لیکن اِس تمدّن کے متعلق اُن کی رائے اچھی نہیں۔ یہودیوں کی یہ روش کچھ زیادہ عجیب نہیں۔ انہوں نے بہت سے تمدّنوں کا عروج و زوال دیکھا ہے۔ وہ اِن سب تمدّنوں سے فائدہ حاصل کرتے رہے ہیں۔

جوں جوں ہر ایک تمدّن زوال پذیر ہوتا گیا، توں توں اس تمدّن میں یہودی کا رسوخ بڑھتا گیا۔ جیسا کسی تمدّن میں یہودی کا رسوخ بڑھا، اُتنا ہی اُس نے اِس تمدّن سے فائدہ بھی حاصل کیا۔ یہودی نے بہت غنچے کھل کر پھول بنتے اور پھر مُرجھاتے دیکھے ہیں۔ اُس نے بابل کے تمدّن کا عروج و زوال دیکھا ہے۔ اُس نے ایران کے تمدّن کا عروج و زوال دیکھا ہے۔ اُس نے مصر میں بطلیموسیوں کے تمدّن کا عروج و زوال دیکھا ہے۔ اُس نے رومیوں کے تمدّن کا عروج و زوال دیکھا ہے۔ اُس نے بغداد اور قرطبہ کے خلیفوں کے تمدّن کا عروج و زوال دیکھا ہے۔ یہودی ہر جگہ موجود رہا ہے، اور ہمیشہ اپنے آپ کو زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ڈھالتا رہا ہے۔ بالعموم یہودی کو ہر نظام حکومت میں زبردست اثر حاصل رہا ہے۔ یہودی کسی نہ کسی طرح ہمیشہ اصحاب اقتدار میں سے اپنے لئے مددگار اور مربّی تلاش کر لیتا رہا ہے۔ اِن مددگاروں اور مربیّوں کی امداد سے خود بھی نفع حاصل کرتا رہا ہے اور اپنے دوستوں کو بھی نفع پہنچاتا رہا ہے لیکن یہودی نے کبھی بھی اپنے آپ کو رائج الوقت تہذیب سے اس طرح وابستہ نہیں کیا کہ اُس تہذیب کے زوال کے ساتھ ہی یہودی کو بھی زک اٹھانی پڑی ہو۔ جب یہ ہے یہودی کی داستان تو اُس کی نگاہوں میں آج انگلستان کے بادشاہ جارج کی وقعت ماضی

ہیں ایران کے بادشاہ بخت نصر سے زیادہ کیوں ہو۔

کفار نشۂ پندار میں ناپائدار سلطنتیں تعمیر کرتے رہتے ہیں، ان کی کارستانیاں جلد ہی ختم بھی ہو جاتی ہیں، لیکن صیہونیوں کی آسمانی بادشاہت تا قیامت پائندہ رہے گی۔

یہودی ابن الوقت ہیں

انسان ایک ایسے تمدن کا تصور کر سکتا ہے جہاں سوائے برج کے تاش کا اور کوئی کھیل نہ کھیلا جاتا ہو۔ ایسے تمدن میں حکم کے یکے کو تاش کے باقی تمام پتوں پر ایک مستقل ترجیح حاصل ہو گی۔ برعکس اس کے ایک ایسا تمدن بھی ہو سکتا ہے جہاں تاش کی سادی کھیلیں کھیلی جاتی ہوں۔ اس دوسرے تمدن میں حکم کے یکے کو کوئی مستقل ترجیح حاصل نہ ہو گی۔ اس دوسرے تمدن میں لوگ خوب آگاہ ہوں گے کہ بعض کھیلوں میں غلام اور بعض دوسرے کھیلوں میں رنگ کے بادشاہ کو زیادہ وقعت حاصل ہوتی ہے۔ باوجود اس علم کے یہ دوسرے تمدن والے بھی کبھی کبھی برج کھیلنے سے باز نہ رہیں گے۔ اور جب وہ برج کھیلیں گے تو حکم کے یکے کو وہی وقعت دیں گے، جو حکم کے اندھے مقلد مستقل طور پر حکم کے یکے سے منسوب کرتے ہیں۔ ہاں جب انہیں خیال آئے گا کہ ابھی چند لمحات پہلے پان کا یکہ سب پر

غالب تھا اور اُس وقت حکم کے یکّے کی وہی حیثیت تھی جو معزول شدہ بادشاہوں کی ہوا کرتی ہے تو وہ زیرِ لب ذرا مسکرا ضرور دیں گے غرض یہودی جس تمدّن کے اندر زندگی بسر کرتا ہے اُس کے اعتقادات کو بخوبی اپنا لیتا ہے ہاں اُس کا اعتقاد اتنا پختہ نہیں ہوتا کہ وہ خالی اعتقاد کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ ہو جائے جس طرح شجاع ترین اور وفادار ترین کرائے کے سپاہی زیادہ نقصان اٹھانے پر میدانِ جنگ سے بھاگ اُٹھتے ہیں، حالانکہ اُن کی جگہ قومی رضاکاروں کی کوئی فوج ماتھے پر بل لائے بغیر یہی نقصانات ہنسی خوشی برداشت کرتی، اسی طرح یہودی بھی شاذ و نادر ہی کسی ایسے نظامِ معاشرت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ ہوتا ہے جس کی روحانی حقانیت پر اُسے دلی یقین نہیں۔

بطور ایک سرمایہ دار کے بھی یہودی کچھ دے دلا کر مفاہمت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ بہتر ہے کہ تھوڑا خرچ کر کے بہت کچھ بچا لیا جائے۔ آخر محتاجوں کو اپنے خلاف زیادہ اشتعال دلانے کا کیا فائدہ ہے؟ میں سرمایہ دار ہونے کی وجہ سے محتاجوں کے مطالبات کا کچھ زیادہ ہمدرد نہیں، لیکن مجھے یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں اخوت کے متلاشی اغنیاء کے قتلِ عام پر ہی نہ تُل جائیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جب تک فرصت باقی ہے، اسی دوران میں محتاجوں سے کوئی مصالحت کر لی جائے؟ کچھ شک نہیں کہ یہ محتاج لوگ ذرا لالچی ثابت

ہوں گے، لیکن میرا تجربہ یہی ہے کہ ہر شخص کی کچھ نہ کچھ قیمت ہوتی ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ اگر میں نے اب چور کو کچھ دے دلا کر راضی نہ کر لیا تو کوتوال کو جو رشوت دینی پڑے گی اُس میں مجھے خسارا نہ رہیگا۔

علاوہ ازیں یہودی کی جبلّت دلّالی کی طرف مائل ہے۔ مدّت ہائے مدید سے مختلف پیشہ ور یہودی کو اپنے پیشہ ورانہ حلقوں میں شامل نہیں کرتے۔ یہودی کو اراضی کی ملکیّت حاصل کرنے کی اجازت نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ دلّالی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ پیشہ تخلیقی صفات سے عاری ہے، پھر بھی یہودی کے بین الاقوامی روابط اِس پیشہ میں اُس کے آڑے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہودی خود تو سیب نہیں اُگاتا، لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ "الف" کے پاس کئی من سیب ہیں، اور "ب" کو بھی اُتنے ہی من سیبوں کی ضرورت ہے، تو وہ "الف" سے "ب" کا تعارف کروا دیتا ہے، اور اپنی دلّالی کی رقم مزے سے جیب میں ڈال لیتا ہے۔

یہودی سیاسی دلّال ہے

یہ دلّالی صرف تجارت ہی تک محدود نہیں۔ اگر جولیس سیزر کسی تخت و تاج کا خریدار ہے، اور ملّتِ روما اپنے لئے کسی تاجدار کی متلاشی ہے، تو ذرا غور کیجئے کہ اِس سودے میں دلّالی کا نفع کتنا

عظیم الشان ہوگا۔

پرچون فروشی بھی یہودیوں کا آبائی پیشہ ہے، لیکن اس پیشہ میں یہودی کو شہری انجمنوں کے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط کی قیود کے باعث دقتیں پیش آتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اُسے ذرا ادنیٰ درجہ کی پرچون فروشی پہ اکتفا کرنی پڑتی تھی۔ مثال کے طور پر مستعملہ اشیاء کی خرید و فروخت، کسی دیوالئے کی دوکان کا سارا سامان خرید لینا اور پھر اُسے پرچون کر کے بیچنا بھی اچھا خاصہ سودا ہے۔ پھر کسی عظیم الشان سلطنت کو یوں ہی نیلام کی بولی پر چڑھانے کا موقعہ مل جائے تو کیا وارے نیارے رہیں گے۔

ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا ہے کہ سیاست میں یہودی کے اثر و رسوخ سے انگلستان میں تردّد پیدا ہونے لگا ہے۔ یہ تردّد بھی اُسی وقت سے شروع ہوا ہے جب سے یہودیوں نے خارجی سیاسیات اور بالخصوص برطانوی سلطنت کے معاملات میں دخل حاصل کر لیا ہے۔ انگریز ہمیشہ سے اپنی فراخدلی پر نازاں رہا ہے۔ یورپ کے برّاعظم میں یہود کُشی کے جو مظاہرے ہوتے رہے ہیں اُنہیں انگریز ہمیشہ کمینگی اور سفلا پن سمجھتے رہے ہیں۔ بلاشبہ انگریزوں کا یہ خیال درست بھی تھا۔ انگلستان میں یہودیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں

انگلستان کی کئی اہم صنعتوں پر یہودیوں کو جو قابو حاصل رہا ہے اُس کا کسی کو علم نہ تھا۔ انگلستان ایک ایسا ملک ہے جہاں سارا اقتدار دولتمندوں کے قبضہ میں نہیں، بلکہ تھوڑا بہت اقتدار ذہانت کے بل بوتے پر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہاں یہودیوں کے لئے بھی موقعہ ہے کہ وہ اس ملک میں ایک با اقتدار طبقہ بن جائیں۔ انگلستان کی دونوں بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں نے یہودیوں کو اپنا بے تکلف دوست بنایا، مشیر مقرر کیا، حتیٰ کہ بعض حالات میں دامادی میں بھی قبول کیا۔ برطانوی سلطنت کے کئی مدبّر، ادیب، وکیل، اور سائنسدان یہودی ہی تھے۔ اِس وقت مجھے کسی ایسے یہودی کا نام یاد نہیں آ رہا جو کوئی زبردست سپہ سالار یا امیرالبحر ثابت ہوا ہو، لیکن مجھے اس میں ذرّہ بھر شک نہیں کہ کئی یہودی افسروں نے دلیری اور وفاداری سے انگلستان کی خاطر اُسی طرح خون بہایا جس طرح وہ فرانس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی خاطر خون بہاتے رہے ہیں۔ مدّت ہائے مدید تک یہودیوں نے سیاسیات میں عملی حصّہ نہ لیا۔

اگرچہ قدیم وضع کے زاہدانہ مزاج رکھنے والے یہودیوں کو اِس کا افسوس ہے، لیکن گذشتہ چند سال سے یہودیوں نے اب

عملی سیاسیات میں حصّہ لینا شروع کر دیا ہے۔ اس معاملہ میں میرا
خیال ہے پرانے یہودیوں کی رائے صحیح تھی۔ جب سے یہودیوں
نے سیاسیات میں اقتدار حاصل کیا ہے، اُسی وقت سے اُن کے
خلاف ایک ردِّ عمل شروع ہو چکا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران
میں یہودیوں کے خلاف جو عجیب و غریب انکشافات ہوئے، اُن
سے ملک میں ایک مبہم بے چینی پھیل گئی۔ یہودی غرباء کی کثیر تعداد
نقلِ وطن کر کے انگلستان میں داخل ہوئی۔ یہ نو وارد انگلستان کے
مزدوروں کے مقابلہ میں زیادہ محنتی تھے۔ اُن کا معیارِ زیست
پست ہے۔ اسی وجہ سے وہ تنخواہ بھی کم طلب کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ
نکلا ہے کہ اِن غریب یہودی مزدوروں کی وجہ سے کئی پیشوں میں
مقامی مزدوروں کا مندا پڑنے لگا ہے۔ اِن واقعات سے کئی
برسرِ اقتدار اصحاب خطرہ محسوس کرنے لگے ہیں۔ کئی لوگوں کو شکایت
ہے کہ باہر سے آنے والے یہودی عصمت فروشی میں نمایاں حصّہ
لے رہے ہیں۔ اِن شکایات سے دیندار لوگ سخت نفرت محسوس
کرنے لگے ہیں۔ غرض انگلستان میں یہودیوں کے خلاف ایک مبہم جذبہ
عام پھیل چکا ہے جسے ٹھوس شکل دینے کے لئے فقط کسی موقعہ
کی کسر باقی ہے۔ انگلستان میں عرصہ سے جو مشترکہ وزارت برسرِ اقتدا

تھی اُس کی شکست کا بڑا سبب بھی یہی ہے کہ کئی لوگوں کو خدشہ پیدا ہو چکا تھا کہ مشترکہ وزارت میں یہودیوں کو نامناسب دخل حاصل ہے۔ غالباً یہ خدشہ صحیح نہ تھا۔ پھر بھی کئی لوگ محسوس کرتے تھے کہ یہودیوں کو ایسا دخل حاصل ہے، اور یہودی اپنے رسوخ سے کام لے کر وطن کے مفاد کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ خدشات بے بنیاد تھے، پھر بھی کئی لوگ فرض کئے بیٹھے تھے کہ انگریز قوم کی عزّت کے چیتھڑے اڑائے جا رہے ہیں۔ برطانیہ کے خالی خزانے کا سونا لوٹا جا رہا ہے۔ فرانس کے تنِ ناتواں سے خون کے آخری قطرے اس لئے سیاسی جوابازی کے داؤ پر لگائے جا رہے ہیں کہ بعض یہودی جواریوں کو سلطنتِ عثمانیہ کے زوال سے نفع کمانے کی توقع ہے۔ یہ مفروضات اس قدر عیاں طور پر احمقانہ ہیں کہ اِن کی تردید میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی انگلستان میں یہودیوں کے خلاف ایک عام بے چینی پائی جاتی تھی۔

قومی قیادت قوم پرستوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے

عوام کی بے چینی اگرچہ بظاہر بے بنیاد تھی، لیکن بالکل بے بنیاد بھی نہ تھی۔ اُس کی تہ میں بعض ایسے اسباب کام کر رہے تھے جو نہایت معقول تھے۔ عوام کی بے چینی کی تہ میں ہمیشہ معقول

وجوہات ہوا کرتی ہیں۔ اگر اصولی بات پوچھی جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ جب تک دنیا میں، غلط یا صحیح طور پر تمام کاروبار قومیت کے عقیدے پر چل رہے ہیں، تب تک یہ امر خلافِ مصلحت ہے کہ کسی قوم کے انصرامِ مملکت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دے دی جائے جو اگر کسی بیرونی قوم کے اراکین نہ بھی ہوں تو اپنی پیدائش، تربیت، اور میلانِ طبع کے لحاظ سے آفاقی ذہنیت رکھتے ہیں۔

یہ ہے وہ فضا، جس میں یہودی کو غلط طور پہ تخریب کا ملزم گردانا جا رہا ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ یہودی تخریب کا موجد ہے۔ نہ ہی یہ کہنا درست ہے کہ یہودی نے تخریب کا ہتھیار مغربی دنیا کو برباد کرنے کے لئے اختراع کیا ہے۔ مغربی دنیا اگرچہ یہودی کا اصلی ٹھکانا نہیں، لیکن وقت کاٹنے کو اچھا خاصہ نشیمن ہے، جہاں یہودی جیسا خانہ بدوش اپنا سر چھپا کر گذارہ کر سکتا ہے۔ یہودی ہرگز ایسے دلاویز مقام کو بغاوت کی آگ سے جھلسنے کا خواہشمند نہیں ہو سکتا۔

ہاں بہت سے یہودی تخریب پسند بھی ہیں، اور یہودی نسل کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ وہ تادمِ آخر دشمن کا مقابلہ کرنے کے

بجائے کٹھن وقت پڑنے پر دشمن سے مفاہمت پر آمادہ ہو جایا کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ فری میسن کے ماتحت قائم ہونے والی تنظیمات تخریبی کارروائیوں کی تربیت گاہ بن چکی ہیں، اور برّ اعظم یورپ پر فری میسن کے اکثر مبلّغ یہودی ہیں، تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ تخریبی عقائد سے یہودیوں کے ایک گروہ میں ہمدردی پیدا ہو جانا طبعی امر ہے، بالخصوص جن ممالک میں تخریبی فری میسن کو کچھ اقتدار حاصل ہے وہاں تو یہودیوں میں یہ ہمدردی اور بھی پھیل گئی ہے۔

گذشتہ تین پشتوں سے مزدوروں کی منظّم طاقت کو بھی تخریبی قوتوں ہی میں شمار کرنا چاہیئے۔ سوشلزم کی تبلیغ میں انفرادی طور پر کئی یہودیوں نے خاصہ حصّہ لیا ہے، لیکن یہ فرض کرنا کہ مزدوروں میں سوشلزم کسی چھوٹی سی خفیہ انجمن کی کوششوں کے طفیل پھیلا ہے، ایک مضحکہ خیز بات ہو گی۔ آج تک سوشلزم کو ایک ایسا بین الاقوامی کلیسا بنانے کی تمام کوششیں اکارت گئی ہیں، جس کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جن کو کسی خاص قوم سے وابستگی نہ ہو۔

زبوں حالی تخریب کی ماں ہے

نہیں! نہیں!! تخریب پسندی کی اصلی ماں زبوں حالی ہے۔ تخریب پسند جس پانی سے بپتسمہ پاتے ہیں وہ بے کس مزدوروں کے پسینے اور مظلوم عورتوں کے آنسوؤں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ تخریب کے دیوتا کا استھان فری میسن کے ہال یا یہودی کے ہیکل میں نہیں، بلکہ بیماروں کے ہسپتالوں، قیدیوں کے جیل خانوں، اور آزردہ دل سپاہیوں کی چھاؤنیوں میں ہے۔ تخریب پسندوں کا رب نہ ابلیس ہے، نہ کوئی اور دیوتا، بلکہ وہ تو انسانیت کے مستقبل کی اُمیدوں ہی کو اپنا کعبۂ مقصود سمجھتے ہیں۔ اُن کی جنّت صیہونیت کی آسمانی بادشاہت نہیں، بلکہ وہ تو یہاں، اس دھرتی پر مزدوروں کے لئے آرام دہ بستیاں تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی بستیاں قائم کرنے کی خاطر اگر انہیں خون اور آگ کے دریا بھی عبور کرنے پڑیں تو انہیں اس میں توقف نہیں۔ وہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے تخت اُلٹنے اور تاج پائمال کرنے کو بخوشی آمادہ ہیں، حتیٰ کہ وہ اس لگن میں عظیم الشان سلطنتوں کو بھی تباہ و برباد کر دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ حق تو یہ ہے کہ آخری منزل تک پہنچنے کا راستہ ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کے پلصراط ہی کو سمجھا گیا ہے۔ جب تک دکھ نہ جھیلے جائیں گے، تب تک

آخر سکھ کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

نیچ ذاتیں کیسے وجود میں آتی ہیں

ہر تمدن میں بدبخت انسانوں کا ایک گروہ موجود رہا ہے۔ یہ بدنصیب وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں رائج الوقت تہذیب سزائیں دیتی ہے اور اپنے انعامات سے محروم رکھتی ہے۔ انہیں کو نیچ ذاتیں بھی کہا جاتا ہے۔

نیچ ذاتوں کے وجود کی وجوہات ہر ملک اور ہر زمانے میں مختلف ہوتی ہیں۔ کبھی تو ایک ادنیٰ قوم شکست کھا جاتی ہے، لیکن فنا نہیں ہوتی، اور اس طرح ایک نیچ ذات وجود میں آجاتی ہیں۔ یہ لوگ حقیقی شودر ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم اگرچہ ادنیٰ نہیں ہوتی، لیکن مفتوح ہو جاتی ہے۔ قدیم یونان میں ملک اسپارٹا کے کمین اسی نوع میں داخل تھے۔ اسی ذیل میں وہ بیرونی شکست خوردہ نسلیں بھی شامل ہیں جو فاتح سے کسی حیثیت میں کم نہیں ہوتیں اور کسی سیاسی یا اقتصادی غرض سے سلطنت کے اندر آباد کر دی جاتی ہیں۔ روما کے وہ باشندے کچھ اسی قسم کے تھے جو سلطنت کے دور افتادہ اضلاع سے لاکر آباد کئے گئے تھے۔ خود کسی تہذیب و تمدن کے وہ اماکین بھی نیچ ذات ہی شمار کرنے

چاہئیں جو کسی نہ کسی وجہ سے قوم کی عام ترقی کا ساتھ نہ دے سکے ہوں، اور اِس وجہ سے قوم کی معاشرتی تاریخ میں ایک گذشتہ وحشیانہ دور کی یادگار ہوں۔

کیا ہمیں نیچ ذاتوں کے لئے کوئی ہمدردی محسوس کرنی چاہیئے؟ ایک نسل پر کسی دوسری نسل کا تسلّط کوئی اچھی بات نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب اس قسم کا تسلّط قائم ہو جائے تو خوفناک مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ اِن مظالم کا تصوّر کرنے سے بھی دل لرزہ اُٹھتا ہے۔

عہدِ حاضر کی نیچ ذاتیں

گذشتہ زمانہ کی کوئی نیچ ذات ہمدردی کی اس قدر مستحق نہیں جتنی کہ عہدِ حاضر کی نیچ ذاتیں۔ عہدِ جدید کی نیچ ذاتیں اس لئے رحم کی زیادہ مستحق ہیں کہ وہ خود ہمارے گوشت اور پوست کا ٹکڑا ہیں۔ اگر آج وہ پست اور ذلیل ہیں تو اس لئے نہیں کہ شروع سے ہی وہ ذلیل اور پست تھے۔ نہ ہی اس ذلّت اور پستی میں اُن کا قصور ہے۔ وہ محض اس لئے پست اور ذلیل ہیں کہ ہمارے تمدّن میں اقتدار اور دولت کی تقسیم کے لئے کچھ خاص ذرائع اختیار کئے گئے جن کے تعین میں اِن غریبوں کو کچھ دخل حاصل نہ تھا۔ وہ اس وجہ سے

ذلیل اور پست ہیں کہ اُن کے دادا جان کو نواب صاحب نے گاؤں کی مشترکہ اراضی سے بے دخل کر کے خانہ برباد کر دیا تھا۔ وہ اس لئے ذلیل اور پست ہیں کہ کارخانہ دار کو سستے مزدوروں کی ضرورت تھی، اور اُس نے بچوں کو بطورِ مزدور بھرتی کر لیا۔ وہ اس لئے ذلیل اور پست ہیں کہ کسی زمانہ میں کوئی جنگ لڑی گئی تھی۔ وہ اس لئے ذلیل اور پست ہیں کہ نئی نئی ایجادات رواج پا چکی ہیں۔ وہ اِس لئے ذلیل اور پست ہیں کہ تجارت کے پرانے راستے بدل گئے ہیں۔ وہ اِس لئے ذلیل اور پست ہیں کہ اُن کے آباؤ اجداد شراب خور تھے، یا آتشک کے مریض تھے۔ وہ اِس لئے ذلیل اور پست ہیں کہ اٹھارھویں صدی میں کوئی خوبصورت لڑکی تپِ دق کی مریض تھی، یا پختہ دماغ نہ تھی۔ وہ اِس لئے ذلیل اور پست ہیں کہ کوئی مجرم جسے تختۂ دار پہ کھینچ دینا چاہئے تھا بچ نکلا۔ وہ اس لئے ذلیل اور پست ہیں کہ کوئی شخص تعددِ ازدواج کا مرتکب ہوا۔ وہ اس وجہ سے ذلیل اور پست ہیں کہ کسی مکتب کے کوئی میاں جی لکیر کے فقیر تھے۔ وہ اس لئے ذلیل اور پست ہیں کہ کسی کی ماں مر گئی، اور سوتیلی ماں ظالم تھی۔

کیا واقعی سب انسان برابر ہوتے ہیں؟

جن لوگوں کے حوصلے اور اُمیدیں بلند ہیں، وہ سرے سے نیچ ذاتوں کے وجود ہی کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صرف اتنی ہے کہ کسی نیچ ذات کے بچہ کو بچپن سے آغوشِ تربیت میں لیا جائے اچھے ماحول میں پالا پوسا جائے، اعلیٰ تعلیم دی جائے، اور اس طرح اُس میں سے نیچ ذات کا اثر زائل کر دیا جائے۔ یہ دعویٰ صحیح نہیں۔ قوم کے جو ارکین صحیح النسب ہیں، اُنہیں تو نیچ ذاتوں میں شمولیت سے بچایا جا سکتا ہے۔ اس شمولیت کی سزا سے بھی محفوظ رکھا جا سکتا ہے، لیکن حقیقی نیچ ذات لوگ تو نسبی خلل کا شکار ہوتے ہیں۔ اُنہیں اس خلل سے کبھی نجات نہیں دلائی جا سکتی۔ اُنہیں کسی اچھے کام کے لئے ملازم بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ اُن کی قسمت میں تو یہی لکھا ہے کہ روٹی کے ٹکڑے کو ترسیں، شفاخانے میں سسک سسک کر مر جائیں، جیل میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ختم ہو جائیں، پاگل خانے میں ٹکریں مار مار کر سر پھوڑ لیں، ایک کنگال کی موت مر جائیں، یا پھانسی کا پھندا اُن کو مجرم قرار دے کر اُن کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔

فی زمانہ ہمیں خود ہر وقت یہی خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں ہم بھی اس طبقہ میں شامل ہونے پر مجبور نہ ہو جائیں۔ ہماری اولاد کا کچھ نہ کچھ

حصّہ تو ایک روز ضرور اس طبقہ میں شرکت پر مجبور ہو جائے گا۔

تخریب پسندی کی جڑیں بڑی گہری ہیں

جو بدنصیب بغیر کسی قصور کے روزِ پیدائش سے ہی زبوں حالی کا شکار ہیں، اُن سے ہم یہ توقّع کیسے رکھ سکتے ہیں کہ وہ اُس نظامِ معاشرت سے راضی ہو جائیں جو فطری انصاف کے تقاضے بھی پورے نہیں کرتا۔ اِن لوگوں کی ناراضگی کی وجہ صرف یہی نہیں کہ ہر انسان کو بے انصافی دیکھ کر غصّہ آتا ہے، بلکہ اُن کے اشتعال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان میں ایک طبعی وحشیانہ جذبہ ایسا ہے جو اُسے آگ لگانے، لوٹ لینے، عصمت دری کرنے، اور تباہی مچانے پر مائل کرتا ہے۔ تہذیب و تمدّن ایک ایسا بند ہے جو نظامِ معاشرت کو انسانی فطرت کے سیلاب سے محفوظ رکھتا ہے۔ پھر اس میں تعجّب کی کیا بات ہے کہ جب کبھی سیلاب کی لہریں اُٹھتی ہیں تو بند پر تخریبی رجحانات کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔

تخریب پسندوں کا گروہ ایک ایسا گروہ ہے جس کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس گروہ میں شامل ہونے والے کبھی اُسے چھوڑ کر اُس کے حلقہ سے باہر نہیں آسکتے۔ برعکس اس کے ہر روز کئی لوگ اس گروہ میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ جوں

جوں جوں تہذیب کا نظام زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہوتا جاتا ہے، توں توں اُس سے فائدہ اٹھانے کے لئے جو قابلیت درکار ہوتی ہے اُس کا معیار بھی اونچا ہوتا چلا جاتا ہے۔ جو لوگ قابلیت کے اس روز بروز بلند ہونے والے معیار پر پورے نہیں اترتے اُن کے لئے سوائے نیچ ذات میں شامل ہونے کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔

اونچ نیچ کے ملاپ سے قیامت آجائیگی

اٹھارھویں صدی میں انگلستان کا فوجداری قانون سخت وحشیانہ تھا۔ اُس زمانہ میں حفظانِ صحت کے انتظامات اور جسمانی صفائی کا رواج نہ تھا۔ اِن دونوں وجوہات سے نیچ ذاتوں میں اموات ایسی بکثرت واقع ہوتی تھیں کہ نیچ ذاتوں کی تعداد نہ بڑھ سکی۔ اب ہم زیادہ رحم دل ہو چکے ہیں اور جان بچانے کے طریقوں میں بھی ترقی ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدبختوں کو بھی موت کے منہ سے بچا لیا جاتا ہے۔ لہٰذا سارے مغرب میں اُن لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جو تباہی کے غار میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

اگر معاملہ صرف تباہی کے غار کے باشندوں تک محدود ہوتا تو یہ لوگ کبھی نظامِ معاشرت میں کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ بغاوت کر دیں، اور چند گھنٹوں یا

چند دنوں تک متمدن دنیا کے کچھ علاقوں میں غارت گری مچاتے رہیں چونکہ وہ نیچ ذات ہیں اِس وجہ سے وہ کوئی ایسا راستہ دریافت نہیں کر سکتے جس پر چل کر وہ وفاداری سے باہم تعاون کر سکیں، یا قیادت کی کوئی بڑی بھلی شکل قائم کر سکیں۔ وہ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا جذبہ ایک لمحہ کے لئے بھی دبا کر مشترکہ فلاح و بہبود کے لئے کام نہیں کر سکتے۔ قاعدہ ہے کہ جہاں کہیں ایک زبردست جماعت کے قیام کے امکانات موجود ہوں، اور صرف مناسب قیادت میسر نہ آنے کے باعث جماعت کی تنظیم ملتوی ہو، تو ایسی قیادت میسر آنے میں دیر نہیں لگا کرتی۔

نیچ ذاتوں کے قائدین ہمیشہ اعلیٰ طبقات سے برآمد ہوا کرتے ہیں۔ اعلیٰ طبقات میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ جو کسی ذاتی وجہ سے موجودہ صورتِ حال سے برگشتہ ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو برادری کی رسوم کے خلاف کوئی گناہِ کبیرہ کرنے کی پاداش میں اپنی ذات سے نکال دیئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کی ایک مثال جلا وطن افراد ہوتے ہیں اسی ذیل میں دیوالئے بھی شامل ہوتے ہیں، چاہے اُن کی دولت کا دیوالہ نکل چکا ہو، اور چاہے اُن کی عزت کا دیوالہ نکل چکا ہو۔

یہ لوگ سماج کو ناسازگار پاکر برادری سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ محروم الوراثت اور عاق شدہ لوگ اسی نوع میں آتے ہیں۔ کئی لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر اگرچہ مارائج الوقت نظام کی وجہ سے کوئی سختی نہیں ہو رہی ہوتی لیکن پھر بھی وہ اُسے ناپسند کرتے ہیں۔ اُنہیں باغی کہا جاتا ہے۔ پھر کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں، اور وہ لائق بھی ہوتے ہیں، لیکن باوجود اِس کے اُنہیں ترقّی کا موقعہ نہیں ملتا۔ وہ صورتِ حال پر ہر پہلو سے غور کر کے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انقلابی ذرائع اختیار کر کے ہی اپنے رتبہ میں ترقّی کر سکتے ہیں۔ مستقل طور پر نہ بھی عارضی طور پر تو وہ ضرور انقلابی طریقۂ کار کو اپنے حق میں مفید سمجھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو "تو کون ؟ میں خواہ مخواہ !" کا نام دینا چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ نیچ ذاتیں کبھی لیڈروں سے محروم نہیں رہتیں نیچ ذات کے بعض لیڈر تو غیر معمولی قابلیت کے مالک ہوتے ہیں، اور اُن میں سے بعض مافوق العادت لیاقت رکھتے ہیں بعض بالکل بے غرض ہوتے ہیں۔ کئی ایسے بھی ہوتے ہیں جو لوگوں کا بھلا چاہتے ہیں، لیکن کام کرنے کا ڈھنگ نہیں جانتے بعض

ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دل بالکل سیاہ ہوتے ہیں۔ وہ خود غرض اور نفس پرست ہوتے ہیں۔

یہ دنیا بستی ہے اک آہ و فغاں کی

یہ ہے تخریب پسندوں کی جماعت کا اصلی حال۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس جماعت سے تمدّن کو کوئی حقیقی خطرہ نہیں۔ نیچ ذاتوں سے بجائے خود تو کوئی خطرہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اُن کے لیڈر اکثر سر پھرے اور متعصب دیوانے ہوتے ہیں، یا وہ نکمّے لوگ ہوتے ہیں جن کی فطرت میں غدّاری پوشیدہ ہوتی ہے۔ اگر اُن کی قیمت ادا کر دی جائے تو وہ نئی جماعت بھی اُسی آسانی سے ترک کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جس طرح اُنہوں نے اپنی پہلی جماعت سے بیوفائی کی تھی۔

ہاں یہ انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تخریبی اعتقادات قوم کے صالح عناصر میں بھی پھیلتے جا رہے ہیں اور خاصی وسعت حاصل کر چکے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا کی بہترین شئے مسرتِ محض ہے۔ یہ مسرتِ محض بہت کم لوگوں کو فی الواقع نصیب ہوتی ہے، اور اگر نصیب ہوتی ہے تو زیادہ دیر حاصل نہیں رہتی۔ ہاں جو لوگ

اِس مسرّت سے محروم رہتے ہیں اُنہیں ضرور اِس محرومی پہ غصّہ آتا ہے۔ اکثر انسانوں کی زندگی دکھ، مشقّت، درد، خوف، اضطراب، اور بے لطفی میں کٹتی ہے۔ مزید بریں اِس صنعت سازی کے زمانہ میں شمالی منطقوں کے اندر رہنے والے مزدوروں کی زندگی عیسائی زہد کے اُس تصوّر کے ماتحت کٹتی ہے، جس کی تعلیم ہے کہ مسرّت گناہ ہے۔ یہ بیچارے زندگی کی اُن خوشیوں سے محروم رہتے ہیں جو گرم آب و ہوا میں رہنے والے غریب لوگوں کو بھی میسّر ہوتی ہیں۔ اِس طرح سے کئی لوگ جو طبعاً دیانتدار اور محنتی ہوتے ہیں، اور اپنے بیوی بچوں سے بھی محبّت رکھتے ہیں، ایسے نظامِ معاشرت کے مخالف ہو جاتے ہیں جو اُنہیں زندگی کے آرام و مسرّت سے محروم رکھتا ہے۔

نافرمانی اور بغاوت کے پیغمبر

وہ اِس کیفیت میں ہوتے ہیں کہ گمراہی کا فرشتہ اُن کے سامنے آنکلتا ہے، اور کہتا ہے: "بھائی تم ساری عمر سخت محنت کرتے ہو۔ تمہارے گھر گندے ہیں۔ تمہاری خوراک بدمزہ ہے۔ تمہاری بیوی ایک بی موٹو صاحبہ ہیں۔ تمہارے بچے ورثہ سے محروم ہیں۔ تمہاری ساری عمر سخت محنت میں کٹ جائے گی۔ اگر تم بڑے

خوش قسمت ہوئے تو ٹیکس ادا کرنے، کرایہ بھرنے، اور نفع خوروں کے حصہ کی ادائیگی کے بعد جو رقم بچے گی، اُس سے تمہیں اتنی تنخواہ دے دی جائے گی جس سے تمہاری روٹی کپڑے کا خرچ چلتا رہے، اور ضرورت کے وقت کے لئے تمہارے پاس تھوڑی بہت پونجی بھی باقی بچ جائے۔ جب تم بوڑھے ہو جاؤ گے تو تمہیں سوائے خیرات کی روٹی کے کچھ نہ ملے گا۔ تمہارے پیچھے ایک جہنم ہے اور تمہارے سامنے ایک گہری کھائی ہے۔ آؤ ہمارے ساتھ مل جاؤ۔ ہم تمہیں ایک بہتر زندگی کا راستہ دکھاتے ہیں۔"

یا پھر وہ اُن سے یوں خطاب کرتا ہے: "کئی مرد اور عورتیں جنہوں نے ساری عمر کبھی ایک دن بھی محنت مزدوری نہیں کی، تمہاری محنت کی کمائی پر پل پل کر موٹے ہو رہے ہیں۔ کیا یہ انصاف ہے؟ کیا یہ حق ہے؟؟ وہ ایک گھنٹے کے واہیات عیش میں وہ دولت ضائع کر دیں جو تم سال بھر محنت کر کے پیدا کرتے ہو۔"

مزدور تحریک پسند نہیں۔ وہ تو آرام کا متلاشی، اور ایک معقول حد تک آزادی کا خواہاں ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ سرمایہ داروں کی سرکار اسے اِن دو چیزوں سے بھی محروم رکھنا چاہتی ہے۔ تخریب کے مبلّغ اُس سے اِن دونوں چیزوں کا وعدہ کرتے ہیں۔ پھر اس

میں تعجب کی کیا بات ہے کہ وہ تخریب پسندوں کا حامی بن جاتا ہے؟۔

مزدور طبعاً کمیونسٹ نہیں ہوتے

پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے چند ہی روز بعد کا واقعہ ہے کہ میں ریل گاڑی کے ایک ایسے ڈبہ میں تھا جہاں بہت ہی بھیڑ تھی۔ سبھی قسم کے ملے جلے مسافر بیٹھے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ روشنی اچھی نہ تھی، اس لئے مطالعہ ممکن نہ تھا۔ باتیں ہونے لگیں۔ میں کان دھر کر دلچسپی سے سنتا رہا۔ زیادہ تر بات چیت ایک بحری افسر کر رہا تھا۔ اُس نے لوگوں کو اِس موضوع پر وعظ پلانا شروع کر رکھا تھا کہ جنگ کے متعلق مزدوروں کا رویّہ حب الوطنی کے منافی ہے۔ اس سلسلہ میں اُس نے پہلی مثال تو یہ دی کہ جنگ جاری تھی اور مزدوروں نے ہڑتالیں شروع کر دیں۔ دوسری مثال اُس نے یہ دی کہ مزدوروں نے جنگ کے بعد غیر تربیّت یافتہ مزدوروں کے خلاف جو رویّہ اختیار کیا، وہ نامناسب تھا۔

ایک دستکار نے مزدوروں کی حمایت شروع کی۔ یہ شخص خاصہ پڑھا لکھا تھا، اور اُس کی زبان خاصی تیز تھی۔ اُس نے جنگ کے متعلق عام خیالات کا اظہار کیا۔ فوجوں کے متعلق پیش پا اُفتادہ باتیں بیان کیں۔ سرمایہ داروں کا سرسری تذکرہ کیا، اور

پھر برطانوی مقبوضات کا ذکر کرنے لگا۔ اِس ضمن میں اُس نے ہندوستان کا بھی نام لیا۔ اُس نے کہا یہ دنیا مدّتوں سے مزدور کو غلام بنانے کے لئے گٹھ جوڑ کئے بیٹھی ہے۔ اب اِن پرانے ظالموں نے ایک ایسی حرکت کی ہے جو خودکشی کے مترادف ہے۔ مزدوروں کا ارادہ ہے کہ اب وہ اپنی حق رسی کے لئے جدّ و جہد کریں۔ اِس مرحلہ پر اُس بحری افسر نے یہ گھِسی پٹی دلیل پیش کی کہ مزدوروں کی تنخواہوں میں اضافہ کا کچھ فائدہ نہیں، کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اشیاء کی قیمت بھی اُسی تناسب سے بڑھ جاتی ہیں۔ مزدور نے اس کے جواب میں کہا میں تو اتنا جانتا ہوں کہ جنگ سے پہلے میرے کئی ساتھی اپنے بچوں کو اچھے اسکول میں نہ بھیج سکتے تھے اور اب وہ ایسا کر سکتے ہیں۔

مجھے اس جواب سے مایوسی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ میری ملاقات آخر کار ایک بالشویک سے ہو گئی ہے، اور اب مجھے یہ معلوم کرنے کا موقعہ مل جائے گا کہ مارکس کی پیچیدہ تعلیمات مزدوروں کے ذہن میں جا کر کیا شکل اختیار کرتی ہیں۔ برعکس اس کے اسکول کے متعلق اُس کا یہ ایک فقرہ مجھ پر واضح کرنے کے لئے کافی تھا کہ اُس کی ذہنیّت ایک مزدور کی نہیں، بلکہ ایک کھاتے پیتے آدمی کی ذہنیّت

ہے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اُسے اپنے خاندان سے محبّت ہے۔ ترقّی کرنے کی خواہش ہے۔ بچت کرنے کی آرزو ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کی اولاد دوسروں سے بڑھ جائے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اُس میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو کھاتے پیتے لوگوں کا خاصہ ہوا کرتے ہیں۔

دنیا کسی ربّ کی متلاشی ہے

مجھے پختہ یقین ہے کہ جو لوگ مزدوروں کو ووٹ دیتے ہیں، اُن میں سے ایک فیصدی بھی مزدور پارٹی کی اصلی پالیسی سے کوئی حقیقی ہمدردی نہیں رکھتے۔ مزدور پارٹی کی اصلی پالیسی تو یہ ہے کہ آئینی ذرائع اختیار کرتے ہوئے بالشوزم کا راج قائم کر دیا جائے

علاوہ ازیں کچھ ایسے نوجوان بھی ہوتے ہیں جنہیں مظلوموں سے مخیرانہ ہمدردی ہوتی ہے۔ ایسے نوجوان چاہتے ہیں کہ وہ پٹی ہوئی لکیریں ترک کر کے اپنی ترقّی کے لئے نئی راہیں نکالیں۔

مزید براں اسی ضمن میں اصول پرستوں کا بھی تذکرہ آتا ہے۔ انسان کسی نہ کسی شئے کی پرستش کرنا چاہتا ہے۔ کسی چیز پر اپنی جان قربان کرنا چاہتا ہے۔ انسان صرف روٹی کھا کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ انسان کے سینہ میں ایسی ایسی آرزوئیں پیدا ہوتی رہتی ہیں

جن کی کچھ حدّ و انتہا نہیں۔ انسان عقل کو پیچھے چھوڑ کر اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ کہیں نہ کہیں تو آخر اُس کی نجات کا بھی سامان ہوگا۔

جو شخص اپنی کوششیں کسی اصول کی خدمت میں صرف کرنا چاہے آخر وہ کہاں جائے۔ آسمان خالی ہیں۔ تخت و تاج کا کچھ بھروسہ نہیں۔ حبّ الوطن لچّوں کا آخری سہارا ہے۔ علم میں سوائے غرور کے کیا دھرا ہے۔ پھر آخر اصولوں کا پجاری کس درگاہ پر اپنا سیس ٹکائے۔ یہ گرتی پڑتی انسانیت اُس کی اُمیدوں کا آخری سہارا ہے۔ وہ اُن مظلوموں کی مدد کرنے اُٹھا ہے، جن کا کوئی آسرا نہیں۔ ایک دن اُن کا بھی ضرور کلیان ہوگا۔ صرف حاجت اس امر کی ہے کہ کوئی نورانی سینہ والا رہبر اُن کی راہنمائی پر آمادہ ہو جائے۔ جب کامیابی نصیب ہو گئی تو ہم بھی فتحیابوں کے جلوس کے پیچھے پیچھے لگ جائیں گے، اور اُن کی عظمت میں اُن کے حصّہ دار بن جائیں گے۔

تخریب اور تعمیر ایک ہی جذبہ کے دو رُخ ہیں

غرض تخریبی قوّتیں خاصی طاقتور ہیں۔ وہ اتنی طاقتور ہیں جتنا اُن کو طاقتور نہ ہونا چاہیئے تھا۔ تخریبی اعتقادات صحیح نہیں۔ اگر

واقعی اُن پر عملدرآمد شروع ہو جائے تو انسانیت کے لئے کوئی فردوسِ بریں تعمیر نہ ہو جائے گا، بلکہ وہی چولہے کے پاس بھوبل کا ڈھیر سر میں خاک ڈالنے کو موجود ہو گا۔ بالخصوص انگلستان میں تو اس نسخہ کا ہلکا سا استعمال کرنے سے بھی آفت آجائے گی میری رائے میں انگریزوں کے اندر اگر کبھی کوئی لینن یا ٹراٹسکی پیدا ہو بھی گیا تو غریب کی تقدیر ہی پھوٹ جائے گی۔ اگر کسی ایسے متعصب جنونی کو وہ اختیاراتِ مطلقہ حاصل ہو گئے جو برطانوی آئین کے ماتحت حاکمِ اعلیٰ کے سپرد کئے جا سکتے ہیں، تو انگلستان چند ہی روز میں ایک قبرستان بن جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ مشوش ہے، اور تخریب کے حمایتیوں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہونے دینا چاہتا۔ اصول پرستوں اور ہمدردئ انسان کے حامیوں کی خوشامدیں کی جاتی ہیں۔ مزدوروں کی مراعات دی جاتی ہیں۔ کسی طبقہ کو جو تخریب پسندوں کی صف میں شامل ہونے پر مائل ہو، ناراض کرنے کا خطرہ مول نہ لینا چاہیئے۔

بنظرِ غائر مشاہدہ کرنے والوں کی نگاہ سے یہ بات نہ چوکی ہو گی کہ تخریب پسندوں کی تاریخ آج تک اُسی ڈگر پر چلتی آئی ہے جس پر شروع میں عیسائیت نے سفر کیا تھا۔ ابتدا میں عیسائیت

کی حمد اور نعتوں کا وہی مضمون ہوتا جو آجکل تخریب پسندوں کے ترانوں میں ادا کیا جاتا ہے۔ عیسائیت کے ابتدائی پیرو محروم طبقات کے افراد میں سے تبدیلیٔ دین کے ذریعہ حاصل کئے گئے تھے۔ اِس کے بعد عیسائیت نے ایک عالمگیر مذہب کی شکل اختیار کی۔ عیسائیت نے انسانوں کو پہلی دعوت یہ دی کہ وہ اِس ظلم اور دکھ درد سے بھری ہوئی دنیا سے منہ موڑ کر ایک ایسے جہان کا تصوّر کریں جو نیا، روشن اور بہتر ہو گا۔ عیسائیت نے ایک ایسی حالت میں انسانوں کی ڈھارس بندھائی جب وہ بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ عیسائیت کے حلقہ میں تمام ایسے عالی حوصلہ، اصول پرست اور پاک طینت لوگ اکٹھے ہو گئے جو نجات کے خواہاں تھے۔ باوجود اس کے عیسائیت پھر بھی ایک تخریبی عقیدہ ہی رہی جو معاشرت اور سرکار کی موجودہ شکل کو بدل دینا چاہتا تھا، بلکہ ساری دنیا کا نقشہ پلٹ دینے کا خواہاں تھا۔ عیسائیت کی تعلیم یہ تھی کہ ایسا انقلاب برپا کرنے کے بعد ہی نسلِ انسانی کی نجات ہو سکتی ہے۔ سلطنتِ روما اور عیسائی کلیسا میں ایسی کھُلم کھُلا جنگ ہوتی رہی جس سے دونوں کی تباہی کا امکان تھا۔ یہاں تک تو کلیسا اور تخریب پسندی، دونوں کی ترقی کے مدارج مماثل ہیں۔ اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا

آج بھی کوئی ایسا قسطنطین پیدا ہو گا جو تخریبی انقلاب کی قوتوں سے سرکاری نظام کی اصلاح اور تحفظ کا کام لے سکے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میری رائے میں تخریبی اعتقادات اور سرکاری نظام دونوں کی تباہی یقینی ہے۔

مشرق کی غلامی مغرب کی آزادی سے بہتر ہے

اہل مشرق کو تخریب پسندوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اہل مشرق کے نزدیک معاشرت کا نظام خدا نے قائم کیا ہے۔ اگر نظامِ معاشرت سے اہلِ مشرق کو دکھ پہنچے تو وہ کبھی اُسے تباہ کرنے کا خواب تک نہیں دیکھ سکتے، جیسے اُنہیں کسی عبادت گاہ میں عبادت کے وقت بیٹھنے کے لئے اچھی جگہ نہ ملے تو وہ کبھی اُس عبادت گاہ کو نقصان پہنچانے کا خیال دل میں نہیں لا سکتے۔ مسلمانوں اور زرتشتیوں دونوں کے ہاں تخریبی فرقے پیدا ہوتے رہے ہیں، لیکن قدیم اعتقادات رکھنے والوں نے ہمیشہ سختی سے اُن کو تلوار کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اس سختی کو عوام ہمیشہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔

سیاسیات میں حصّہ لینے والے بعض ہندوستانی بالشوزم سے یارانہ گانٹھنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اُنہیں بالشویکوں سے روپیہ لینے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔ لیکن اِس میں تعجب کی کیا بات ہے بعض

ہندوستانیوں کو تو خود ابلیس سے روپیہ لینے میں بھی عذر نہ ہوگا، بلکہ وہ سمجھیں گے کہ دیکھو ہم نے بنی آدم کے دشمن سے رقم وصول کرکے اُس کی جیب کچھ ہلکی کر دی۔ جب اُنہوں نے خود مغربی تہذیب کے خلاف بغاوت کر رکھی ہے، تو وہ دشمن کے بدخواہوں سے کیوں امداد حاصل نہ کریں۔

تخریبی اعتقادات کے مقلّدین کی نگاہ میں برطانوی سلطنتِ ہندوستان ایک انتہائی قابلِ نفرت شئے ہے۔ یہ سرمایہ داری کا نظام، باغِ عالم کو صرف غلاموں کی ایک نگری بنانے پر بس نہیں کرتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے سارے مشرق کے آرام اور چین کو لوٹ لینے پر آمادہ ہے۔ یہ درگت اُس مشرق کی بن رہی ہے جو زمانۂ قدیم سے شہرۂ آفاق ہے۔ جب مشرق کے اچھے دن تھے تو وہاں سرمایہ داری یا تنخواہ دار غلاموں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ہر کاشتکار اپنے چھوٹے سے کھیت میں زراعت کرتا تھا، اور تبادلۂ اجناس سے اپنی ضروریات اور خواہشات پوری کرنے کا سامان فراہم کر لیتا تھا۔ اہلِ حرفہ اپنے اوزاروں سے خود اپنے لئے کام کرتے تھے۔ اُن کے گاہک خام اجناس مہیا کر دیتے تھے۔ غرض سرمائے کی کوئی ضرورت

نہ تھی۔ ہر مزدور خود ہی اپنا آقا تھا، خود ہی دارو غہ، اور خود ہی مالک بھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی تنخواہ کے کولہو میں نہ پستا تھا۔ صفحۂ زمین پر ایک بہشت آباد تھا، جس کے باشندوں کو ستانے کے لئے کبھی کوئی بیرونی دشمن نہ آتا تھا۔ اگر کبھی کوئی بیرونی دشمن آہی جائے تو اُس کا مقابلہ کرنے کو سرمایہ داروں کے بھاڑے کے ٹٹو نہ بھیجے جاتے تھے، بلکہ شریف النسب، آزاد، راجپوت اُس کا مقابلہ کرنے بھیجے جاتے تھے۔

فرنگی اہلِ مشرق کے حق میں ایک لعنت ہے

اب وہ منظر ہی بدل چکا ہے۔ کارخانوں کی ہزاروں چمنیوں سے دھواں نکل کر ہندوستان کی بلوریں فضا میں اس طرح پھیل رہا ہے جیسے سرمایہ داری کی کالی دیوی کی آرتی چڑھائی جارہی ہو۔ انگریز ڈینگیں مارتے ہیں کہ انہوں نے ملک کو بیرونی حملہ سے محفوظ کر دیا ہے۔ ہاں اس لئے محفوظ کر دیا ہے تاکہ بغیر کسی رکاوٹ کے، اچھی طرح، ناجائز فائدہ اٹھانے کی پالیسی جاری رکھ سکیں۔ انہیں گھمنڈ ہے کہ انہوں نے ملک میں قانون اور نظم و نسق ٹھیک کر دیا ہے لیکن قانون تو امیروں کا حمایتی ہے۔ امیر حاکموں کی حکومت بھی غریبوں کی ہڈیاں پیسنے کو ہوتی ہے۔ منظم حکومت کا مطلب فقط یہ ہے کہ

امیروں کے احکام پر بلا روک ٹوک عمل ہوتا رہے۔ اگر ملک میں سڑکوں اور ریلوں کا جال بچھا دیا گیا ہے تو مقصد صرف یہ ہے کہ مزدور کے گاڑھے پسینے کی کمائی لوٹ کر لے جانے والے سرمایہ دار ڈاکوؤں کو آنے جانے کی سہولت رہے۔ انگریز فخر کرتے ہیں کہ اُن کا اخلاقی معیار زیادہ بلند ہے۔ ہاں یہ اُسی قسم کا اخلاق ہے جو آقا اپنے غلاموں کو اِس غرض سے سکھایا کرتے ہیں تاکہ قناعت غلاموں میں خو گر جائے، اور وہ بہتر غلام ثابت ہوں۔

ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا خاتمہ ایک بڑا بُت توڑنے کے برابر ہے

پھر بات یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت بظاہر ایک عظیم الشان نظامِ حکومت ہے۔ اگر اِس کو تباہ کرنے میں کامیابی ہو گئی تو اس کا اثر بڑا گہرا اور دور رس ہو گا۔ کسی تھیئٹر یا گرجے کو بارود سے اڑا دینا، یا کسی عجائب گھر یا نگار خانے کو آگ لگا دینا، یا ریلوے کی پٹڑی یا کسی بند کو توڑ دینا ہمیشہ گہرا اثر پیدا کرتا ہے اِن واقعات سے بزدل کھاتے پیتے لوگ رعشہ بر اندام ہو جاتے ہیں۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر نیچ ذاتوں کے من میں لڈو پھوٹنے لگتے ہیں۔ اگر اب ایک سلطنت کی بنیادیں اُکھاڑ دی گئیں تو کتنا زبردست

اثر ہو گا۔ سرمایہ داروں کو وہاں چوٹ لگے گی، جہاں انہیں سب سے زیادہ دکھ ہوتا ہے، یعنی جب اُن کے بٹوے میں چھید ہو جائے۔ علاوہ ازیں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ سلطنت کی تباہی کے ساتھ خون کی ندّیاں بھی بہ جائیں گی۔ ایسی بدنظمی پھیلے گی جس میں لوٹ مار، قتلِ عام، اور عصمت دری کا خوب موقعہ ملے گا۔ تخریب پسندوں کی جماعت یا اُن کے ہمدرد جب کبھی کوئی تخیلاتی ادب پیش کرتے ہیں —— میری مراد سیاسی رسالوں سے نہیں —— اور جب کبھی وہ ایک بہتر دنیا کا نقشہ کھینچنے بیٹھتے ہیں تو اُس میں ہمیشہ ہندوستان کے غلاموں کے ہاتھ بپا ہونے والے قتل و غارت کا تذکرہ بڑے لطف سے کیا جاتا ہے۔

پنڈت جی نے جب انگلستان کی سیاسیات کا جائزہ لیا تو وہ مذکورہ بالا نتائج پر پہنچے۔ غلط تھی، یا صحیح، بہر صورت اُن کی رائے یہی تھی۔ مختصر طور پر نتیجہ یہ تھا کہ قدامت پسند پارٹی ختم ہو چکی ہے۔ اتحاد پارٹی سے سوائے غیر ذمہ داری کے اور کوئی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ ہاں یہ بھروسہ کیا جا سکتا تھا کہ جب یہ لوگ برسرِ اقتدار ہوں تو دنیا جیسی چل رہی ہے چلنے دیں گے۔ جب وہ حزب الاختلاف کے فرائض سر انجام دے رہے ہوں تو

ہندوستان کے متعلق حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی دھڑا بازی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ لبرل پارٹی میں کئی چھوٹی چھوٹی پارٹیاں شامل ہیں جن کی ہمدردی اور امداد پر پنڈت جی بھروسہ رکھ سکتے ہیں۔ اِن میں سے بعض پارٹیوں سے تعلقات قائم رکھنے میں احتیاط ملحوظ رکھنی ہو گی۔ برعکس اس کے بعض دوسری پارٹیاں بخوشی تخریبی کارروائیوں میں شریک ہو جائیں گی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ خطرناک ساتھی ثابت ہوں۔

انگریز بحیثیتِ مجموعی ہندوستان سے لاعلم ہیں

جہاں تک انگریز قوم کے عام باشندوں کا تعلق ہے، سیاستدانوں کو چھوڑتے ہوئے، اُن سے کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ عام برطانوی رائے دہندگان کو نہ ہندوستان کے متعلق کچھ علم ہے۔ نہ وہ اِس کی پروا کرتے ہیں۔ وہ تو جانتے ہیں کہ یہ ایک نامعلوم سا ملک ہے، جہاں چیتے اور سانپ پائے جاتے ہیں، جہاں سپاہی بھرتی ہوتے ہیں، اور جہاں غلامانہ ذہنیت رکھنے والے سیاہ فام باشندے چاول کھا کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ جہاں ٹوپ اور پاجامے پہن کر گورے آئی چلائی کے انداز میں، رعب جما کر حکومت کرتے ہیں، پالکیوں میں سفر کرتے ہیں، برانڈی میں پانی ملا کر پیتے ہیں، شوربا کھاتے ہیں، جنگلوں

ہیں رہتے ہیں جہاں ایک ایک کے پاس کئی کئی بیویاں ہوتی ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ ہندوستان ایسے بے دینوں کی سرزمین ہے جو عیسائیت کے انتظار میں ہیں۔ اگر کوئی چیز اُن کے عیسائیت قبول کرنے میں مانع ہے تو وہ حکومت کی پیدا کردہ مشکلات ہیں، یا گورے لوگوں کی بے دینی کی زندگی۔ بعض دوسرے لوگ جنہوں نے میکس میلر کی کتابیں پڑھی تھیں، اور شاید ہندوستان کی دو چار سیرگاہوں کو بھی جلدی جلدی دیکھا تھا، جانتے تھے کہ ہندوستان بھی کبھی ایک تمدّن کا مالک تھا، جو شمالی نسلوں کے تمدّن سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اُنہیں یہ علم نہ تھا کہ آج سے بہت عرصہ پہلے یہ تمدّن اپنے نقطۂ عروج پہ پہنچ چکا تھا، اور اُس کے بعد بڑی عجلت سے انحطاط پذیر ہو گیا تھا۔ تجارتی طبقات کا ہندوستان سے تعلق محض کاروباری تھا، اور محض چند شہروں تک محدود تھا۔

تجارتی طبقات بحیثیتِ مجموعی آزاد خیال تھے، لیکن سوداگر لوگ تو بہر صورت سالانہ جمع خرچ کے بہی کھاتے سے ماورا کبھی کسی بات کی پرواہ ہی نہیں کیا کرتے - تجارتی طبقات ہندوستان کے نظامِ حکومت کو محض اس لئے پسند کرتے تھے کہ اِس نظام کے ماتحت ہندوستان میں امن قائم تھا،

اور آمد و رفت کے راستوں میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ تجارتی طبقات ہندوستانی عدالتوں کو سخت شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انہیں وہ قیود بھی پسند نہ تھیں جو تمام دفتری حکومتوں کی طرح حکومتِ ہندوستان نے بھی ہر قسم کے انفرادی کاروبار پر عائد کر رکھی تھیں، جس میں تجارت بھی شامل تھی۔ اگر ملک میں مسلسل بدنظمی پھیل رہی ہے تو یہ طبقہ بہت جلد کسی دوسرے نظامِ حکومت کا متلاشی بنایا جا سکتا ہے جس کے ماتحت ملک میں بہتر امن قائم رکھنے کی توقع ہو، اور جو تجارتی نفع کمانے کے لئے زیادہ وسیع میدان مہیا کر سکے۔

ہندوستان میں رہائش رکھنے والے انگریزوں کی انگلستان میں وقعت نہ تھی

بیچارے ہندوستان میں بسنے والے انگریزوں کی انگلستان میں وقعت نہ تھی۔ وہ طویل جلاوطنی کے باعث سیاسیات سے بالکل منقطع ہو چکے تھے۔ اگر کبھی کبھار کوئی ہندوستان میں بسنے والا انگریز پارلیمنٹ کا ممبر بن بھی جاتا تو وہ کوئی ایسا آدمی ہوتا تھا جسے کوئی نہ کوئی ذاتی گلہ یا شکایت مضطرب رکھتی تھی۔ اُس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی تھی کہ جس نظامِ حکومت نے اُس کو شخصی طور پر نقصان پہنچایا ہے اُس پر نکتہ چینی کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالے۔

جہاں تک اخبارات کا تعلّق ہے ہندوستان میں بسنے والے انگریزوں کو اخباری بحث مباحثہ کا سلیقہ نہ آتا تھا۔ وہ تو خالی دفتری نوٹ لکھنا جانتے تھے، یا میمورنڈم، اور یا رپوٹ۔ انشأ کی یہ تمام صورتیں بھی عہدیداروں کی باہمی سرکاری مراسلت تک محدود تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ غریب ہندوستان میں بسنے والے انگریز مختصر، شگفتہ عبارتیں، جاذبِ توجہ مراسلات، اور وہ خوش مزہ مناظرانہ مضامین لکھنے سے معذور تھے جنہیں جدید مزاج رکھنے والے لوگ اخبارات میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ گاہے گاہے کوئی ہندوستان میں بسنے والا انگریز اپنی سوانحمری شائع کر دیتا تھا، جسے لوگ محض اس لئے پڑھتے تھے کہ اس میں چٹخارے دار واقعات کا تذکرہ ہو گا۔

پھر بڑی بات تو یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں بسنے والا انگریز چاہتا بھی تو وہ ہندوستان کے رائج الوقت نظامِ حکومت کا بہت اچھا وکیل ثابت نہ ہو سکتا تھا۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ جو لوگ کسی نظام کی جزئیات کے ماہر ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ اُس نظام کے متعلق فلسفیانہ رائے قائم کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ ایک ضابطۂ قوانین تیار کرنا کسی میکالے یا بینتھم کا کام

ہے۔ کوئی مینز، فیلڈ یا سٹوویل، یا ایلڈن یہ کام نہیں کر سکتا۔ فنونِ حرب میں کتابیں لکھنا ونیشس کے بس کی بات ہے، اور میدان جنگ میں معرکے مارنا سٹیلی چو کا حصّہ ہے۔ یو لوٹوس حکومت کر سکتا ہے، لیکن سیاسیات پر کتابیں تصنیف کرنا کسی ارسطو سے ہی بن آتا ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں رہائش رکھنے والے انگریزوں میں بعض اعلیٰ پائے کے مصنّف بھی تھے، لیکن اُن کا خطاب زیادہ تر تعلیم یافتہ طبقات سے تھا۔ کپلنگ کی تصنیفات اگرچہ غیر معمولی قابلیت کا کرشمہ تھیں، لیکن اُن میں صورتِ حال کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا وہ حقیقت کے مطابق نہ تھا۔ کپلنگ کی تحریریں جس اسلوب میں لکھی جاتی تھیں، اُس کی وجہ سے وہ صرف اِکّا دُکّا اور چیدہ چیدہ واقعات پیش کر سکتی تھیں۔ اُن کا لب ولہجہ کئی لوگوں کے لئے سخت ناگوار تھا۔ اگر کچھ لوگ گوروں کے اقتدار کی اس طرح کُھلّم کُھلّا حمایت، شریفانہ جذبات کے ماتحت متقاضیٔ انصاف نہ سمجھتے تھے، تو بعض دوسرے لوگ شوقِ تردید سے ہی کپلنگ کی مخالفت کرنے لگ جاتے تھے۔

عروج میں ہی زوال کے اسباب بھی پوشیدہ ہوتے ہیں

یہ تھے وہ حالات جن میں ہندوستان کی حکومت کا عملی نظم و نسق قریباً ایک سو سال تک بغیر کسی مداخلت کے اپنی روایات کے مطابق کام کرتا رہا۔ یہ ایک ایسی صدی تھی جس میں دنیا کے اندر انقلابی طاقتوں کا جوش مدھم پڑتا جا رہا تھا۔ کیا اب یہ ممکن نہ تھا کہ حکومتِ ہندوستان کی ان سابقہ روایات میں تبدیلی پیدا کر دی جائے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے اس قدیم دستور کو فسخ کر دیا جائے کہ ہندوستان کے مسائل پر مباحثہ کرتے وقت جماعتی اختلافات نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔

یہ بات تو بالکل یقینی تھی کہ اگر انگلستان کا کوئی برسر اقتدار مدبر ہندوستان کو انقلاب کے راستہ پر چلانے کا خواہشمند ہو، تو اراکین کابینہ کی باہمی وفاداری اُن میں سے کسی کو کوئی رکاوٹ پیدا کرنے کی اجازت نہ دے گی۔ حزب الاختلاف کو نکتہ چینی کا ہوش نہ ہوگا، اور نہ ہی رائے عامہ کسی قسم کا شور و شر پیدا کرے گی۔

باب پنجم

ہندو راج

ہندوستان میں ایک انتظامی انقلاب

اسی دوران میں خود ہندوستان کے اندر بعض ایسی داخلی تبدیلیاں ہو رہی تھیں جو اگرچہ بجائے خود ناگزیر تھیں، لیکن اُن کی وجہ سے پنڈت جی کی تجاویز پنپنے کے امکانات بہتر ہوتے جا رہے تھے۔

کمپنی کو اب ختم کر دیا گیا تھا۔ بورڈ آف کنٹرول کی صدارت خود وزیرِ ہند کے سپرد کر دی گئی تھی۔ وزیرِ ہند ہمیشہ برطانوی کابینہ کا ایک رکن ہوتا تھا۔ بورڈ آف کنٹرول ختم کر کے اُس کی جگہ وزیرِ ہند کی کونسل نے لے لی تھی۔ اِس کونسل کے اراکین زیادہ تر ہندوستان

رہ کر آنے والے ریٹائرڈ انگریز افسر یا سوداگر ہوتے تھے جن کو سوائے مشورہ دینے کے اور کوئی اختیارات حاصل نہ تھے۔ اُن کے مشورہ کو بھی بآسانی نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ اِس کونسل کا بڑا کام یہ تھا کہ وزیرِ ہند کی کارروائیوں کے لئے ایک آڑ کا کام دے سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ صورتِ حال یہ تھی کہ انگلستان کے عام رائے دہندگان کو ہندوستان کے معاملات سے بہت کم دلچسپی تھی۔ پارلیمنٹ کے اراکین میں سے بھی، چند خبطیوں کو چھوڑ کر، کوئی ہندوستان کے متعلق وزیرِ ہند کی سرگرمیوں میں دخل نہ دیتا تھا، وزارت بھی وزیرِ ہند پر زیادہ سختی سے نگرانی نہ کرتی تھی۔ علاوہ ازیں بعض حالات ایسے تھے جن کے باعث حکومتِ ہندوستان پر وزیرِ ہند کا اقتدار بڑھتا چلا گیا۔ اگر کوئی وزیرِ ہند اپنے ارادے کا پکا ہو، تو اُسے ہندوستان کے متعلق اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی دقّت پیش نہ آ سکتی تھی۔

حکومتِ ہندوستان کی مجلسِ انتظامیہ کے اراکین کی تعداد اب پہلے کی نسبت بڑھا دی گئی تھی۔ نئے اراکین سول سروس کے ممبر نہ ہوتے تھے، بلکہ عام طور پر ایسے ماہرینِ فن ہوتے تھے جنہیں خاص طور پر انگلستان سے بلایا جاتا تھا۔ بالعموم قابل آدمیوں کو

اِس عہدے کے لئے چنا جاتا تھا، اگرچہ طبعی امر ہے کہ دوسرے معاملات کی طرح یہاں بھی سیاسی جماعتوں کے حقوق کا خیال رکھا جاتا تھا۔ حالات کا رجحان یہ تھا کہ اب مجلسِ انتظامیہ مختلف محکموں کے رؤسائے شعبہ جات کا جمگھٹ بن کر رہ گئی تھی مشترکہ ذمہ داری کا اصول اگرچہ بالکل مفقود نہ ہوا تھا، تاہم کارگر بھی نہ رہا تھا۔ مجلسِ انتظامیہ میں گورنر جنرل بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وائسرائے کا رسوخ فیصلہ کُن حیثیت رکھتا تھا۔ چونکہ صوبوں کے لفٹنٹ گورنر اور وزیرِ ہند کی کونسل کے اراکین وائسرائے کی مجلسِ انتظامیہ کے اراکین میں سے متعرر کئے جاتے تھے، اور اس تقرر کا انحصار وائسرائے کی جانب سے رضامندی کی سفارش پر ہوتا تھا، اس لئے مجلسِ انتظامیہ پر وائسرائے کا اثر اور بھی زیادہ تھا۔ برعکس اِس کے صوبوں میں صورتِ حال مختلف تھی۔ وہاں گورنروں کو اپنی کونسلوں میں وہ رسوخ حاصل نہ تھا جو وائسرائے کی کونسل میں وائسرائے کو حاصل تھا۔ پھر جن صوبوں میں پہلے صوبجاتی سپہ سالارِ اعظم کا عہدہ ہوا کرتا تھا وہاں بھی اب اُسے منسوخ کر دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ تھا اب صوبوں میں گورنر کی کونسل صرف تین اراکین پر مشتمل ہوتی تھی۔ یعنی ایک خود گورنر اور دو سول سروس

کے اراکین۔ یہی وجہ تھی کہ عام نظم ونسق پر سول سروس کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا، اور حکومت میں وہی نقائص پیدا ہو گئے تھے جو دفتری حکومت کے نقائص ہوا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ہم بعد میں تفصیل بیان کریں گے کونسل کے اراکین کو حقیقتِ حال کا کچھ زیادہ علم نہ ہوتا تھا۔ اگر کوئی وائسرائے ذرا ڈھب سے کام لے، یا اگر کسی وائسرائے کی شخصیت با اثر ہوئی، تو وہ جو چاہے کر سکتا تھا۔ اسی طرح وزیرِ ہند بھی جو چاہے کر سکتا تھا، بشرطیکہ وہ کوئی ایسا وائسرائے مقرر کر دے جو وزیرِ ہند کا گماشتہ بننے پر راضی ہو۔

یہی وجہ تھی کہ ہندوستان میں ایسی سرکاری پالیسی پر بھی عملدرآمد کروایا جا سکتا تھا، جو محض چند افراد کی پالیسی ہوتی تھی، لیکن جس کی بابت یہ ظاہر کیا جاتا تھا کہ یہ برطانیہ عظمیٰ کی پارلیمنٹ اور حکومتِ ہندوستان کی سوچی سمجھی پالیسی ہے۔

سائنس کی اختراعات ایک رحمت ہی نہیں بلکہ ایک زحمت بھی ثابت ہوئیں

جن دنوں ہندوستان سے کسی سوال کا جواب حاصل کرنے میں ایک سال لگ جایا کرتا تھا، تب بہت سے مسائل انہیں لوگوں کی رائے پر چھوڑ دینے پڑتے تھے جو موقعہ پر موجود ہوتے

تھے۔ برطانوی حکام کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ہندوستان کے نظم و نسق کی تفصیلات میں مسلسل دخل دیتے۔ وہ اِسی پر اکتفا کرتے تھے کہ کسی پالیسی کے اصول متعین کر دیئے جائیں، اور پھر اسی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایسے آدمیوں کا تقرر کر دیا جائے جن سے یہ توقع ہو کہ وہ اِن عام اصولوں کو عملی جامہ پہنا سکیں گے۔ اس کے بعد جب بحری جہازوں میں بھاپ کے انجن استعمال ہونے لگے، ہندوستان تک پہنچنے کے لئے بحیرۂ احمر کا راستہ کھل گیا، نہر سویز تیار ہو گئی، اور تار ایجاد ہو گئی تو ہندوستان اور انگلستان میں روابط پہلے کی نسبت بہت زیادہ قریبی ہو گئے۔ حکومتِ برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کی حکومت کے مسائل میں مسلسل مداخلت اب ممکن بھی تھی، اور ناگزیر بھی۔ ایسی حالت میں مقامی گماشتہ خوب جانتا تھا کہ اگر وہ محض اپنی رائے سے کوئی پالیسی اختیار کرے تو ممکن ہے بعد میں اُسے مذمت کا سامنا کرنا پڑے اور یہ ذلت اُٹھانی پڑے کہ اپنے کیے پر خود ہی پانی پھیرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ مقامی گماشتے اب کچھ کرنے سے پہلے مرکز سے پیشگی منظوری حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ قانوناً تو ساری ذمہ داری مقامی

گماشتہ پر ہے، لیکن اُسے کوئی اختیار حاصل نہیں۔ برعکس اس کے مرکزی افسر کو تمام اختیارات حاصل ہیں، اگرچہ اُس کے کندھوں پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ اس کا لازمی انجام یہ ہوتا ہے کہ حکومت کے نظم و نسق کی مشینری کمزور ہو جاتی ہے۔

ذاتی تعلقات کا حکومت میں دخل نہ ہونا چاہیئے

علاوہ ازیں اب یہ رسمِ بد عام ہو گئی تھی کہ وائسرائے اور وزیرِ ہند میں ذاتی خط و کتابت کا رواج چل نکلا تھا۔ یہ وہی دستور تھا جس پر نو آبادیات کے سلسلہ میں پہلے سے عمل ہو رہا تھا۔ مقبوضات کا گورنر شاہ شطرنج ہوتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ ایک سفیر کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک سفیر کے تعلقات میں تو یہ بالکل درست ہے کہ وہ جس حکومت کی جانب سے مامور ہے، اُس کے ساتھ خفیہ اور پوشیدہ خط و کتابت رکھے۔ برخلاف اِس کے ہندستان کا گورنر جنرل وہاں کے نظم و نسق کا حاکمِ اعلیٰ تھا۔ آئینی لحاظ سے یہ جائز نہ تھا کہ وزیرِ ہند کی خواہشات یا خیالات گورنر جنرل تک سوائے سرکاری وسائل کے اور کسی ذریعہ سے پہنچائے جائیں۔

اس طرح جو صورتِ حال پیدا ہو گئی وہ ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔ فرض کیجئے ایک وزیرِ ہند، مسٹر زید کو خیال آتا ہے کہ

شملہ کے بندروں کو شلواریں پہنانی چاہئیں۔ اب وہ مسٹر بکؔر کو جو کہ ہندوستان کے گورنر جنرل ہیں خط لکھتے ہیں کہ شملہ کے بندروں کو شلواریں پہنانے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ لارڈ بکؔر والپس جواب لکھتے ہیں کہ اُن کے خیال میں یہ کوئی بہت زیادہ معقول تجویز نہیں۔ بندر ایک دلچسپ مخلوق ہے اور اُن کی ستر پوشی کے موجودہ انتظامات روشن خیال ہندوستانیوں کی رائے میں قابلِ اطمینان ہیں، نہ کہ قابلِ اعتراض۔ مسٹر زید اُس کے جواب میں ایک ذاتی خط لکھتے ہیں کہ جوں جوں وہ بندروں کی برہنگی پر غور کرتے ہیں توں توں اُن کی یہ رائے پختہ ہوتی جا رہی ہے کہ بندروں کو شلواریں پہنانا بہت ضروری ہے۔ لاٹ بکؔر اس کے جواب میں پھر ذاتی خط لکھتے ہیں کہ کیا مسٹر زیدؔ نے مسئلہ کے اس پہلو پر بھی غور کی ہے کہ شلواریں پہنانے سے پہلے بندروں کی دُم کاٹنے کی ضرورت محسوس ہوگی؟ مسٹر زیدؔ اس کے جواب میں پھر لکھتے ہیں کہ ایک ضروری اصلاح کے راستہ میں اِس قسم کی معمولی دقتیں حائل رہنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ انگلستان کی رائے عامہ اب حکومتِ ہندوستان کے اس ظلم وستم کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی کہ شلواریں پہننا صرف انسانوں تک

محدود رکھا جائے، اور بیچارے بندروں کو ہمیشہ حیوان ہی سمجھا جائے۔ اس کے بعد لاٹ بکر اپنی کونسل سے ذاتی طور پر مشورہ لیتے ہیں۔ کبھی تو یہ گفتگو کھانے کی میزوں پہ ہوگی، اور کبھی ٹی پارٹیوں کی تقریب پر مسئلہ ہمیشہ ایک دوستانہ انداز میں چھیڑا جائے گا، اور اس طرح کہ ایسے کیا جائے تو کیسا ہو۔ اس کے بعد گورنر جنرل وزیرِ ہند کو رپورٹ بھیجے گا کہ سپہ سالارِ اعظم کو اس مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں، کیونکہ یہ کوئی فوجی معاملہ نہیں۔ وزیرِ خزانہ یہ شک ظاہر کرتا تھا کہ شلواریں بنوانے کے لئے رقم کونسی مد سے فراہم ہوگی۔ دوسرے دیوانی اراکینِ کونسل میں سے ایک رکن اس تجویز کا مخالف ہے۔ اس کی رائے میں اس اقدام سے ہندوستانیوں میں برہمی پھیل جائے گی۔ وہ ایک ایسی دلچسپ بات کہتا ہے جس کا مجھے پہلے بالکل علم نہ تھا۔ وہ یہ کہ ہندوستانی بندروں کو مقدس سمجھتے ہیں۔ ایک اور ممبر دھڑا بانہ ہے، اور وہ ہر تجویز کی مخالفت کرے گا۔ اس کے جواب میں مسٹر زیدؔ گورنر جنرل کو ذاتی حکم نامہ لکھ بھیجتے ہیں کہ تجویز پر عمل کیا جائے۔ جو دیوانی رکن تجویز کا مخالف تھا اسے کسی صوبہ کا لفٹننٹ گورنر بنا کر بھیج دیا جاتا ہے، اور اس کی جگہ ایک ایسا ممبر مقرر کر دیا جاتا ہے جو وائسرائے

کی مرضی کے مطابق رائے دے گا۔ دھڑا بازممبر کو کوئی معمولی رعایت دے کر راضی کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک ایسی تجویز جس پر اگر معمول کے دستور کے مطابق غور کیا جاتا تو شاید سب اُس کی ہنسی اڑاتے، متفقہ طور پر منظور ہو جاتی ہے۔

ہندوستان میں پارلیمنٹری جمہوریت نہیں چل سکتی

یہ ایک ایسا طریقۂ کار تھا جس کی وجہ سے وائسرائے کی پالیسی کچھ اور ہوتی تھی اور گورنر جنرل کی پالیسی کچھ اور۔ نتیجہ یہ تھا کہ دونوں پالیسیوں کے ٹکراؤ سے حکومت کا نظم ونسق کمزور ہو رہا تھا۔

اگرچہ اصولاً اب بھی قانون سازی گورنر جنرل کی کونسل ہی کے سپرد تھی، لیکن عملاً طریقۂ کار میں ایک بہت بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ جب گورنر جنرل کی انتظامیہ کونسل بحیثیت مجلسِ قانون ساز کے اجلاس منعقد کرتی تھی تو اِس اجلاس میں ممبروں کے علاوہ کچھ دیگر اشخاص بھی شریک ہوتے تھے۔ یہ اشخاص اسی مقصد کے لئے نامزد کئے جاتے تھے۔ اس طرح سے سرکاری ملازمین کی اتنی تعداد نامزد کر دی جاتی تھی کہ حکومت کو ہمیشہ مستقل اکثریت حاصل رہتی تھی۔ اِس کے ساتھ ہی ساتھ رعایا کے عام فرقوں میں سے بھی کچھ ممبر

نامزد کر دیئے جاتے تھے۔ مثلاً ایسے اراکین کچھ تو یورپینوں میں سے لئے جاتے تھے، اور کچھ ہندوستانیوں میں سے۔ یہاں یہ موقعہ نہیں کہ حکومت کے نظم و نسق اور اِس مجلس قانون ساز کے باہمی تعلقات پر غور کی جائے۔ یہ کہنا کافی ہو گا کہ جب کسی حکومت کا نظم و نسق اپنے حاکمانہ اختیارات چھوڑ کر اپنی کارروائیوں پر تنقید کی حوصلہ افزائی کرنے لگتا ہے، تو گویا وہ اپنی جڑیں خود کھوکھلی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس طرح حکومت کو جو ضعف پہنچتا ہے اُس کے مقابلہ میں رعایا کو رضامند کرنے سے شاید کچھ تقویّت بھی مل جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، یہاں حکومت کے لئے اس قسم کی تقویّت کا کوئی امکان نہ تھا۔ ہندوستان میں رائے عامہ تو کوئی تھی ہی نہیں۔ اگر تھی تو بالکل برائے نام۔ ہاں کچھ باتیں ایسی تھیں جو ہندوستانیوں کے اعتقاد میں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ لیکن ہندوستانیوں کی رائے عامہ مجلسِ قانون ساز کی وساطت سے ظاہر نہ ہوتی تھی۔ بہرحال مجلس قانون ساز میں جو ہندوستانی نمائندے نامزد کئے جاتے تھے، وہ تو ہرگز ہندوستان کی رائے عامہ کی ترجمانی کے اہل نہ تھے۔

ہندوستان میں انگریزی راج ڈھیلا پڑنے لگا

حکومت کی ہیئتِ تشکیل میں اوپر جن تبدیلیوں کا ذکر ہوا ہے اُن سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومتِ ہندوستان کا نظم و نسق کمزور ہوتا چلا گیا۔ برطانوی مفاد کی نگہداشت کی ذمّہ داری از روئے قانون حکومتِ ہندوستان کے کندھوں پر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پنڈت جی نے اِس خاموش انقلاب کو مسرّت کی نگاہوں سے دیکھا۔

ابھی تک نظم و نسق کے نظام میں کہیں کھُلی ڈھیل پیدا نہ ہوئی تھی۔ ہاں اب حکومتِ ہندوستان کے نظم و نسق کو ایسے مسائل سے واسطہ پڑ رہا تھا، جن کا پہلے کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔ علاوہ ازیں حکومت کو اب ایسے وسائل سے کام لینے کی ضرورتیں پیش آ رہی تھیں جن کا پہلے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ ابھی یہ فیصلہ کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا کہ آیا حکومت کی اِس پیچیدہ مشینری میں رکاوٹ پیدا کر کے اُس کو کام کرنے سے روکا جا سکتا ہے یا نہیں۔

غدر سے کچھ عرصہ پہلے سول سروس کے تقرّرات کے فیصلے امتحانِ مقابلہ سے ہونے لگے۔ غدر کے بعد افواجِ ہندوستان کے افسران بھی انگلستان کی فوج میں سے دوسرے درجہ کے افسران

کو ترقی دے کر مقرر کئے جانے لگے۔ انگلستان کی فوج کے افسران اُن اُمیدواروں میں سے چُنے جاتے تھے جن کا کھلا امتحانِ مقابلہ ہوتا تھا۔ سرکاری ملازمین کے تقرر کے لئے امتحانِ مقابلہ کے انعقاد کے فوائد ظاہر ہیں۔ اس طرح رشوت خوری اور اقربا پروری کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس طریقہ سے کئی ایسے لوگ ملازمت میں شامل نہیں ہو سکتے جو بڑے اچھے سرکاری ملازم ثابت ہوتے، اور جن کی ذہانت میں بھی کوئی نقص نہیں ہوتا، لیکن جو ممتحنوں کو مطمئن کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ دوسری طرف امتحانِ مقابلہ میں خبطیوں کے کامیاب ہو جانے کا امکان باقی رہتا ہے۔ ہاں اس طریقہ سے وہ لوگ ضرور ملازمت سے یقینی طور پر دور رکھے جا سکتے ہیں جو ملازمت کی استعداد ہی نہیں رکھتے، یا فضول وقت ضائع کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ بعض لوگ اس لئے امتحانِ مقابلہ کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس کے ذریعہ جمہوری حقوق کی حفاظت بہتر طریقہ سے ہو سکتی ہے۔ جو ملازمت کے قابل ہوتا ہے اُسے ملازمت مل جاتی ہے۔ پھر بھی حقیقت یہی ہے کہ کنگال والدین کی اولاد امتحانِ مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتی، سوائے اس صورت کے کہ والدین غیر معمولی قربانی

کر کے امتحان مقابلہ کے لئے تیاری کے اخراجات برداشت کریں۔
پہلے پہل امتحانِ مقابلہ میں شمولیت کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ
اُمیدوار کے والدین یوروپین ہوں۔ جب تک یہ شرط قائم رہی
تب تک سول سروس کے اراکین پر امتحانِ مقابلہ کے ذریعہ بھرتی
کا کچھ خاص اثر نہیں پڑا۔ ہندوستان میں مقیم انگریز افسر، اعلیٰ ہوں
یا ادنیٰ، بالعموم ذہین لوگ ہوتے تھے۔ وہ اپنی شریکِ حیات کا
انتخاب کرتے وقت بھی اتنی سمجھ بوجھ سے ضرور کام لیتے تھے جس
سے اُن کی اولاد خاصی ذہین پیدا ہونے کا امکان رہتا تھا۔ انگریز
دیوانی افسریوں بھی مرفّہ الحال تھے۔ وہ یہ استطاعت رکھتے
تھے کہ اپنے بچوّں کو بہتر تعلیم دلوا سکیں۔ کچھ عرصہ بعد امتحانِ مقابلہ
میں شرکت کے لئے یوروپین حسب نسب کی قید اڑا دی گئی۔
ایک عام اصول کے طور پر کوئی اِس کا انکار نہ کرتا تھا کہ جہاں
یوروپین اُمیدواروں کی کتابی علمیّت سے اُن کی انتظامی استعداد
کی بابت خاصی صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے، وہاں ہندوستانی
اُمیدوار کتابی علمیّت رکھنے کے باوجود اکثر انتظامی قابلیّت سے
کورے ہوتے ہیں۔ باوجود اِس کے خیال یہ تھا کہ ہندوستان میں
کچھ صوبے ایسے بھی ہیں جہاں سرکاری افسروں کے لئے انتظامی

قابلیت کی کوئی خاص ضرورت نہیں اگر ایک افسر دیانتداری اور وفاداری سے اپنے معمولی فرائض پورا کرتا رہے تو یہی کافی ہے۔ اس قسم کے عہدوں پر ماتحت ہندوستانی افسر بڑی ناموری حاصل کر چکے تھے۔ ہر پڑھے لکھے ہندوستانی کو نوکری کی تلاش تو رہتی ہی ہے۔ یوں بھی یہ بڑی بے انصافی ہوگی کہ ہندوستانیوں کو خود اُن کے وطن میں سرکاری نوکریوں سے محروم رکھا جائے۔ انفرادی طور پر کئی ہندوستانی ایسے بھی ہیں جن کا چال چلن بے داغ ہے، اُن کی وفاداری میں کوئی شک نہیں، اور وہ اعلیٰ درجہ کی قابلیت کے مالک ہیں۔ علاوہ ازیں کئی عدالتی عہدے ایسے بھی ہیں جن کے لئے انتظامی قابلیت کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہندوستانی قانونی پیشہ سے ایک خاص لگاؤ بھی رکھتے ہیں قصہ مختصر یہ کہ ہندوستانیوں کو بھی سول سروس کے امتحانِ مقابلہ میں شمولیت کی اجازت دے دی گئی۔ اس امر کا کوئی خدشہ نہ تھا کہ ہندوستانی سول سروس پر چھا جائیں گے۔ اُن کے راستہ میں ایک رکاوٹ تو یہی تھی کہ امتحانِ مقابلہ انگلستان میں منعقد ہوتا تھا۔ اِس کے علاوہ امتحان کا نصاب بھی خاصہ کڑا تھا۔

سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانیوں کا دخل

جب ہندوستانیوں کو سول سروس میں شمولیت کی اجازت دی گئی تو اِس کے ساتھ ہی بعض ایسے عہدوں پر سول سروس کے اراکین کا تقرر بند کر دیا گیا جن پر آج تک صرف سول سروس کے ممبر مقرر ہوا کرتے تھے۔ ایسے خاص عہدوں پر تقرر کے لئے ملازمین کا ایک نیا عملہ قائم کیا گیا جس کے اراکین نامزد کرنے کا اختیار حکومتِ ہند کو حاصل تھا۔ اس طرح سے اعلیٰ اور شریف ہندوستانیوں کے لئے اُن کے اپنے ملک میں باعزت اور منفعت بخش سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا راستہ کھُل گیا۔

یہ اصلاح تھی تو منصفانہ لیکن اِس کے ساتھ ہی خطرناک بھی تھی۔ پنڈت جی یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ ایسی اصلاحات نافذ ہو رہی ہیں۔ اُنہوں نے سوچا اگر اس قسم کی تبدیلیاں اسی طرح جاری رہیں تو اپنی پو بارہ ہے۔

حکومت کے کارخانہ میں توسیع ہو رہی تھی

ایک طرف تو ملک کی دولت اور تمدّن میں ترقی ہو رہی تھی دوسری طرف اہلِ مغرب کے سیاسی خیالات بھی بلند ہو رہے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ روز بروز حکومت کے کندھوں پر ایسے فرائض کی

ذمہ داریاں بڑھتی جارہی تھیں جنہیں آج تک پورا کرنا مذہبی یا بلدیاتی اداروں کے سپرد تھا یا انفرادی شہری خود ہی اُن کا وصند اچکا لیا کرتے تھے۔ اس طرح حکومت ہند کی کارگذاریوں کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ لاتعداد نئے محکمے قائم ہو رہے تھے اور اُن میں کام کرنے کے لئے انگلستان سے افسر بلوائے جاتے تھے اُن افسروں میں سے کئی بڑی قابلیت کی ہستیاں تھیں جنہوں نے اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائی تھی۔ اُن کو تنخواہ تھوڑی دی جاتی تھی اور اُن سے سلوک بھی اچھا نہیں کیا جاتا تھا۔ اس وجہ سے یہ حضرات ہندوستان کے نظامِ حکومت سے کچھ بہت زیادہ خوش نہ تھے۔ سول سروس کے عہدہ داروں سے تو اُن کو خاص طور پر شکایات رہتی تھیں اُن کا خیال تھا کہ اُن کی اکثر دقتوں کا باعث انہیں سول سروس والوں کی بدطینتی ہے۔ پنڈت جی نے فاتحوں کی نسل میں یہ پھوٹ دیکھی تو وہ اطمینان سے مسکرا دیئے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ایک دفعہ دھڑابندی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو پھر اُس کے مقابلہ میں حب الوطنی، وفاداری، فرض شناسی، اور دین پروری سب پامال ہو جاتے ہیں۔

پنڈت جی اِن نئے نئے محکموں سے اس لئے بھی خوش تھے کہ چاہے یہ محکمے مفید ہی کیوں نہ ہوں لیکن ان کا طرزِ عمل اہلِ مشرق کو ناپسند ہے، اور اِس لئے اِن کی وجہ سے عوام میں بے اطمینانی پھیل جائے گی۔

سرکارِ ہند کے خزانہ میں کمی آ گئی

سرکاری کاروبار میں اس اضافہ کی وجہ سے اخراجات بھی بڑھ گئے۔ ہندوستان کے سرکاری خزانے کی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ ہندوستان کے سرکاری خزانے کو بہت سی رقومات برطانوی سکّہ میں ادا کرنی ہوتی تھیں۔ برطانوی سکّہ کے مقابلہ میں ہندوستانی روپے کی قیمت روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ اگر کسی مغربی ملک میں اس طرح سکّہ کی قیمت کم ہو جاتی تو سرکاری خزانہ اپنی کمی یوں پوری کرتا کہ موجودہ ٹیکسوں کی شرح بڑھا دی جاتی، یا نئے ٹیکس عائد کر دیئے جاتے۔ ہندوستان میں یہ علاج ممکن نہ تھا۔ ہندوستان میں سرکاری خزانے کی بیشتر آمدنی زرعی مالیانہ سے وصولی ہوتی تھی۔ مالیانہ کی شرح بعض مقامات پر تو ہمیشہ کے لئے مستقل طور پر مقرر ہو چکی تھی۔ بعض دوسرے مقامات پر مالیانہ کی شرح تیس سال کے لئے معین ہو چکی تھی۔ علاوہ ازیں اگر اجناس کی قیمتیں بڑھ جاتیں تو اس سے ٹیکس ادا کرنے والوں کو کچھ فائدہ نہ تھا۔ انکم ٹیکس یا بجری محصولات سے حکومت کو کچھ زیادہ آمدنی نہ ہوتی تھی۔ ہندوستانی عوام انکم ٹیکس سے تو کانوں پہ ہاتھ دھرتے تھے۔ اس لئے یہ ٹیکس تبھی عائد کیا گیا جب اس کی شدید ضرورت لاحق ہوئی۔ پھر دھوکہ دے

کہ اس ٹیکس سے بچنا بہت آسان تھا۔ اشیائے درآمد پر محصول انگلستان میں ناپسند کیا جاتا تھا۔ یہاں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ درحقیقت برطانوی سکہ کی قیمت بڑھ گئی تھی، یا فی الواقع ہندوستانی سکہ کی قیمت کم ہو چکی تھی۔ ایسی بحثیں محض علمی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس زمانہ میں ساری دنیا انگلستان کی قرضدار تھی۔ اس لئے انگلستان سونے کے علاوہ کسی اور دھات کو اپنا سکہ بنانے پر تیار نہ تھا۔ نہ ہی انگلستان اس امر پہ آمادہ تھا کہ جو قرضے اُسے طلائی سکّے میں لوٹانے کا وعدہ کیا جا چکا ہے اُن کی ادائیگی اب کسی اور صورت میں قبول کی جائے۔

روپے کی کمی سے تلوار بھی کند ہو جاتی ہے

خزانہ میں روپے کی کمی نے پنڈت جی کی ریشہ دوانیوں کے لئے ایک نیا میدان پیش کر دیا۔ جس بادشاہ کا خزانہ خالی ہو، اُس کا مقابلہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اُس کی فوجیں اور دوسرے تنخواہ دار ملازم بھی زیادہ دیر تک اُس کی اطاعت کیشی گوارا نہیں رکھتے۔ وفاداری کے پودے کو سونے یا چاندی کا پانی ملنا بند ہو جائے تو وہ مرجھا جاتا ہے۔ ان حالات میں نئے ٹیکس لگائے بغیر کام

نہیں چلتا۔ رعایا کے جو افراد آج تک ٹیکسوں سے محفوظ رہے ہیں بھلا اُن میں سے کون پسند کرے گا کہ اب اُس سے ٹیکس وصول کیا جائے۔ اہلِ ہندوستان کبھی نئے ٹیکس پسند نہیں کرتے۔ اگر اُن سے براہِ راست کوئی ٹیکس وصول کیا جائے تو وہ اِس کو بہت بڑا پاپ سمجھتے ہیں۔ غرض نئے ٹیکس رعایا میں بے چینی اور اضطراب پیدا کریں گے۔ پھر اِن ٹیکسوں کے خلاف انگلستان میں غلط فہمیاں پھیلانے کا بھی موقعہ ملے گا۔" اہل برطانیہ جیسی عظیم الشان قوم کب تک گوارا کر سکتی ہے کہ اُن کی سلطنت میں غیر ملکی خون چوسنے والوں کا ایک گروہ کہ وڑہا اہلِ مشرق کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کھا کھا کے موٹا ہوتا رہے۔" دوسری طرف اگر نئے ٹیکس نہ لگائے گئے تو حکومت کا کارخانہ جلد ہی بند ہو جائے گا۔ ایک دیوالیہ حکومت زیادہ دیر تک حاکم نہیں رہا کرتی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ دیوالیہ پن کی مدح میں کارلائل نے جو قصیدہ لکھا تھا، پنڈت جی غور سے اُس کا مطالعہ کر چکے تھے۔

انگریزی قانون اور عدالتوں میں بھی رخنہ پیدا ہو چکا تھا دوہری اور متوازی عدالتوں کا نظام اب ختم کیا جا چکا تھا۔ ہر بڑے صوبہ میں ایک ہائیکورٹ قائم کر دیا گیا تھا۔ چیف جسٹس

کوئی انگریز بیرسٹر ہوتا تھا۔ قواعد کی رو سے ججوں کی ایک کم از کم تعداد بیرسٹروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ اسی طرح عدالتی تجربہ رکھنے والے دیوانی ملازمین کی ایک کم از کم تعداد بھی ضرور جج مقرّر کی جاتی تھی۔ پریزیڈنسی شہروں میں ہائیکورٹ کو ابتدائی اختیاراتِ سماعت بھی حاصل تھے۔ سارے صوبے کی عدالتوں کی نگرانی اور اُن کے فیصلوں کی اپیل سننے کا حق ہائیکورٹ کو حاصل تھا۔ حکومت جو قوانین منظور کرے اُن کو جائز یا ناجائز ٹھیرانے کا اختیار ہائیکورٹ کو بہر حال حاصل تھا ہی۔ عدالتی نظام میں یہ تبدیلیاں بجائے خود مفید تھیں، لیکن اِن سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے ایسے مواقع بھی تھے جو پنڈت جی کی نگاہ سے چوک نہ سکے۔ اِن تبدیلیوں کا ایک نتیجہ تو یہ تھا کہ ہندوستانی وکیلوں کی دولت، اقتدار، اور رسوخ میں بڑی ترقّی ہوگئی۔ یہ وکیل بحیثیتِ مجموعی حکومت کے نظم و نسق کے دشمن تھے۔

مرکزیّت ہمیشہ حکومت کی تقویّت کا باعث نہیں ہوتی

حکومت کے نظم و نسق کو کمزور کرنے کا ایک اور باعث وہ رجحان تھا جو بظاہر حکومت کی تقویّت کا سبب نظر آتا ہے۔ وہ رجحان یہ تھا کہ حکومت کے زیادہ سے زیادہ اختیارات مرکز کے

پاس منتقل ہو رہے تھے۔ جس طرح سے حکومتِ ہند کے مسائل کا فیصلہ اب زیادہ تر لندن میں ہونے لگا تھا، اسی طرح سے صوبائی مسائل کا تصفیہ شملہ میں کرنے کا رواج روز بروز پختہ ہو رہا تھا۔ علیٰ ہٰذا القیاس اضلاع کے مسائل اب پہلے کے مقابلہ میں زیادہ تر صوبائی دارالحکومتوں میں طے ہوتے تھے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کا نظامِ حکومت دفتری ہے، وہ صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ دفتری نظامِ حکومت کے متعلق اُن کی معلومات ناکافی ہیں۔ ہندوستان میں ضلع کا ڈپٹی کمشنر محض حکومت کا کارندہ ہی نہیں ہوتا۔ حکومت کا بہت کچھ انحصار اُس کی شخصیت اور قیادت پر ہوتا ہے۔ ہاں اب کچھ عرصہ سے اُس کی قیادت پر پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں، اور اُس کی شخصیت بھی حدود و قیود میں جکڑ دی گئی ہے۔ یہ رجحان بعض ایسے اسباب کا نتیجہ تھا جو بجائے خود ناگزیر تھے۔ پہلا بڑا سبب تو یہ تھا کہ ہندوستان پر انگلستان کا اثر روز بروز بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ نظم و نسق میں ہندوستانی ملازمین کو بھی بھرتی کیا جانے لگا تھا۔ اہلِ مشرق کا خاصہ ہے کہ جوں ہی اُن کی وحشت دور ہو، اور وہ تھوڑا بہت پڑھ لکھ جائیں تو وہ فوراً کتاب کے کیڑے اور نرے منشی بن کر رہ جاتے ہیں۔

وہ تو دین و دنیا دونوں میں کسی کے پیچھے چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔ انہیں اُس وقت تک کل نہیں پڑتی جب تک وہ کوئی ایسا حاکم اعلیٰ حاصل نہیں کر لیتے جس کی فرمانبرداری میں اُن کی زندگی کٹ سکے۔ انہیں ایک برتر ہستی کی تلاش اِس لئے رہتی ہے تاکہ وہ خود ذمہ داری کے بوجھ سے نجات حاصل کر سکیں۔ ایک ہندوستانی سمجھتا ہے چونکہ وہ کسی فعل کا خود مختار نہیں اس لئے اگر حاکمِ اعلیٰ کا فرمان کسی خاص مقدمہ پر واضح طور سے عائد نہ ہوتا ہو، تو اُسے یہ بھی حق نہیں کہ وہ از خود کوئی قدم اُٹھائے۔ کیا پتہ حاکمِ اعلیٰ نے اس خاص معاملہ میں شاید اِس لئے کوئی واضح حکم نہ دیا ہو کہ وہ نہیں چاہتا اُس کے متعلق کچھ کیا جائے۔ جہاں حکم بالکل صاف نہ ہو وہاں بہتر یہی ہے کہ کچھ نہ کیا جائے۔ اس روش کا فائدہ یہ ہے کہ کم از کم ماتحت پر کچھ غلط کرنے کا الزام تو عائد نہ ہو سکے گا۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ اعلیٰ حکام ہر معاملہ کے متعلق تمام امکانات فرض کر کے اُن کی بابت تفصیلی قوانین وضع کرتے کرتے ہلکان ہو جاتے تھے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ تمام معاملات کے ہر ممکن پہلو کو پہلے سے سوچا جا سکے۔

اِس لئے اعلیٰ حکام جوں جوں مفروضہ مقدمات، اور پھر اُن مفروضہ مقدمات کے تمام امکانات فرض کر کے اُن کے متعلق ایک واضح قانون بنانے کی کوشش کرتے تھے، توں توں یہ قانون زیادہ مہمل اور مجہول بنتا چلا جاتا تھا۔

قانون کے ذریعہ اخلاق کی اصلاح ناممکن ہے

مثال کے طور پر اگر کوئی سرکاری عہدے دار یہ دیکھتا تھا کہ ایک لڑکا کسی سرخ بلّی کو زندہ جلا رہا ہے، اور پھر اس ظلم کو روکنے کے لئے اپنے ضابطۂ قوانین میں کوئی قاعدہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا، تو وہ یہ معلوم کر کے لاچار رہ جاتا تھا کہ از روئے قواعد اُسے اِن حالات میں لڑکے کو باز رکھنے کا اختیار صرف اُن حالتوں میں ہے جب بلّی کالی، سفید، پیلی یا بھوری ہو۔ اگر یہ سرکاری عہدے دار خدا ترس واقع ہو تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتا تھا کہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ضابطۂ قوانین کی کتاب بند کر دے اور مقدمہ کی مثل پر مجبوراً یہ فیصلہ لکھ دے کہ: "چونکہ ضابطۂ قوانین میں سُرخ بلیّوں کو زندہ جلانے کی کوئی ممانعت درج نہیں، لہٰذا مقدمہ ناقابلِ دست اندازیٔ سرکار ہے۔ کاغذات داخلِ دفتر کئے جائیں"۔ اِس کے بعد یہ خدا ترس افسر پھر اپنے

قلم گھسنے اور گھسانے کے شغل میں مصروف ہو جائے گا۔

برعکس اِس کے کوئی دوسرا سرکاری افسر جو اتنا شائستہ نہ ہو مِسَل پر لکھ دے گا: "یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا ظلم ناقابلِ برداشت ہے، اور میں کسی حالت میں اس کی اجازت دینے کو تیار نہیں"۔ اس کے بعد وہ بلّی کو آزاد کر دے گا، آگ کو بجھا دے گا، اور لڑکے کے کان اینٹھ کر اُس کو بھگا دے گا۔ جب وہ یہ سب کچھ کر چکے گا تو پھر بیٹھ کر اپنے طرزِ عمل کی وضاحت کے لئے ایک رپورٹ مرتب کرے گا، جس میں مختلف مثالیں دے کر وہ قاعدہ کلیّہ ثابت کیا جائے گا جس کے ماتحت اُس کی رائے میں بلّیوں کو زندہ جلانا ناواجب ہے، چاہے اُن کا رنگ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

جب تک حکومت میں ایسے افسروں کی کمی نہ تھی جو انتھک کام کرنے والے، باہمت ماہرینِ نظم و نسق تھے، اور جن کو تمام اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا جاتا تھا، تب تک حکومت کے مرکزیت پیدا کرنے کے رجحان سے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ بلکہ اِن حالات میں تو مرکزیت فائدہ رساں تھی۔ جب انتظامی حکّام کو حکومت کے اعلیٰ افسروں کی قابلیت پر اعتماد نہ رہا۔ جب حکومت کے اعلیٰ افسران میں یہ میلان پیدا ہو گیا کہ وہ شورش کو دبانے کے خیال سے حکومت کے مقامی

گماشتوں کو قربان کر دینے پر آمادگی ظاہر کرنے لگے، تب یہ مرکزیت حکومت کے حق میں وبالِ جان بن گئی۔ اگر کوئی حاکمِ اعلیٰ یہ چاہے کہ اُس کے تمام ماتحت کارندے اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ کر محض اُس کی ہاں میں ہاں ملایا کریں، تو اُس کے ارد گرد ایسے خوشامدیوں کی فوج جمع ہونے میں کبھی دیر نہیں لگا کرتی مضبوط شخصیّتوں کو تھوڑے ہی عرصہ میں ہٹا دیا جاتا ہے۔ جراُت، قیادت، اور موقعہ شناسی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ دورِ حکومت شروع ہو جاتا ہے جب حاکموں کی کرسیوں پہ دفتری بابو بیٹھے نظر آتے ہیں۔

محکماتی رقابت حکومت کی دشمن ہے

مبالغہ آمیز مرکزیت کا ایک اور بُرا نتیجہ یہ تھا کہ حکومت کے مختلف کام مختلف محکموں میں بٹ کر اُن کا باہمی رشتہ منقطع ہو گیا۔ پھر اُن میں سے ہر محکمہ کی دوسرے محکموں سے چشمک رہنے لگی۔ یہ تو بالکل جائز اور مناسب ہے کہ ہر شعبہ کا صدر اپنے ہی محکمہ کو سب سے زیادہ اہم خیال کرے، اتنا اہم کہ اُس کے مقابلہ میں اُسے ساری دنیا ہیچ نظر آئے۔ کھدائی کرنے والوں کا کام کھدائی کرنا ہے۔ وہ تو ہر چیز کو کھود ہی ڈالنے کے لئے مقرر ہوئے ہیں۔ اُن کی نگاہ میں کوئی عمارت مقدّس نہیں۔ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کا بس چلے

تو وہ ضرورت محسوس ہونے پر شاید تاج محل آگرہ کے پتھروں کی بھی روڑی بنا کر سڑکوں پر کوٹ ڈالنے سے دریغ نہ کریں۔ محکمۂ تعلیم کے ماہرین جب دیکھتے ہیں کہ توپ و تفنگ اور فوجوں پر بڑی بڑی رقمیں ضائع ہو رہی ہیں تو ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں کہ یہی روپیہ تعلیم پر خرچ کیا جاتا تو دور افتادہ دیہات بھی علم کی برکت سے محروم نہ رہتے۔ محکمۂ جنگلات کے افسر(ا) کا خیال ہے کہ کھیتی باڑی اور شہری آبادیوں کی بیخکنی کر کے وہاں کیکر کے درخت اُگائے جائیں تو بہت بہتر ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، یہ روش بالکل جائز اور مناسب ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی درست اور جائز ہے کہ حاکمِ اعلیٰ اِن سب محکموں کے افسروں پر قابو رکھے۔ ہر محکمہ کی کارگذاری اس طرح سے سرانجام پانی چاہیئے کہ ساری حکومت کے مفاد کو اُس سے تقویت پہنچے۔ حکومتِ ہند میں جب چاروں جانب محکماتی رقابت کا جذبہ پھیل گیا تو مختلف محکموں کی خود غرضی پر قابو رکھنے والی کوئی طاقت باقی نہ رہی۔ اس فضا میں عوام کے حقوق اور عوام کی خواہشات کی پروا کسے تھی۔

سیکریٹیریئیٹ کو کبھی کابینہ پر ترجیح نہ ہونی چاہیئے

اس عہد میں ایک اور غلطی بھی ہوئی۔ سیکریٹیریئیٹ کو ایسی اہمیت

حاصل ہوگئی جو کبھی حاصل نہ ہونی چاہیئے۔ از روئے آئین تو کونسل سکتروں کی آقا تھی، لیکن سیکریٹریوں کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی تھی کہ کسی طرح کونسل کے بھی کان کتر جائیں۔ گورنر اکثر اپنی اطلاعات کی فراہمی اور مشورہ کے لئے سکتر سے براہِ راست گفتگو کو ترجیح دیتا تھا، کیونکہ سکتر قابل بھی ہوتا تھا اور اپنے فن کا ماہر بھی۔ اس بے ضابطہ مشورہ کے نتیجہ میں جو تجویز تیار ہوتی تھی، گورنر اُسے ایک ترشی ترشائی اسکیم کی صورت میں اپنی کونسل کے سامنے پیش کر دیتا تھا۔ ایسی مشورت نظم و نسق میں ضعف پیدا کرتی تھی۔ پھر سیکریٹریئیٹ کا کام کاج جس نہج سے چل رہا تھا، اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں سیکریٹری واقعات کی دنیا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔

ایک ذہین نوجوان کو زمین سے اُٹھا کر آسمانی دیوتاؤں کی محفل میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ پھر اُس کا سارا عہدِ ملازمت یوں کٹتا کہ اُسے ایک دفتری منصب کے پنجرہ سے نکل کر دوسرے دفتری منصب کے پنجرہ تک اڑنے کی اجازت تھی، لیکن کبھی زمین پر اُتر کر ضلع کے نظم و نسق کو دوبارہ قریب سے دیکھنے کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ ضلع کے نظم و نسق میں شہرت اور امتیاز حاصل کرنے کا موقعہ تو نہ تھا، یہاں

صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑتی تھیں، اور تنخواہ بھی کم ملتی تھی، باوجود اس کے ضلع کا نظم ونسق حکومت کے وجود کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

سیکریٹیریٹ میں سے ہی کونسل کے اراکین منتخب کیے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بسا اوقات ہندوستان میں آئی۔سی۔ایس کے افسروں میں ایسی مثالیں دیکھنے میں آتی تھیں کہ ایک شخص پینتیس سال تک ہندوستان میں رہتا ہے، اور ترقی کرتے کرتے اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب تک جا پہنچتا ہے، کبھی تو وہ کسی صوبہ کا گورنر بھی بن جاتا ہے، لیکن باوجود اس کے وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے متعلق اس سے زیادہ علم نہیں رکھتا جتنا کہ اگر وہ اپنی ساری عمر لندن ہی میں بسر کر دیتا تو شاید یہاں بھی حاصل کر سکتا تھا۔ ایسی مثالیں شاذ ونادر نہ تھیں، بلکہ عام تھیں۔ شملہ میں بیٹھ کر جو لوگ حکومت کا تمام کارخانہ چلاتے تھے اُن کی تعداد نہایت قلیل تھی۔ اُن کے ساتھ مل کر کام کرنے والے عملہ میں بھی مٹھی بھر لوگ ہوتے تھے۔ یہ تمام جماعت ایک محدود اور منتخب گروہ پر مشتمل تھی۔

جیسا کہ برسرِ اقتدار قلیل التعداد جماعتوں میں اکثر ہوا کرتا ہے یہاں بھی مناصب، خطابات، اور تمغوں کے لئے مسابقت کی

دور میں مسلسل باہمی کشمکش جاری رہتی تھی۔

مٹھی بھر لوگ جب اقتدار پر قابض ہو جائیں تو اُن کے معاملات میں عورتوں کو بھی بڑا عمل دخل حاصل ہو جایا کرتا ہے جب کسی حکومت میں عورتوں کو دخل حاصل ہو جائے تو اُن کا رسوخ ہمیشہ جائز مقاصد کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ ایسی فضا میں بلند پایہ حکمتِ عملی نہ تجویز کی جاسکتی ہے، نہ اُس پر عمل ہو سکتا ہے۔ ہر شخص کو اپنی غرض برآری کا سودا سر پر سوار رہتا ہے۔ اِس آپادھاپی میں نہ تو کسی وحشی غنیم کی آمد پر دور سے اُس کے پاؤں کی چاپ سننے کا ہوش رہتا ہے، نہ ہی کسی کوتوال یا محتسب کی شنوائی ہوتی ہے۔ راست گوئی پسند نہیں کی جاتی۔ یوں بھی مہذّب لوگوں کی محفل میں کڑوی باتیں زبان پر لانا ناقابلِ معافی گناہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی اجڈ، صاف گو افسر دل کی بات زبان سے کہہ دیتا تھا تو چاروں جانب ایک قابلِ رحم سراسیمگی پھیل جاتی تھی۔

انگریز بھی محلاتی سیاست کا شکار ہونے لگا

جس عہد کے حالات بیان کئے جا رہے ہیں تب حکومتِ ہندوستان شملہ یا دہلی کی حرم سرا میں ہی مقیّد نہ رہا کرتی تھی۔ سال کا کچھ عرصہ کلکتہ میں بسر کیا جاتا تھا۔ یہاں رائے عامہ سے

صحت مندانہ روابط قائم کرنے کا موقعہ ملتا تھا۔ لیکن کلکتہ کی رائے عامہ بعض پہلوؤں سے گمراہ کن تھی۔

کلکتہ ایک صوبہ کا دارالحکومت ہے جہاں کی صوبہ پرستی ضرب المثل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کلکتہ کو ہندوستان میں ہمیشہ بنگال کی کنیز سمجھا جاتا تھا۔ غرض کلکتہ کی رائے عامہ کا اثر کچھ زیادہ کارگر نہ تھا، اور جیسا کچھ تھا وہ بھی تھوڑی مدّت کے بعد ختم ہو گیا، کیونکہ پھر کلکتہ پایۂ تخت ہی نہ رہا۔ مختصر یہ کہ حکومت کی باگ ڈور جس گروہ کے ہاتھ میں تھی اُن میں بڑے بڑے قابل آدمی تھے۔ وہ اعلیٰ درجہ کے انشا، پرداز تھے، وہ کامیاب سازشیں کر سکتے تھے، وہ نظم و نسق کے ماہر تھے، لیکن اب اُن میں کوئی مدبّر نظر نہ آتا تھا۔

حکومتِ ہند کو روس سے خطرہ لاحق ہو گیا

ابھی اِن خرابیوں کا آغاز تھا۔ اگر امن کا دور دورہ رہتا تو شاید یہ چرخہ کچھ دیر اور یوں ہی چلتا رہتا۔ مگر قسمت میں امن کہاں لکھا تھا۔

جب یوروپ میں روس کا راستہ روک دیا گیا تو اُس نے حسب دستور ایشیا میں پھیلنا شروع کیا۔ روسی سازشوں کا جال افغانستان تک پھیل گیا۔ غدر کے بعد سے لے کر اُس وقت تک معاملاتِ

افغانستان سے نپٹنے میں افسوسناک بے تدبیری ظاہر کی گئی تھی ایسی بے تدبیری کا نتیجہ تھا کہ امیرِ افغانستان اور رؤسائے افغانستان جو پہلے انگریزوں کے معتمد دوست تھے، اب بدگمان دشمن بن گئے۔ یہی وجہ تھی کہ روسی سازشیں بالکل بے اثر نہ رہیں۔

اگر نقشہ پر ایک نگاہ بھی ڈالی جائے تو کوئی شخص جسے جغرافیہ کی جنگی اہمیت کے اصولوں کا معمولی سا علم ہو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اگر افغانستان میں ایک طاقتور حکومت برسرِ اقتدار ہو اور وہ برسرِ پرخاش بھی ہو تو ہندوستان کا بچنا محال ہے۔ اگر افغانستان کسی زبردست غیر سلطنت کے تسلّط میں ہو تب بھی ہندوستان خطرہ میں ہی رہے گا۔ اگر نقشہ ذرا بڑے پیمانہ پر بنا ہو، تو اس سے یہ حقیقت اور بھی زیادہ آسانی سے واضح ہو جائے گی۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اگر آخری وقت پر بھی کوشش کی جاتی تو امیر شیر علی کو انگریز راضی کر سکتے تھے۔ یا یہ اگر قطعاً ناممکن ہو چکا تھا تو تھوڑا سا روپیہ خرچ کر کے، اور ذرا تدبّر سے کام لے کر کوئی نیا امیر افغانستان کے تخت پر بٹھایا جا سکتا تھا۔ اُس وقت کی انگریزی حکومت جنگ پر تلی ہوئی تھی اور اس وجہ سے اُنھوں نے جنگ ہی کا راستہ اختیار

کیا۔ حسبِ دستور تھوڑا عرصہ بعد ہی انگریزوں پر ثابت ہو گیا کہ افغانستان کی فوجوں کو شکست دینا تو آسان ہے، لیکن افغانستان میں امن قائم کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو انگریزوں کو جنگ میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اُنہیں بڑے بڑے فوجی کارنامے دکھانے کا بھی موقعہ ملا، مگر جنگ تھی کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ اِس دوران میں خود انگلستان کے اندر حکومتِ ہندوستان اور حکومتِ انگلستان کے خلاف پارٹی بازی کی بنا پر پراپیگنڈا کی ایک ایسی تلخ مہم جاری تھی جس کے چلانے والے کسی اصول کے پابند نہ تھے۔ نیا الیکشن ہوا تو انگلستان کی برسرِ اقتدار پارٹی نے شکست کھائی۔ نئی وزارت نے پرانی حکمتِ عملی ہی بدل ڈالی۔ وائسرائے استعفےٰ دینے پر مجبور ہو گیا۔ غرض انگریز کچھ ایسے حالات میں افغانستان خالی کر آئے کہ ساری دنیا نے یہی سمجھا کہ ہزیمت اُٹھا کر بھاگ آئے ہیں۔

انگریزوں کو بھی شکست دی جا سکتی ہے

۱۸۷۹ء میں جب انگریز یوں افغانستان سے نکل آنے پر مجبور ہو گئے تو ہندوستانیوں میں ایک عام خیال پیدا ہو گیا کہ سرکار کو شکست دینا ناممکن نہیں۔ اگر حکومتِ انگلستان کو یقین ہو جائے

کہ فتح حاصل کرنے میں خطرات کا سامنا ہوگا، یا یہ کہ مالی لحاظ سے فتحیابی کے اخراجات مہنگے ثابت ہوں گے، تو پھر وہ شکست قبول کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتی ہے۔ غلام رعایا میں اس قسم کے خیالات پھیلنا ذرا اچھا نہیں ہوتا۔

پھر خرطوم، مجوبا اور پنجدہ میں انگریزوں کو جو شکستیں اُٹھانی پڑیں اُن سے ہندوستانیوں کے اس قسم کے باغیانہ خیالات کو تقویت ہی پہنچی۔

اسی دور کے آخری عہد میں اہلِ حبشہ نے اطالویوں پر فتح پائی۔ ترکوں نے یونانیوں کو شکست دی۔ دو صدیوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اہلِ مشرق نے فرنگیوں اور لاطینیوں کو میدانِ جنگ میں نیچا دکھایا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ گویا ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ اسی اثنا میں جاپان جس تیزی سے عروج حاصل کر رہا تھا اُسے نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔ جاپان ایک ایسا مشرقی ملک تھا جس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ بظاہر اس ملک کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ فرنگی ڈاکوؤں کی کوئی قوم یہاں بھی آکر قبضہ جما لے اور اچھی طرح لوٹ کھسوٹ کرے۔ لیکن جاپان ایسا دانا ثابت ہوا کہ جہاں ایک طرف اُس نے اپنی مشرقیت میں اصولاً کوئی فرق نہ آنے

دیا، وہاں فرنگیوں کے علوم و فنون بھی سیکھ لئے۔ تیس سال کی قلیل مدّت میں جاپان نے اتنی طاقت پکڑ لی کہ وہ بحرالکاہل میں فرنگیوں کے اقتدار کے لئے ایک زبردست خطرہ بن گیا۔ اِن واقعات سے کیا ثابت ہوا؟ ثابت یہی ہوا کہ یہ فرنگی بھی کوئی آفت کے پرکالے نہیں۔ اللہ میاں نے اِن کے نام کوئی پٹہ نہیں لکھ دیا کہ دنیا پر ہمیشہ کے لئے فرنگیوں ہی کا راج رہے۔ فرنگیوں کا اقتدار بھی دنیا کی تمام دوسری اقوام کے اقتدار کی طرح ایک آنی جانی شئے ہے اور جب اللہ میاں کے من میں موج آئے تو فرنگی کا اقتدار بھی ختم ہو سکتا ہے۔ اب ایسا دکھائی دیتا تھا کہ فرنگیوں سے خدا کے بیزار ہونے کی گھڑی قریب ہے۔

جب جاپانیوں نے روسیوں کے خلاف ٹسوشیما کی فتح حاصل کی تو شمالی افریقہ سے لے کر ہانگ کانگ تک بسنے والی قوموں کو جن آقاؤں نے غلام بنا رکھا تھا اُن کی خواجگی کی تقدیر نحوست میں گھِر جانے کا ستارہ گویا اُفق پر طلوع ہو گیا۔ جب پورٹ آرتھر کے بازاروں میں روسی اسیرانِ جنگ کی قطاریں گذار کر اُن کی رسوائی کی نمائش کی جا رہی تھی تو اس وقت فقط روس کی آبرو ہی ملیامیٹ نہ ہو رہی تھی، بلکہ تمام گوری اقوام کے

رعب کا جنازہ نکلا جا رہا تھا۔ خیر یہ تو ہم اُن واقعات کا تذکرہ کرنے لگے جو ابھی آئندہ پیش آنے تھے۔ ابھی ہمیں اُسی زمانہ کے کچھ واقعات بیان کرنے ہیں جس کی باتیں ہم پہلے کر رہے تھے۔

افواجِ ہند کو بھی گھن لگ گیا

اِن جنگوں، اور جنگ کے خطرات کا ایک نتیجہ یہ بھی نِکلا کہ افواجِ ہند کی ہیئتِ ترکیبی تبدیل کر دی گئی۔ ہندوستان میں جس طرح فوج مختلف مقامات پر تقسیم کر کے رکھی جاتی تھی، اب اُس نظام میں بھی فرق آ گیا۔ غدر کے بعد افواجِ ہند کی تعداد خاصی کم کر دی گئی تھی۔ فوج کے بہت سے فرائض پولیس کو سونپ دیئے گئے تھے۔ جنگ افغانستان کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا تھا کہ بندھیاچل کے پہاڑوں کے جنوب میں بسنے والے تمام باشندوں کے سپاہیانہ اوصاف حقیر سمجھے جانے لگے۔ پوربیوں کو تو پہلے بھی غدر میں حصّہ لینے کے باعث ناقابلِ اعتماد سمجھا جاتا تھا۔ اسی دور کے آخر میں افواجِ ہند کو ایک مرکز کے ماتحت لا کر اُن کا ایک سپہ سالارِ اعظم مقرّر کر دیا گیا تھا۔ فوجی مسائل میں پہلے بھی شملہ کے اربابِ اقتدار کو خاصہ عمل دخل حاصل تھا، لیکن اب تو اُنہیں پورا تسلّط حاصل ہو گیا۔ جن رقیبوں سے فوج کے لئے

بھرتی کی جاتی تھی۔ اب اُن کا علاقہ محدود کر دیا گیا۔ رفتہ رفتہ فوج کے رنگروٹ چند ایسی نسلوں سے بھرتی کئے جانے لگے جن میں سے بعض تو ہندوستان کی باشندہ بھی نہ تھیں۔ ایسی فوج میں بغاوت بسرعت پھیلنے کا امکان زیادہ تھا۔ اگر سچ مچ بغاوت کی نوبت آ جائے تو جس طرح غدر کے موقعہ پر ہم نے فوج کے ایک حصّہ کو دوسرے حصّہ سے ٹکرا دیا تھا، اب اُس قسم کی کارروائی ممکن نہ تھی۔ ورنہ پہلے تو ایک ذات کے فوجیوں کو دوسری ذات کے فوجیوں سے لڑایا جا سکتا تھا۔ ایک مذہب کو ماننے والے فوجیوں کا دوسرے مذہب کے پیرو فوجیوں سے فساد کروایا جا سکتا تھا۔ ایک صوبہ کے فوجیوں کو دوسرے فوجیوں کے مقابلہ پر لانا بھی ممکن تھا۔

فوج اب چند منظورِ نظر قبیلوں کے افراد پر مشتمل تھی۔ اگر کوئی نوجوان اُن قبیلوں کی نسل سے نہ ہو تو وہ فوج کے معزز اور پر منفعت پیشہ سے محروم رہ جاتا تھا۔ اب ہندوستان میں کئی علاقے ایسے تھے جہاں مدّتوں کسی سپاہی کی پرچھائیں بھی دیکھنے میں نہ آتا تھا۔ اکثر لوگ کسی ایسی طاقت کا اقرار بمشکل ہی کرتے ہیں جو آنکھوں سے اوجھل ہو۔ ہندوستان کے باشندوں میں سے بہتیرے یہی خیال کرنے

لگے تھے کہ سرکار کے پاس اب فوجیں باقی نہیں۔ یہ دھوکہ اس وجہ سے اور بھی پختہ ہوتا گیا کہ فوجیں اب شمال مغربی علاقہ کی دور افتادہ چھاؤنیوں میں رکھی جاتی تھیں جہاں سے اُن کو افغانستان میں لے جانا آسان تھا۔ روس کے ساتھ تصادم کی صورت میں اگر اِن فوجوں کو افغانستان سے بھی آگے لے جانے کی ضرورت محسوس ہوتی تو اِن چھاؤنیوں میں فوجوں کے قیام کے باعث ایسے اقدام میں سہولت رہتی۔

ہندوستان میں اب گورے سپاہیوں کی تعداد پہلے سے زیادہ تھی۔ لیکن یہ گورے سپاہی اب کارنڈویل کے زمانہ کے آزمودہ کار جنگجو نہ تھے۔ ہندوستانیوں نے گوری نسل کے اِن نئے نوجوانوں کو ابھی میدانِ کارزار میں لڑتے نہ دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اِن کا کچھ ایسا رعب نہ مانا جاتا تھا

آہستہ آہستہ یہ نوبت بھی آئی کہ دیوانی حکومت اور فوجی حکّام میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ لیکن یہ نوبت ابھی کچھ دیر بعد آنی تھی۔

برطانوی راج میں ابھی جان باقی تھی

پنڈت جی ۱۸۵۷ء کا تجربہ دوہرانے کے خواہشمند نہ تھے

اس لئے انہیں فوج کی حالت کی کچھ ایسی پروا نہ تھی۔ ہاں وہ مشرق کے دوبارہ عروج کو دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ پنڈت جی نے مجوبا یا قندھار کے معرکوں سے سبق حاصل کرنے میں بھی دریغ نہ کیا تھا۔

چالیس سال کے تاریخی واقعات کو چند صفحات پر اختصار سے بیان کر دینے کی جو کوشش اوپر کی گئی ہے، اُس سے خدشہ ہے کہ کہیں قارئین کو اِس عہد کے متعلق غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے۔ ہندوستان میں انگریزی راج ابھی ایک زندہ حقیقت تھی۔ سرکار کے دبدبہ اور قوت میں کچھ فرق نہ آیا تھا۔ ابھی تو حکومتِ ہندوستان بعض نہایت مفید فرائض سر انجام دے رہی تھی۔ بیرونی دشمنوں کو ملک کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا جاتا تھا۔ فساد کی نوبت کبھی کبھار ہی آتی تھی۔ خزانہ بھرپور تھا۔ رعایا خوشحال تھی، اور روپے پیسہ کی بھی کمی نہ تھی۔ انگریز افسروں سے چاہے رعایا کو الفت نہ تھی، تاہم اُن کی عزت کی جاتی تھی۔ آپس کے جھگڑوں میں فریاد ہمیشہ صاحب بہادر کے دربار تک پہنچتی تھی۔ اِن جھگڑوں کو نپٹانے کے لئے ثالثی کے فرائض بھی اکثر انگریز سر انجام دیتے تھے۔ ہندوستان میں بے چینی اور اضطراب تو ضرور موجود تھا، لیکن یہ پیچ و تاب ابھی کچھ

واضح نہ تھا۔ نہ ہی اُس نے کوئی منظم صورت اختیار کی تھی۔ صرف ہندوستانیوں کے چند طبقات مطمئن نہ تھے۔ ورنہ لاتعداد کسان اور ان کسانوں کے سہارے زندگی بسر کرنے والی مخلوق برطانوی سرکار کو ایک ایسا آسمانی دیوتا سمجھتی تھی جس کی بابت اگرچہ عام رعایا ایک خالی خولی تصوّر سے زیادہ کچھ علم نہ رکھتی تھی، لیکن جس سے بہر صورت نفع ہی پہنچتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دس لاکھ باشندے ایسے ہوں گے جو برطانوی راج سے برگشتہ تھے۔ آسمانی دیوتاؤں کے خیالی تصوّر سے کبھی عوام کو وابستگی نہیں ہوتی۔ بالخصوص اہلِ مشرق تو کبھی نئے تصوّرات سے مانوس نہیں ہو سکتے۔ ہاں اہلِ مشرق کو بھی کسی سے فائدہ پہنچے تو احسان مند ضرور ہوتے ہیں۔ عام رعایا کو اس امر کی کوئی خاص خواہش نہ تھی کہ برطانوی راج ختم کر دیا جائے۔ اگر کبھی تجویز پیش ہوتی کہ برطانوی علاقہ سے کوئی ضلع کسی بہترین ترقی یافتہ اور روشن خیال ریاست کے ساتھ ملحق کر دیا جائے تو اس تجویز کے خلاف احتجاج کا غوغا برپا ہو جاتا تھا۔

غرض پنڈت جی اپنے ارد گرد کا جائزہ لے رہے تھے، لیکن اُنہوں نے ابھی یہ فیصلہ نہ کیا تھا کہ حملہ کس جانب سے اور کس طرح کیا جائے۔ رعایا کچھ اس طرح ہاتھ پاؤں توڑ کر مطمئن بیٹھی

تھی کہ پہلے عوام میں انتشار پیدا کرنا ضروری تھا۔ عوام کو متحرک کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ کسی طرح خدائی طاقتوں کو زمین پر بلا کر انسانوں کے جھنجوڑنے کا بندوبست کیا جائے لیکن ابھی ایسے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے جن سے پتہ چلتا کہ اللہ کا بھیجا ہوا مہدی کب نازل ہوگا۔

حکومتِ ہند پنڈت جی کی خفیہ کارروائیوں سے بخوبی آشنا تھی۔ لیکن وہ پنڈت جی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اگر وہ پنڈت جی کو اہمیت نہ دیتی تو اُس کی وجہ معقول تھی۔ جب پنڈت جی کہتے تھے کہ اپنا بوریا بستر اُٹھاؤ، تاکہ مجھے اپنا سنگھاسن جمانے کا موقعہ ملے تو حکومتِ ہند کی جانب سے پنڈت جی کو زبانِ حال سے جواب دیا جاتا تھا: "لوگ ہمارے راج کو آپ کی حکومت پر ترجیح دیتے ہیں"۔ جب پنڈت جی کہتے تھے کہ میں انگریزی حکومت کے مقابلہ میں بہتر حکومت ثابت ہوں گا، تو اس کا بے ساختہ جواب یہ ہوتا تھا کہ آپ کے ارشاد کا بظاہر کوئی ثبوت نظر نہیں آتا۔ جب پنڈت جی مدعی بنتے کہ قوم کو قومی حکومت کی ضرورت ہے، تو انہیں جواب دیا جاتا تھا کہ لوگ قومی حکومت کی خاطر نہ پھوٹی کوڑی خرچنے کو آمادہ ہیں، نہ خون کا ایک قطرہ بہانے کو تیار ہیں۔ دور شملہ کی پہاڑیوں پر بیٹھی ہوئی حکومتِ ہند کو یہ پتہ نہ تھا کہ بعض ایسے اسباب بھی بروئے کار ہیں جو آہستہ آہستہ

بھی کام کرتے رہے تو ایک دن پنڈت جی کے حمایتیوں کی خاصی تعداد فراہم ہو جائے گی۔ یا اگر حکومتِ ہند کو اِن اسباب کا علم تھا تو وہ اِن کے تدارک کی پروا نہ کرتی تھی۔ یا شاید تدارک کی طاقت رکھتی تھی۔ نئی سیاست دان ہمیشہ اعمال پہ توجہ دیا کرتے ہیں۔ ان کو اعتقادات سے زیادہ وابستگی نہیں ہوتی۔ خاص طور پر انگریز مدّبرین کا تو یہی شیوہ ہے۔ تاہم یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اعمال ہمیشہ خیالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ سلطنتوں کو تباہ کر دینے اور از سرِ نو تعمیر کرنے کی طاقت خیالات اور اعتقادات سے پیدا ہوتی ہے۔ پیدائش اور موت کا فرشتہ عقل ہے، نہ کہ عمل۔ پنڈت جی کے خیالات کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ پنڈت جی کے سینہ میں جو نفرت کی چنگاری سلگ رہی تھی، اُس میں ایک آتشِ جہاں سوز بننے کی اہلیّت موجود تھی۔ کیا پتہ کہ اسی آگ سے کلیان کی دیوی بھی پیدا ہو جائے کئی ایسی دوسری طاقتیں بھی کام کر رہی تھیں، جن کی وجہ سے پنڈت جی کی تعلیمات کی کامیابی کا امکان پہلے سے زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔

انگریزی تعلیم تخریبی ذہنیت پیدا کرتی ہے

انگریزی تعلیم پھیل رہی تھی۔ ۱۸۳۰ء سے ہی یہ فیصلہ کر دیا گیا تھا کہ حکومت کا فرض ہے کہ مغربی علوم کے مندر کے کواڑ اپنی رعایا پر کھول

دے۔ جن لوگوں نے یہ فیصلہ کروایا تھا وہ مشرقی علوم سے بے بہرہ تھے۔ وہ مشرقی ثقافت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ تو اُنہیں پتہ ہی نہ تھا کہ ہندوستان میں کئی مقامی زبانیں رائج ہیں۔ اُن کے پیشِ نظر تو دو مقاصد تھے۔ اوّل وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا کر دیا جائے جس سے حکومت اپنے دفتروں کے لئے کلرک بھرتی کر سکے۔ دوسرے اُنہیں یہ بھی توقع تھی کہ چند لوگ مغربی علوم پڑھ جائیں گے تو اُن کے ذریعہ سینکڑوں اَن پڑھ بھی مغرب کے چشمۂ فیض سے سیراب ہو سکیں گے۔ اِس میں تو اُنہیں کچھ شک ہی نہ تھا کہ مغربی علوم کو مشرقی علوم پر ترجیح حاصل ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یوروپ میں بھی تو آخر علم اسی طرح پھیلا کہ جاہل اور وحشی عوام نے مٹھی بھر علماء و فضلاء سے علم کی روشنی حاصل کی۔ اُنہوں نے یہ تو اندازہ لگا لیا تھا کہ انگریزی تعلیم کے پھیل جانے سے اہلِ مغرب کے اقتدار میں فرق آجائے گا۔ لیکن جو خطرہ فی الحقیقت رونما ہوا وہ اُس خطرہ سے بالکل مختلف تھا جس کا اس نظامِ تعلیم کے بانیوں کو خدشہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مغربی تہذیب بڑی سرعت سے پھیل جائے گی۔ مشرقی تہذیب کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ہندوستانی اہلِ مغرب بن جائیں گے۔ اُس کے بعد ہندوستان پر انگریزی راج جاری رکھنے

کے لئے کیا عذر باقی رہ جائے گا؟ اُس وقت کسی ایسے عذر کی ضرورت بھی نہ ہوگی۔ انگلستان ہندوستان میں اپنے تاریخی منصب کے فرائض سرانجام دے چکا ہوگا۔

کیا تعلیم سے نسل بدلی جا سکتی ہے؟

بہت ۱۸۳۰ء میں ابھی سائنس کی کچھ زیادہ قدر نہ تھی۔ منڈل اور وائس مین کی تحقیقات کے نتائج ابھی شائع نہ ہوئے تھے۔ بڑے بڑے ذہین لوگ اس وہم میں گرفتار تھے کہ انسان کوشش کرے تو مکمل انسان بن سکتا ہے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر کسی شخص کا بازو کاٹ ڈالا جائے تو پھر بھی اُس کی اولاد دو بازوؤں والی پیدا ہوگی، لیکن یہ اُمیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ کسی انسان کو تعلیم دے کر نہ صرف اُس کی بلکہ اُس کی اولاد کی بھی جبلّی خصلتیں بدلی جا سکتی ہیں، جو دراصل زمانۂ ماضی میں کسی نسل کے تجربات کا شخصی عکس ہوتی ہیں۔

ابھی تک قدرت کے اسرار کی حقیقت تو پوری طرح واضح نہیں ہوئی، لیکن یہ عیاں ہے کہ اشخاص میں تبدیلیاں پیدا کر کے کسی نسل کو نہیں بدلا جا سکتا۔ ہاں اگر مدّتوں ان تبدیلیوں کا سلسلہ جاری رہے، ماحول میں بھی انقلاب پیدا ہو جائے، اور پھر چند اشخاص کو منتخب کر کے کسی علیحدہ جگہ رکھا جائے، تو شاید ماں باپ

کی تعلیم و تربیت کے نتائج اولاد میں بھی قائم رکھے جا سکیں۔ اگر کوئی برسرِ اقتدار نسل چاہے کہ اُس کے ماتحت نسل میں ہمیشہ ایک ہی بازو والے بچے پیدا ہوا کریں، تو اِس کی صورت صرف یہ ہے کہ ہر غلام بچے کی پیدائش کے بعد اُس کا ایک بازو کاٹ دیا جایا کرے۔

اگر ایک ہزار سال تک بھی ماتحت نسل کے بچوں کے بازو کاٹنے کا سلسلہ مستعدی اور باقاعدگی سے جاری رہے، فرض کر لیجئے ہمیشہ بایاں بازو ہی کاٹا جائے، تب بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ ماتحت نسل کے دائیں بازو کے مقابلہ میں ضرور ہی بایاں بازو کمزور ہوا کرے گا۔ بہرحال یہ تو صرف دکھائی دے رہا تھا کہ چند ہندوستانی مردوں کو انگریزی تعلیم دے کر سارے ہندوستان کی تہذیب و تمدن، یا وہاں کے باشندوں کی جبلتیں نہیں بدلی جا سکتیں۔

انسانی تاریخ میں ایسے تجربات پہلے بھی کئے جا چکے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ باہمی توالد و تناسل کا تجربہ بھی کیا گیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ذہنی فضا بھی قطعاً بدل دی گئی۔ یہ سب کچھ آج ہندوستان میں کرنا ممکن نہیں۔ ہاں تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں دکھائی پڑتی ہیں۔ شام پر یونان نے اپنا روغن پھیرنے کی کوشش کی۔ مصر پر پہلے یونانی تمدن کا سایہ رہا۔ پھر یونانیوں اور اطالویوں کے مشترکہ تمدن

کا دور دورہ رہا۔ ہسپانیہ میں عربوں کے تمدن نے خوب جڑیں پھیلائیں اور پھل پھول بھی پیدا کئے۔ لیکن ان تمام مثالوں میں جوں ہی اجنبی حکومت کا خاتمہ ہوا، اُس کے ساتھ ہی، اُس حکومت کا قائم کردہ تمدن بھی ملیامیٹ ہو گیا۔ یقیناً ہندوستان میں بھی انگریزوں کی سطحی تہذیب کا یہی حشر ہو گا۔ اس بات کا کوئی حقیقی خطرہ نہیں کہ ہندوستان میں اینگلو انڈین ذہنیت کا کوئی مستقل گروہ پیدا ہو جائے گا۔

اصل خطرہ کچھ اور ہی تھا۔ بیرونی تمدن مشرقی تمدن میں کبھی کوئی بنیادی تبدیلی تو مستقل طور پر پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ ہاں وہ اہل مشرق کی رگوں میں زہر بن کر ضرور دوڑ سکتا ہے۔ اور اِس طرح اُن میں چڑچڑاپن پیدا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ مشرق کی جس سوسائٹی میں یہ زہر داخل ہو جائے گا، وہ اِس کو قے کرنے کے لئے ہمیشہ پیچ و تاب کھاتی رہے گی۔ بیرونی تمدن کے خلاف منافرت بڑھ جائے گی، اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اُس بیرونی اقتدار سے بھی دشمنی پیدا ہو جائے گی جو یہ زہر سوسائٹی میں داخل کر رہا ہے۔ اگر یہ زہر خوش آیند اور پُرکشش ہے تو اس وجہ سے اُس کے خلاف مخاصمت کی آگ اور بھی بھڑکے گی۔

دوغلی مخلوق کی زندگی عذاب میں رہتی ہے

جس شخص کی رگوں میں دوغلا خون دوڑ رہا ہو، اُس کی زندگی ہمیشہ عذاب میں رہتی ہے۔ اُس کے خون کے ایک ایک قطرہ میں خانہ جنگی برپا رہتی ہے۔ اس سے بھی بدتر حالت اُس شخص کی ہے جس کے ذہن نے تو کسی اجنبی تہذیب کو قبول کر لیا ہو، لیکن اُس کی فطرت اِس بیرونی تمدّن کے خلاف بغاوت کرتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرنگیوں اور فرنگی تہذیب کے خلاف نفرت اور تلخی کے بدترین جذبات اُن لوگوں میں پائے جاتے ہیں جنہوں نے فرنگی علوم کی تعلیم پائی ہے۔ جن لوگوں نے فرنگی علوم کی تعلیم مغرب میں جا کر حاصل کی ہے وہ تو بالخصوص اسی ذیل میں آتے ہیں۔ یہ تو میں نے اُن لوگوں کی کیفیت بیان کی جو آزاد مشرقی ممالک کے باشندے ہیں۔ ہندوستان میں مغربی تعلیم پانے والوں کا حال اس سے بھی بدتر ہوتا تھا۔ ہندوستانی ذہین ہوتے ہیں، محنتی ہوتے ہیں، اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ وہ جلد ہی مغربی تمدّن کو جذب کر لیتے ہیں۔ بسا اوقات تو وہ مکتب اور امتحان کے کمرے میں اپنے انگریز ساتھیوں سے بھی بازی لے جاتے ہیں۔ باوجود اِس کے انگریزی حکومت یہ تسلیم نہیں کرتی کہ جو شخص اعلیٰ تعلیم حاصل کر جائے وہ ضرور ہی اعلیٰ انتظامی قابلیت

بھی پیدا کر لیتا ہے۔ یا اُس کا چال چلن بھی ضرور ہی اعلیٰ پایہ کا ثابت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو بھی ادنیٰ سرکاری ملازمتیں ہی دی جاتی تھیں۔ ہندوستانی خیال کرتے تھے کہ یہ بے انصافی ہے۔ بے انصافی نہیں تو ظلم ضرور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ظلم تو اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔ ہاں یہ ظلم قدرت کی جانب سے تھا۔ اس میں انگریزی حکومت کا کوئی قصور نہ تھا۔ لیکن جس کا اعتمادِ نفس مجروح ہو جائے وہ اپنے درد و کرب کے زیرِ اثر سب سے پہلے اُسی شئے پر حملہ کرتا ہے جو سامنے نظر آ رہی ہو، اور جو اُس کے مصائب کا قریبی سبب ہو۔

اِس جدید نظامِ تعلیم کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ معدودِ چند افراد تو بالکل مغرب زدہ ہو گئے۔ اُنہیں اپنے مشرقی رشتہ دار اور دوست ایک بارِ گراں نظر آتے تھے۔ اِن کے مقابلہ میں ایک بڑی تعداد کی مغرب پرستی کا حال یہ تھا کہ آدھے تیتر اور آدھے بٹیر۔ جوں جوں کسی طبقہ میں مغربی تمدّن زیادہ اثر کرتا، توں توں مغرب اور مغربی اقتدار کے خلاف اُس کی نفرت و حقارت ترقی کرتی جاتی۔

اس نظامِ تعلیم کا نقص یہی نہ تھا کہ تمدّنی مغائرت پر زور دے کر نسلی منافرت پھیلائی جا رہی تھی بلکہ اُستاد بھی ایسے تھے کہ اُن کے

زیرِ اثر شاگرد حکومتِ ہندوستان سے مزید بیزار ہو جاتے تھے۔

غلاموں کو آزادی کی تعلیم راس نہیں آتی

یہ نظامِ تعلیم انگریزی تمدّن کا خوشہ چین تھا، یعنی اس میں لبرل اور وِہگ پارٹیوں کے اعتقادات کا اثر غالب تھا۔ نسلی تفوّق، استبداد، اور دفتری حکومت کی مذمّت کی جاتی تھی۔ جو نظامِ تعلیم ایسے تمدّن پر مبنی ہو اُس سے بآسانی ایک اور کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ تعلیم کو ایک موہوم ہمدردئ انسانیت، الحاد، اور تخریبی اعتقادات کے پرچار کا ذریعہ بنا لیا جائے، اور اِس حرکت کو جمہوریّت و خود اختیاریّت کی تبلیغ کا نام دیا جائے۔ اہلِ مشرق ایسے مذموم اعتقادات کو پسند نہیں کرتے۔ اِن اعتقادات کو ماننے والے ہمیشہ سے شہنشاہوں یا اللہ کے نام پر ہتھیار اُٹھانے والوں کی تلوار کا شکار ہوتے چلے آئے ہیں۔ حکومتِ ہند اور برطانوی حکومت کو دقّت یہ تھی کہ جب کوئی ذہین گریجویٹ سوال کرتا تھا کہ آپ کس حق کی بنا پر ہمیں اپنا غلام بنائے بیٹھے ہیں، اگر آپ کا دعوائے حکومت اپنے تمدّن کی برتری پر مبنی ہے تو خود آپ کا تمدّن غلامی کا مخالف ہے، تو اِس کے جواب میں حکومتِ ہند اور حکومتِ برطانیہ سوائے ڈنڈے کے استدلال کے اور کوئی جواب نہ دے سکتے تھے۔

اگر اُستادوں کا انتخاب ٹھیک طور پر کیا جاتا تو شاید بہت سی مشکلات پیدا نہ ہوتیں۔ لیکن اُستاد بھی حکومت کے خیر خواہ نہ تھے۔ حکومت تعلیم کو اُس احترام کی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی جس کی وہ مستحق تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت اساتذہ کے انتخاب کی کوئی نگرانی نہ کرتی تھی، اور نہ ہی اساتذہ مقرر ہو جاتے تھے تو اُن کے طریقۂ تعلیم کی کوئی پڑتال کی جاتی تھی۔ محکمۂ تعلیم کے کئی افسر اچھے خاصے قابل لوگ تھے۔ اگر وہ چاہتے تو بآسانی آئی۔ سی۔ ایس کے افسر بن جاتے۔ باوجود اِس کے جب وہ ہندوستان پہنچتے تو دیکھتے کہ اُن کی کسی کو پروا نہیں۔ اُن کی تنخواہیں قلیل تھیں۔ اُن سے اس طرح سلوک کیا جاتا تھا گویا وہ کسی ادنیٰ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اِس سلوک سے خوش نہ ہوتے تھے۔ اُن کی اِس دلی ناراضگی کی جھلک اُن کی تدریس میں بھی پائی جاتی تھی۔ اس کی حکومت کو کچھ پروا ہی نہ تھی۔ حکومت کو تو اپنی غیر جانبداری پر ناز تھا۔ حکومت نے یونیورسٹیوں کو آزاد چھوڑ رکھا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کئی کالج باغیانہ پراپیگنڈا کا مرکز بن گئے۔

اعمال کی نسبت اعتقادات کی نگرانی زیادہ ضروری ہے

جمہوری حکومتیں بالعموم اس قسم کی غلطی نہیں کرتیں۔ یہ لغزش تو استبدادی حکومتوں سے سرزد ہوا کرتی ہے۔ اس لغزش کی وجہ یہ

ہوتی ہے کہ استبدادی حکومت صرف اعمال پر نگاہ رکھتی ہے خیالات
سے غافل رہتی ہے۔ ہندوستان میں نظامِ حکومت استبدادی تھا۔
یہی وجہ تھی کہ حکومتِ ہند ہر قسم کے خیالات اور اعتقادات سے
رواداری برتنے کی عادی ہو چکی تھی۔ حکومت مطمئن تھی کہ اگر ان خیالات
اور اعتقادات کے باعث کوئی خلاف قانون حرکت سرزد ہوئی
تو ہمیں سزا دینے کا بہر صورت اختیار ہے ہی۔ اسی وجہ سے یا تو
حکومت ایسے خیالات کی اشاعت کو روکنا ضروری نہ سمجھتی تھی،
یا شاید اس میں ان کو روکنے کی استعداد نہ تھی۔ اب وقت یہ تھی
کہ باغیانہ خیالات اور اعتقادات بھی ایسے نہ تھے جن کے نتائج
ضرور قانون کی نگاہ میں مجرمانہ ہی ہوتے۔ ان اعتقادات اور خیالات
کے اثر سے بالآخر باغیانہ اعمال تو ضرور سرزد ہوتے تھے لیکن وہ باغیانہ
اعمال ایسے تھے کہ اگر ملکی قانون کی نگاہ میں مستوجبِ سزا ہوں بھی
تو دنیا کی نگاہوں میں مجرمانہ نہ تھے، بلکہ حب الوطنی کا نتیجہ سمجھے جا سکتے
تھے۔ پھر جب بغاوت، حب الوطنی پر مبنی ہو، اور حریت کا نعرہ بلند
کیا جائے تو ایسی یلغار کی کامیابی میں کیا شک رہ جاتا ہے۔

اس تمام کارروائی کا نتیجہ یہ تھا کہ ایسے ہندوستانیوں کا ایک
کثیر التعداد طبقہ وجود میں آ رہا تھا جو حکومت سے نفرت کرتے تھے،

اس نفرت کا باعث کسی حد تک یہ تھا کہ حکومت انہیں ایک ایسا تمدّن قبول کرنے پر مجبور کر رہی تھی جو اُن کی رائے میں زہریلا تھا پھر یہ تمدّن قبول کر لینے کے باوجود بھی اُن کو حاکم قوم اپنا مساوی تسلیم نہ کرتی تھی۔ اس حقارت کی کچھ وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کو اس منافقت پر غصّہ آتا تھا کہ ایک طرف تو آزادی اور جمہوریت کے راگ گائے جاتے ہیں، اور دوسری طرف اُن کو ایسے حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے جو حرّیت اور جمہوریت کا لازمی تقاضا ہیں۔

عدالتیں مجرموں کی طرفدار بن گئیں

حکومت کے ادنٰے ملازمین اکثر اِسی طبقہ سے چنے جاتے تھے، اور کئی اعلٰی گماشتے بھی انہیں ہی سے مقرّر ہوتے تھے۔ عدالتوں کے جج اسی طبقہ سے منتخب ہوتے تھے۔ اسکولوں اور کالجوں پر تو اُن کا قبضہ تھا۔ وکیل سارے کے سارے اِسی صف میں شمار کرنے چاہئیں۔ اخبارات پر بھی اُنہیں کا تسلّط تھا۔ وہ انگلستان میں اپنے خیالات کے اظہار کے لئے آواز پہنچانے کی طاقت رکھتے تھے۔ اِس طبقہ کی مجموعی طاقت کے سامنے حکومت کے پاس مقابلہ کرنے کا کوئی ہتھیار نہ تھا۔ حکومت اِس معاملہ میں دماغی اور مادی دونوں لحاظ سے دیوالیہ تھی۔ اِس طبقہ کو پنڈت جی

کا آلۂ کار سمجھنا چاہیئے۔

ایک اور محکمہ بھی ایسا تھا جس کی اہمیت کو نظر انداز کیا گیا۔ یہ عدالت کا محکمہ تھا۔ حکومت عدالتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ ملکی آئین اور ہائیکورٹ کے اختیارات کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ہائیکورٹ کے نیچے ہر ضلع میں ایک ڈسٹرکٹ جج ہوتا تھا۔ یہ جج آئی۔ سی۔ ایس کا کوئی افسر ہوتا تھا۔ اس سے نیچے کی عدالتوں کا نظام یہاں بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ضلع کے کلکٹر کے ماتحت کئی مجسٹریٹ ہوتے تھے جن کو پولیس کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ مجسٹریٹوں کی عدالت سے سیشن جج یعنی ڈسٹرکٹ کورٹ میں اپیل کی جا سکتی تھی۔ ڈسٹرکٹ کورٹ کی اپیل ہائیکورٹ میں ہوتی تھی۔ حکومت کے خلاف مقدمات یا تو ڈسٹرکٹ کورٹ میں پیش ہوتے تھے، یا ہائیکورٹ کے سامنے۔ اہم فوجداری مقدمات ضلع کی عدالت یا ہائیکورٹ میں فیصلہ کئے جاتے تھے۔ دیوانی جج بالعموم ایسے لوگ ہوتے تھے جو نظم و نسق کے ناقابل ثابت ہو چکے ہوں۔ محکمۂ عدالت کو ایک ایسی عذاب کی بستی سمجھا جاتا تھا جہاں مجرموں کو سزا دینے کے لئے بھیجا جائے۔ جو شخص وہاں ایک مرتبہ بھیج دیا جائے پھر وہ حکومت کی نگاہ سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو جاتا تھا۔ نہ تو اُسے

انعامات ملتے تھے، نہ اُس پر اعزاز کی بارش ہوتی تھی۔ اس میں تو شک نہیں کہ حکومت کے اعزاز و انعام سے محروم رہنا عدالتوں کی غیر جانبداری کے حق میں مفید تھا۔ لیکن اِس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا تھا کہ عدالتیں انتظامی حکومت سے بے تعلّق ہو جاتی تھیں۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ محکمۂ انصاف نے اوپر سے لے کر نیچے تک اِس اصول پر عمل کرنے کا تہیّہ کر رکھا ہے کہ عدالت ہر مسئلہ میں دخل دے سکتی ہے۔ یہ اصول اُن ایّام کی یادگار تھا جب وہگ پارٹی برسرِ اقتدار تھی۔ اُن دنوں قانون سازی تو کبھی کبھار عمل میں آتی تھی اکثر مختلف پارٹیوں کے تنازعوں کا فیصلہ عدالت میں ہوتا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں عدالتوں کی یہ غیر جانبداری غنیمت شمار کی جاتی تھی کہ جو کوئی بھی قانون کی زد میں آجائے اُسے شکنجہ میں کس دیا جائیگا، چاہے قانون کتنا ہی بوسیدہ کیوں نہ ہو چکا ہو۔ اور جو شخص قانون کی مدد سے اپنی اصطلاحی بریّت ثابت کر دے اُس کو چھوڑ دیا جائیگا، چاہے اُس نے کتنا ہی بھاری گناہ کیوں نہ کیا ہو۔

ہندوستان کی عدالتیں قانون کی تشریح کرنے میں وہ بال کی کھال نکالتی تھیں کہ بڑے بڑے مجرم بلوہ چھوٹ جاتے تھے، اور حکومت کے بڑے بڑے افسروں کے اعمال کی بھی نگرانی رکھی

جاتی تھی۔ جو افسر اپنے قانونی اختیارات سے تجاوز کرے اُس کے خلاف بھاری ہرجانے کی ڈگری دے دی جاتی تھی۔ کئی بے گناہ بھی اس طریقۂ انصاف سے کُشتہ ہو گئے۔ حکومت کے افسروں کے خلاف حکمِ امتناعی جاری کر کے اُن کو اپنے انتظامی اختیارات استعمال کرنے سے بارہا باز رکھا جاتا تھا۔

عدالت اور حکومت میں آنکھ مچولی

یوں تو عدالتوں کا یہ دستور ایک استبدادی حکومت کو قابو میں رکھنے کے لئے قابلِ تعریف ہے، چاہے وہ استبدادی حکومت کتنی ہی نفع بخش اور دانشمند کیوں نہ ہو۔ لیکن ہندوستان میں عدالت اور حکومت کی اس کھینچا تانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اچھا خاصا آنکھ مچولی کا کھیل شروع ہو گیا۔ ایک طرف حکومت قانون بنا بنا کر عدالتوں کو پابند رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ دوسری طرف عدالتیں اِسی قانون کے حلقہ سے پھدک کر باہر نکلنے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اِس قسم کا کھیل خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ فرض کیا جائے ملک کی پارلیمنٹ حکومت کی اندھا دھند حمایت سے انکار کر دیتی ہے۔ اس فیصلے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حکومت کے اختیارات ناکافی رہ جاتے ہیں، اور اب اِن اختیارات میں توسیع کی گنجائش

بھی نہیں۔ فرض کیجئے عدالتوں میں ایسے جج مقرر ہو جاتے ہیں جو حکومت سے خالی سیاسی اختلاف ہی نہیں رکھتے بلکہ سرے سے سلطنت کے دشمن ہیں۔ نتیجہ یہی ہوگا کہ انتظامی حکومت کے ہاتھ پاؤں بالکل بندھ جائیں گے۔ ہندوستان کے ایک صوبہ میں تو آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بغاوت یا کسی سیاسی مجرم کی پاداش میں کسی مجرم کو سزا دلوانا ناممکن ہے۔ فرض کیجئے یہ مرض باقی صوبوں میں بھی پھیل جائے، اور اُس کے ساتھ ہی مرض کی نوعیّت بھی شدید تر ہو جائے۔ ایسی صورت میں انجام کیا ہوگا۔ ہائیکورٹ اور ڈسٹرکٹ کورٹ دونوں میں ہندوستانی بھرتی کئے جا رہے تھے، اور یہ وہ ہندوستانی ہوتے تھے جو اکثر حکومت کے خلاف ایک طبعی رجحان رکھتے تھے۔ یہ لوگ فاضل تھے، لائق تھے رشوت نہ لیتے تھے، جہاں تک انسان کے بس میں ہے غیر جانبدار بھی تھے۔ لیکن ہمیشہ اور ہر جگہ تو ایسا نہیں ہوتا۔

انگریزی دستور کی پیروی کرتے ہوئے جج وکیلوں میں سے چنے جاتے تھے۔ یہ دستور سوائے اینگلوسیکسن اقوام کے دنیا میں اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ وکیلوں کا حال یہ تھا کہ اُن میں اکثر پنڈت جی کے مرید تھے، یا ہمدرد۔ ابھی وہ زمانہ تو نہ آیا تھا کہ عدالت کی کرسی

پر کسی گورے جج کو بیٹھنے ہی نہ دیا جاتا، لیکن وہ زمانہ قریب ضرور آرہا تھا۔ اُسی راجہ کی حماقت میں کیا شک ہو سکتا ہے جو انصاف کا محکمہ اپنے دشمنوں کے سپرد کردے۔

ہندوستان کی باغیانہ صحافت

ہندوستان کی بدقسمتی ہے کہ وہاں کی صحافت باغیانہ ہے اور ہمیشہ سے باغی رہی ہے۔ اِس جرم کی ابتدا انگریزوں ہی نے کی تھی۔ ہسٹینگز کے زمانہ میں بعض چیتھڑے جس فحش کلامی کے مرتکب ہوتے تھے، اُس کی مثال تو شاید دنیا میں کہیں نہ ملے گی۔ اس کے بعد ایک دور ایسا آیا کہ حکومت کی پیشانی پر بل پڑنے کے ساتھ ہی گنہگار اخبار نویس کو جلاوطن کر دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی فضا میں کوئی باوقار صحافت پرورش نہ پا سکتی تھی۔ اِس کے بعد ایک ایسا عہد آیا جب اخبارات پر سنسر شپ کی سخت پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ جب ذرا ذمّہ دار قسم کے انگریزی اخبارات ملک میں رونما ہوگئے تو یہ پابندیاں دور کر دی گئیں۔ یہ ذمہ دار اخبارات بھی حکومت کے خلاف تھے اگرچہ اِن اخبارات کے نامہ نگاروں میں اکثریت سرکاری ملازمین کی تھی۔ ہجو ہمیشہ قصیدہ سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ انسان کی خصلت ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کی تعریف

کے بجائے اُن کی بدگوئی کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔یہی وجہ تھی کہ حکومت کے خلاف تحریریں اخبارات کی بکری میں مدد دیتی تھیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کے خلاف مراسلات کثیر تعداد میں موصول ہونے لگے۔ہندوستانی اخبارات نے بھی اسی عادت کی تقلید شروع کردی۔جب انگریزی اخبارات پر سے پابندیاں اُٹھائی گئیں تو ہندوستانی اخبارات کو بھی اِن پابندیوں سے آزاد کر دیا گیا۔بعض ہندوستانی اخبارات بھی اچھی شہرت رکھتے تھے لیکن اکثر ہندوستانی اخبارات تو گندے اشتہارات چھاپ کر، یا بُرا بھلا کہنے سے رقمیں وصول کر کے، زندہ رہتے تھے۔قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے یہ اخبار خبریں نہ چھاپتے تھے جن کی قیمت مہنگی تھی، بلکہ حکومت کے خلاف زہریلی اور طویل تنقیدات شائع کی جاتی تھیں۔یہ تنقیدات لکھنے والے بھی بیشتر سرکاری افسر ہی ہوتے تھے۔اخبارات کا مالک اکثر ایڈیٹر اور پرنٹر بھی خود ہی ہوتا تھا۔رپورٹر کے فرائض بھی وہ بغیر کسی کی امداد کے سرانجام دے لیتا تھا۔وہی مقالہ نگار بھی ہوتا تھا، اور خود ہی اپنے دفتر کا چپراسی بھی! بالعموم وہ ایک ایسا لکھا پڑھا شخص ہوتا تھا جس نے سرسری تعلیم حاصل کی ہو لیکن اُس کی قابلیت اتنی نہ ہوتی تھی، نہ اُسے اتنا رسوخ حاصل ہوتا تھا

کہ کوئی سرکاری ملازمت حاصل کر سکتا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا، ہندوستانی اخبارات کے صفحات ہتکِ عزت، تلقینِ بغاوت کرنے اور ترغیب قتل دینے والی تحریروں سے پُر ہوتے گئے۔

حکومتِ ہند پراپیگنڈا کے فن سے جاہل تھی

اِن جاہلانہ اور بدنیتی پر مبنی تحریروں کو حکومت پہلے تو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی رہی، بلکہ کسی حد تک اِن سے لطف اندوز بھی ہوتی رہی۔ اِس کے بعد بڑی سُستی سے حکومت نے خطرہ کا احساس کیا اور ہندوستانی اخبارات کو قابو میں رکھنے کے لئے ایک خاص قانون بھی منظور کیا۔ اس قانون نے جادو کا سا اثر دکھایا۔ بغاوت کی کُھلی تلقین اور قتل و غارت کو مقدس فرض بیان کرنے کی مہم تو فوراً بند ہو گئی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نئے حاکموں نے یہ قانون ہی اڑا دیا۔ عذر یہ بیان کیا گیا کہ اِس قانون کی اب ضرورت باقی نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ چونکہ آج تک کسی نے انگلستان کے خزانہ کو نقب لگانے میں کامیابی حاصل نہیں کی لہذا اِس خزانہ کے گرد جو پہرے دار کھڑے ہیں اُن کو ہٹا دینا چاہیئے۔

میں یہاں اِس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ آزادیٔ صحافت کے کیا فائدے ہیں۔ حریت کے حق میں جو دلائل دیئے جا سکتے ہیں، میں

اُن سے واقف نہیں۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ آزادیٔ صحافت اور استبدادی حکومت دونوں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ میں یہ بھی ضرور کہوں گا کہ آزادیٔ صحافت اور غیر ملکی حکومت کا جوڑ کچھ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ استبدادی حکومت کو ترک کر دیا جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غیر ملکی حکومت کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ غیر ملکی تسلط بھی قائم رہے، استبدادی حکومت بھی برقرار رہے، اور اس کے ساتھ ہی آزادیٔ صحافت میں بھی فرق نہ پڑے۔ ہندوستان کے متعلق تو یہ بحث محض کتابی ہے کیونکہ وہاں تو کوئی ملکی راج بھی ایک لمحہ کے لئے سرکار پر نکتہ چینی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

حکومت نے اخبارات کو سنسرشپ سے تو آزاد کر دیا، لیکن یہ اختیارات اپنے پاس محفوظ رکھے کہ بغاوت، قتل، جرمانہ ہتکِ عزت، اور اس قسم کے دوسرے جرائم کا ارتکاب کرنے والوں پر مقدمہ چلایا جائے۔ اِن اختیارات کو استعمال کرنے کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی تھی جب کبھی کھلی عدالت میں باقاعدہ مقدمہ چلایا جائے تو اس گنہگار اخبار کو خوب شہرت ملتی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ مقدمہ اخبار کے حق میں جاگیر کے عطیہ سے کم

مفید نہ ہوتا تھا۔ مقدمہ کے دوران میں اُن اعتقادات کی بھی خوب تبلیغ ہو جاتی تھی جن کی وجہ سے مقدمہ چلایا گیا تھا۔ بڑی بات یہ ہے کہ جرم کتنا بھی سنگین کیوں نہ ہو، عدالتیں سزا شاذ و نادر ہی دیتی تھیں۔

حکومت چاہتی تو ایک تیسرے ہتھیار سے بھی کام لے سکتی تھی۔ لیکن اِس ہتھیار سے کبھی کام نہ لیا گیا۔ حکومت مخاصمانہ اور جاہلانہ نکتہ چینی کی ایسی عادی ہو چکی تھی کہ اُسے نکتہ چینی کا جواب دینے کا شوق ہی نہ رہا تھا۔ حکومت سمجھتی تھی کہ کوئی سرکاری اخبار نکال کر اپنے معترضین کو جواب دینا انگریزی جمہوریت کی روایات کے خلاف ہوگا۔ رعایا جاہل تھی، اور آسانی سے اُس کو اشتعال دلایا جا سکتا تھا۔ حکومت کے مخالفین بدترین بہتان تراشتے تھے، اور خطرناک ترین طریقوں سے اشتعال دلاتے تھے، لیکن حکومت نہ تو اِس کا تدارک کرتی تھی، اور نہ کوئی جواب دیتی تھی۔ یہاں پھر وجہ وہی حکومت کا افسوسناک میلان تھا، یعنی "عمل کی پروا کرنی چاہیئے، خیالات پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں"۔ اِس تمام دوران میں مرکزی حکومتِ ہند نے یہ اختیار اپنے ہاتھوں میں رکھا ہوا تھا کہ جب کبھی کسی اخبار پر مقدمہ چلانا ہو تو پہلے مرکز سے اجازت حاصل

کی جائے۔ یہ اجازت بڑی مشکل سے ملتی تھی۔ صوبائی حکومتیں سر پٹخ کر مر جائیں لیکن مرکزی حکومت ٹس سے مس نہ ہوتی تھی۔ کبھی کبھار کسی سرکاری ملازم کو یہ اجازت مل جاتی تھی کہ وہ اپنے خلاف بے بنیاد الزامات اور انتہائی ناشائستہ بہتان تراشیوں کی چارہ جوئی کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ تعلیم یافتہ طبقات میں بغاوت پھیلائی جا رہی تھی۔ جو لوگ خود اخبارات نہیں پڑھ سکتے تھے، اُن کا کوئی نہ کوئی ایسا دوست ہوتا تھا جو مطالعہ کا شوق رکھتا تھا۔ غرض وہ بھی اِس زہر سے محفوظ نہ رہتے تھے۔ شورش پھیلانے کا یہ ایک ایسا اچھا موقعہ تھا کہ پنڈت جی نے اِس کا خیر مقدم کیا۔

حکومتِ ہند سے تاجر بھی مطمئن نہ تھے

ہندوستان کی تجارت پر سے تمام پابندیاں اُٹھا دی گئی تھیں۔ اِس کا نتیجہ یہ تھا کہ تجارت میں بڑی ترقی ہوئی۔ جب اجناس خام کو بڑی بڑی مقدار میں اِدھر سے اُدھر لے جانے کے لئے ذرائع آمد و رفت کی سہولتیں بڑھتی گئیں، تو یہ تجارت اور بھی چمکی۔ مغربی علوم کی امداد سے پٹ سن بھی تجارت کے کام آنے لگی۔ انگریز سوداگروں نے چائے کے باغات لگا دیئے۔ امریکہ

بیں خانہ جنگی شروع ہوئی تو پتہ چلا کہ ہندوستان کی روئی کی کھپت دنیا کی منڈیوں میں بھی ہو سکتی ہے۔ برطانیہ کی دولت میں بڑا اضافہ ہوا۔ یہ دولت ہندوستان کے اندر صنعتیں قائم کرنے پر خرچ کی گئی۔ فرنگی سوداگروں اور گماشتوں کی کثیر تعداد ہندوستان پہنچ چکی تھی۔

اس طرح جو فرنگی ہندوستان میں داخل ہوئے، اُن کی کثیر تعداد اسکاٹ لینڈ کے انقلابیوں پر مشتمل تھی۔ وہ بدل و جان حکومت کے دشمن تھے۔ اُنہیں اوّل تو یہ شکایت تھی کہ حکومت گلاسگو اور ڈنڈی کے اعتقادات کی پیرو نہیں۔ دوسری شکایت اُنہیں یہ تھی کہ حکومت روشن خیال اور معاملہ فہم فرنگی سوداگروں پر اعتماد نہ کرتی تھی۔ حکومت کے اِس رویّہ کی وجہ یہ تھی کہ کچھ تو یہ روش حکومت کی روایات میں داخل ہو چکی تھی۔ دوسرے حکومت یہ بھی نہ چاہتی تھی کہ ہندوستان میں ایسے فرنگیوں کی تعداد بڑھ جائے جو یہاں کی شہریت اختیار کر چکے ہوں۔ حکومت کو خوف تھا کہ فرنگی نفع کمانے کے شوق میں انفرادی طور پر ہندوستانیوں کو ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنائیں۔ اس طرح سے فرنگیوں اور ہندوستانیوں کے تعلقات کشیدہ ہو جانے کا خدشہ تھا۔ نیل کی تجارت کرنے والے فرنگی سوداگروں نے

اس قسم کی بہت سی دشواریاں پیدا کر دی تھیں۔ بداعتمادی سے بداعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ یورپ سے آنے والے سوداگروں کو بھی حکومت کے خلاف یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ وہ اُن کی جیب کاٹ کر ہندوستانیوں کا گھر بھرنا چاہتی ہے۔ حکومت انفرادی منفعت اندوزی پر جو قیود عائد کرتی تھی، اُنہیں ایک نوکر شاہی کی رجعت پسندانہ پالیسی کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ باہمی دشمنی کی سب سے بڑی وجہ یہ طفلانہ شکایت تھی کہ سوداگر چاہے کتنے ہی امیر کیوں نہ ہوں، اُن کے نام سرکاری محفلوں کی استقبالیہ فہرستوں میں رسمی طور پر درج نہ کئے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ سرکاری تقریبات پر ان سوداگروں کی بیگمات ادنٰے سے ادنٰے سرکاری ملازم کی جورو کے بعد کمرہ میں داخل ہونے پر مجبور ہوتی تھی۔ شرفاء کے سینہ میں بغض و عناد کی جو آگ بھڑک سکتی ہے، اُس کی تپش سے خدا پناہ دے۔ روما کے سرداروں کی تاریخ تو آپ کو یاد ہی ہوگی۔ غرض ہندوستان میں بسنے والے یورپین حکومت سے ناراض تھے اور اُس سے بدلہ لینے کو ہمیشہ آمادہ رہتے تھے۔ دوسری طرف یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اِن لوگوں کی بعض حرکتیں ایسی تھیں جن کے باعث ہندوستان میں فرنگیوں کے وقار کو صدمہ پہنچتا تھا۔

ایک مچھلی سارا جل گندہ کرتی ہے

جب کسی برادری کی تعداد بڑھ جاتی ہے تو اُس میں کچھ کالی بھیڑیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک دغا باز دیوالیہ، کوئی جعلساز، کوئی بیمہ کے نام پر دھوکہ دے کر روپیہ اکٹھا کرنے والا، کوئی پٹہ باز، کسی ایسی قوم کو بدنام کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے جس کے باشندے عام طور پر دیانتدار ہوں۔ جب ہندوستانی انگریزوں کے اِس دعوے پر غور کرنے کے لئے بیٹھتے تھے کہ چونکہ انگریزوں کا اخلاق بہتر ہے اِس لئے حکمرانی اُنہیں کو زیب دیتی ہے، تو ایسے موقعوں پر بد اخلاقی کا ارتکاب کرنے والے ایسے ہی یورپینوں کی مثالیں بڑھا چڑھا کر بیان کی جاتی تھیں۔

مذکورہ بالا امور کے علاوہ ہندوستان میں سوداگروں کے اِس نئے گروہ کو بعض ایسی شکایات بھی تھیں جو اُن کی نگاہ میں بے اطمینانی کی معقول وجہ ہو سکتی تھیں۔ اِن سوداگروں کا روپیہ کپڑے کے کارخانوں میں لگا ہوا تھا۔ دھاگہ بننے اور کپڑا بنانے دونوں لحاظ سے اِن کارخانوں کو مانچسٹر سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ ہندوستان مدّت دراز سے مانچسٹر کی تیار کردہ اشیاء کی منڈی چلا آتا تھا۔ اِس میں کیا تعجب ہے کہ مانچسٹر اپنی منڈی ضائع نہ کرنا

چاہتا تھا۔ عیسائیت کے اصول اور کابڈن کے رائج کردہ اصول، دونوں کے دونوں ہندوستان کی نوزائیدہ صنعت کو تباہ کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ لیکن انہیں دونوں اصولوں کا تقاضا یہ بھی تھا کہ ہندوستانی صنعت کو ترقی دینے کے لئے بیرونی مال کی درآمد پر کوئی خاص محصول عائد نہ کیا جائے۔

اِنہیں حالات کی وجہ سے یہ عجیب صورت پیدا ہو چکی تھی کہ حکومت روپیہ کی ضرورت سے مجبور ہو کر ایک طرف تو مچھلی کی کھال اور ہاتھی دانت پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس وصول کرنے کی فکر میں تھی۔ اور دوسری طرف جن اجناس کی درآمد بڑی مقدار میں ہوتی تھی وہ ٹیکس سے بری تھیں۔ جب اسی نوعیت کی ضرورت سے مجبور ہو کر برطانوی حکومت کو مانچسٹر کے کارخانوں کی تیار کردہ اشیاء پر محصول لگانے کی اجازت دینی پڑی، تو ساتھ ہی یہ حکم بھی دے دیا گیا کہ ہندوستانی کارخانوں کی تیار کردہ اشیاء پر بھی اُتنا ہی ٹیکس لگا دیا جائے۔ اِس اقدام سے ایک طرف تو ہندوستانی کارخانہ داروں کی آن کو بٹہ لگتا تھا۔ دوسری طرف اُن کے نفع پر بھی بہت بُرا اثر پڑتا تھا۔ سیاسی طور پر بیدار ہندوستانیوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کو وہ اقتصادی آزادی بھی حاصل نہیں جو انگلستان

کے معمولی مقبوضات، مثلاً نیو فاؤنڈ لینڈ یا فاک لینڈ کو حاصل ہے۔ اگر برطانوی مال کی درآمد سے عام باشندوں کو اور خاص طور پر غریب کسانوں کو سستا کپڑا مل جاتا تھا، تو اس کی سیاسی طور پر بیدار ہندوستانیوں کو کیا پروا تھی۔

ہندوستان کو صنعت سازی راس نہ آئی

ہندوستانی صنعتی کاروبار چلانے کے کچھ زیادہ اہل ثابت نہ ہوئے۔ بہت سی لیمیٹڈ کمپنیاں بنادی گئیں۔ ان کمپنیوں کے انتظامات ہندوستانی گماشتوں کے سپرد کر دیئے گئے۔ ہندوستان کے رواج کے مطابق ان گماشتوں کو ایسے وسیع اختیارات حاصل ہوتے تھے جن کے نتائج زیادہ اچھے نہیں نکلے۔ اکثر اوقات یہ گماشتے فراہم کردہ سرمایہ کو اندھا دھند سٹہ بازی پر ضائع کر دیتے رہے۔ اگر سٹہ کامیاب ہو جاتا تو بیشتر منافع گماشتے کی جیب میں چلا جاتا تھا۔ اگر گھاٹا پڑ جاتا تو اس کا بوجھ کمپنی کے حصہ داروں اور قرضہ داروں کے سر پر پڑتا۔ نتیجہ یہی نکلا کہ کاروبار میں چاروں جانب ابتری پھیل گئی۔ ہندوستان میں سرکار کو ایک ایسی مافوق العادت اور عقل کل طاقت سمجھا جاتا ہے جو سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس لئے جب کبھی کوئی ایسی مصیبت آ جائے جس سے باشندوں کی کثیر

تعداد کو نقصان پہنچے تو ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ سرکار اپنے فرائض ادا کرنے میں قاصر رہی ہے۔

اِن صنعتی انقلابات کے باعث کئی کاروبار برباد ہو گئے۔ ہندوستان ابھی تک ایک ایسا ملک تھا جس میں ہاتھ سے کام کرنے والے دستکاروں کی اکثریت تھی۔ کئی دستکار طبقات کی حالت تو اب قابلِ رحم بن چکی تھی۔ خاص طور پر جلاہوں کا بُرا حال تھا۔ ملک سے باہر اُن کے مال کی منڈی عرصہ ہوا اُن پر بند ہو چکی تھی۔ اب ملک کے اندر بھی اُن کے مال کی کھپت کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ بیرونی کپڑوں کے کارخانوں اور ملکی کپڑے کے کارخانوں، دونوں کے مقابلہ کے باعث غریب بافندوں کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نہ ملتی تھی۔ ذات پات کے رواج کے باعث وہ کوئی نیا پیشہ بھی اختیار نہ کر سکتے تھے۔ اُن کی زندگی زبوں حالی میں کٹ جاتی تھی۔

صنعتی مزدوروں سے پیدا ہونے والے سیاسی خطرات

اوّل تو حکومت اُن کی کوئی خاص امداد نہ کر سکتی تھی۔ دوسرے ایسی امداد کی کوئی کوشش کی بھی نہ گئی۔ یہ غریب لوگ بیرونی غلامی کی وجہ سے مصائب کا شکار نہ تھے، بلکہ اُن کے مصائب کے اسباب بھی وہی تھے جن کے باعث اُنہیں بیرونی غلامی

قبول کرنی پڑی تھی۔ غریب عوام ابھی باغی نہ ہوئے تھے۔ البتہ یہ توقع ضرور تھی کہ اگر فاقہ کشی اسی طرح پھیلتی رہی تو ایک دن بازاروں میں کشت و خون کرنے کے لئے منچلوں کی کمی نہ رہے گی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی معاشرت میں ایک نیا طبقہ بھی پیدا ہو رہا تھا، یعنی بڑے بڑے کارخانوں کے مزدور۔ وقت آنے پر انہیں بھی آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ کارخانوں کے مزدور ملک کی آبادی کے پست ترین طبقات میں سے بھرتی کئے جاتے تھے۔ یہ لوگ گاؤں میں ذات پات اور سماج کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اب انہیں گاؤں سے یکلخت نکال کر کسی ایسے بڑے شہر میں پھینک دیا جاتا تھا جہاں پر وہ مادر پدر آزاد ہوتے تھے۔ یہاں انہیں جو تنخواہ ملتی وہ اُن کے معیارِ زندگی کے لحاظ سے گراں بہا تھی۔ یہیں انہیں شراب نوشی اور دوسری عاداتِ بد کی لت بھی پڑ جاتی تھی۔ منیجر اور داروغہ اُن پر ظلم کرتے تھے۔ شہر کے جن گھٹیا محلوں میں وہ رہائش پر مجبور تھے، وہاں کے مالکانِ مکانات انہیں سونے کا انڈا دینے والی مرغی خیال کرتے تھے۔ اگر یہ مزدور بالکل اخلاق باختہ نہ ہو گئے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اوّل تو ہندوستانی طبعاً پابندِ اخلاق اور پیروِ مذہب ہوتے ہیں

ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اُن کا اخلاق اور مذہب ایک خاص ڈھب کا ہے۔ علاوہ ازیں یہ مزدور صنعتی شہروں میں مستقل طور پر رہائش بھی نہیں رکھتے تھے وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنے روابط بدستور قائم رکھتے زندگی میں اُن کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی تھی کہ کارخانہ سے کافی روپیہ کما کر اپنے چھوٹے سے گاؤں میں واپس لوٹ جائیں اور پھر وہاں زمین خرید کر زندگی بسر کریں جتنی دیر وہ بمبئی یا کانپور میں قیام رکھتے تھے، وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے تھے۔ وہاں اُن کی کوئی برادری یا قوم نہ تھی۔ وہ ایک بڑے ہجوم کے سیلاب میں ایک بے حقیقت قطرے سے زیادہ کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ اِس لئے اُن کو بھڑکا کر مشتعل کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ غرض ہندوستان میں کارخانہ داری کا نظام پھیلنے سے پنڈت جی کے ہاتھ میں ایک ایسی فوج آگئی جسے بازاروں میں لڑانے کے لئے خوب استعمال کیا جا سکتا تھا۔ پنڈت جی کو اس امر کی کچھ پروا نہ تھی کہ مزدوروں کو کس مقصد کے لئے لڑایا جائے، اور وہ کسی کو مار ڈالیں، یا خود مر جائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر مزدور اس جھگڑے میں مارے جائیں تو پنڈت جی زیادہ خوش تھے۔ اگر کسی کارخانہ کے یورپین افسروں کو قتل کر دیا جاتا تو شاید برطانیہ کے مزدور لیڈر بھی ناراض ہو جاتے۔ برعکس اِس کے اگر

کارخانہ کے مزدوروں کا سرکار کے ہاتھوں قتلِ عام ہو جائے
تو اُس کو ظلم ظاہر کر کے شور مچانا زیادہ آسان ہو گا۔

ہندوستان میں ایک نیا معاشرتی انقلاب

اِن سیاسی اور صنعتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ایک معاشرتی انقلاب رونما ہو رہا تھا۔ کئی انگریز سیر کرنے ہندوستان آتے تھے، اور کئی ہندوستانی انگلستان جاتے تھے۔ کوئی سیر و تفریح کے لئے جاتا تھا۔ کوئی تعلیم حاصل کرنے اور کوئی سازشیں کھڑی کرنے۔ دونوں قومیں ایک دوسرے سے آشنا ہوتی جا رہی تھیں۔ جب دو قومیں ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو میل ملاپ کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ آپس میں نفرت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ پہلے پہل جب انگلستان آنے والے ہندوستانی اِکّا دُکّا ہوتے تھے، تو اُن کو اُسی دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا جیسے کسی شیر یا کسی پالتو جانور کو دیکھا جاتا ہے لیکن جلد ہی خیالات میں انقلاب آیا، اور ہندوستانیوں کو ایک قسم کی نیچ ذات سمجھا جانے لگا۔ انگلستان میں اہلِ ہندوستان بھی یا تو دوسرے ہندوستانیوں سے ہی ملتے جلتے تھے، اور یا انہیں یورپین قوموں کے ایسے طبقات سے رابطہ قائم کرنے کا اتفاق ہوتا تھا، جو کچھ زیادہ قابلِ تعریف نہ تھے۔ جو ہندوستانی

انگلستان پہنچتے تھے وہ اُن تخریبی خیالات کا بھی شکار ہو جاتے تھے جو دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں وباء کی طرح پھیلے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ہندوستانی برطانیہ جاکر واپس آ بھی جاتا تھا تو اُس کا سینہ انگریزوں کے خلاف خاص طور پر، اور مغربی تہذیب کے خلاف عام طور پر بغض اور کینہ سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔

دولت ستار العیوب ہے

انگلستان کی سوسائٹی میں دولت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہاں کسی نئی شئے کو دیکھنے، چکھنے، سونگھنے، چھونے، اور سننے کا شوق بھی عام ہے یہی وجہ ہے کہ انگریز سوسائٹی کے بعض حلقے ہر اجنبی کو خیر مقدم کہنے پر آمادہ رہتے ہیں چاہے اُس کی رنگت اور چال چلن کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ دولتمند ہے، خوش مزاج ہے، اور کنجوس نہیں، تو اُس کے آگے پیچھے کی کوئی کرید نہ کی جاتی تھی ہندوستان کے رئیسوں اور نوابوں کو انگلستان کے اعلیٰ حلقوں میں ایسے چوچلوں سے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا جس کی انہیں خود اپنے ملک میں بھی توقع نہ تھی اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ہندوستان کے موجودہ نظام حکومت سے راضی ہو جاتے تھے جب ایک شخص انگلستان کے نوابوں کا دوست رہ چکا ہو، اور اُن کی بیگمات کے ساتھ اختلاط کی محفلوں میں بیٹھ چکا ہو اور اُس کے بعد گورنمنٹ کا کوئی ادنیٰ عہدہ دار اُسے یہ نوٹس لکھ بھیجے کہ آپ اپنی سوتیلی دادی کو زندہ بھوننے کا لطف نہیں اُٹھا سکتے، ورنہ آپ کی سلامی کی توپیں کم کر دی جائیں گی، تو کیا انسان کا دل خون نہیں ہو جاتا؟

علاوہ ازیں ہندوستان میں رہنے والے انگریز مشرق کے تمدّن، لٹریچر، آرٹ، سیاست، مذہب اور معاشرت کو ایسی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس سے تمام پڑھے لکھے اہلِ مشرق بھوچکّے رہ جاتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مغرب کا تمدّن جس کی بابت اتنی ڈینگیں ماری جاتی ہیں، کتنا سطحی، کتنا گھناؤنا اور کتنا چھوٹا ہے۔

اِن تمام اسباب کا لبِّ لباب یہ ہے کہ اِس زمانہ میں مغرب پرستی نے ایسا زور باندھا جس سے مشرق کے کہنہ تمدّن کی چولیں ہل گئیں۔ پہلے پہل تو اِس مغرب پرستی کا خیر مقدم کیا گیا۔ پھر یہ مغرب پرستی گراں گذرنے لگی، اور اُس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جب یہ ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ قدامت پرست طبقات تو مغرب پرستی کے مخالف تھے ہی، لیکن جن طبقات نے مغرب پرستی اختیار کر لی تھی، وہ بھی جلد ہی اِس سے بیزار ہو گئے کیونکہ اُنہوں نے اسے اندر سے چکھّا تو زہریلا پایا۔ اس طرح سے ایک ایسا ردِّ عمل شروع ہوا جس نے قوم پرستی کی شکل اختیار کر لی۔

ہندوستانی قوم پرستی مصنوعی تھی

ہندوستان کی قوم پرستی ایک مصنوعی شئے تھی۔ جب ہندوستان میں کوئی قوم ہی آباد نہیں تو صحیح قوم پرستی کہاں سے پیدا ہو سکتی ہے۔

ہندوستان میں کوئی ایسی قومی روح نہیں جو کوئی مثبت کام کر کے دکھا سکے۔ اس لئے یہ منفی نوعیّت کی قوم پرستی تھی: اس برّصغیر کے باشندے مختلف مذہبوں، نسلوں، اور زبانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ باوجود اِس کے چاہے اُن میں باہم کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں، اُن کے مقاصد میں کتنی ہی تفاوت کیوں نہ ہو، لیکن بعض چیزیں ایسی تھیں جو وہ سب ناپسند کرتے تھے۔

میں ملحد ہوں۔ تم مسلمان ہو۔ فلاں جانوروں کی پوجا کرتا ہے لیکن ہم میں سے عیسائی تو کوئی بھی نہیں۔ میں تعدّدِ ازدواج کا قائل ہوں، تم بیویوں کو ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کی اجازت دیتے ہو۔ فلاں

ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

کا قائل ہے۔ لیکن ہم میں سے کوئی بھی ایک بیوی رکھنے کا تو قائل نہیں۔ میں ٹوپی پہنتا ہوں۔ تم پگڑی باندھتے ہو۔ فلاں ننگے سر رہتا ہے۔ لیکن ہم میں سے کوئی بھی ہیٹ تو نہیں پہنتا۔ میں مرنا قبول کروں گا، لیکن تمہاری حکومت قبول نہ کروں گا۔ تم مرنا قبول کرو گے، لیکن میری حکومت برداشت نہ کرو گے، فلاں مرنا قبول کرے گا، لیکن ہم دونوں میں سے کسی کی حکومت قبول نہ کرے گا۔ لیکن ہم سب موجودہ سرکار سے تو یکساں ہی محروم ہیں۔ کیا ہم یہ نہیں کر سکتے کہ عیسائیوں،

ایک بیوی کے پابند رہنے والوں، ہیٹ پہننے والوں، اور اپنی اجارہ داری قائم رکھنے والوں کے خلاف مل بیٹھیں، اور اپنے اختلافات کا تصفیہ مستقبل پر چھوڑ دیں ؟-

اس طرح سے ایک قوم پرستی کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ جذبہ منفی اور تباہ کن ہونے کے باعث کوئی مثبت تعمیری کام نہ سرانجام دے سکتا تھا۔ قوم پرستوں کی پارٹی مادی وسائل کے لحاظ سے کیسی ہی بے حقیقت کیوں نہ ہو، لیکن ایک اخلاقی اہمیت ضرور حاصل کر سکتی تھی۔ اِس پارٹی کی جڑیں ملک میں مضبوط نہ تھیں۔ اُس کے کہنے پر ایک سپاہی بھی میدان جنگ میں کودنے کو تیار نہ تھا۔ اِس کے خزانے میں ایک پائی نہ تھی۔ سرکار یہ خیال کرتی تھی کہ ایسی پارٹی کی جو حالت ہے، اُس کو اُسی حالت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ سرکار کو یہ علم نہ تھا کہ ایک عقیدہ چاہے وہ منفی عقیدہ ہی کیوں نہ ہو، کتنا خوفناک دشمن ثابت ہو سکتا ہے۔ تعمیری عقائد سے پہلے منفی عقائد ہی رواج پایا کرتے ہیں۔

یہ پارٹی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ سارے ہندوستان میں اِس کا اثر تھا۔ اس پارٹی کی باہمی گفت و شنید کے لئے اب اُن کے پاس ایک مشترکہ زبان بھی تھی، یعنی انگریزی زبان۔ اخبارات

اسکولوں، عدالتوں، وکیلوں، اور سرکاری ملازمین پر اِس پارٹی کا تسلط تھا۔ اِس پارٹی کے تعلقات برطانیہ کی زبردست سیاسی پارٹیوں سے تھے۔ اِس کی مادی طاقت تو کچھ نہ تھی، لیکن رسوخ کافی تھا۔ اگر کچھ کسر تھی تو یہ کہ اِس کی تنظیم بہتر طریقہ سے کر دی جاتی۔

البرٹ بل کے لیئے ایجیٹیشن سیاسی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے

یہاں البرٹ بل کی تاریخ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں جو لوگ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ حکومتوں کو کیا نہیں کرنا چاہیئے، وہ ضرور اِس قانون کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ جھگڑا یہ تھا کہ آیا ہندوستانی عدالتیں یورپین مجرموں کے مقدّمات کی سماعت کر سکیں یا نہ کر سکیں۔ اس تنازعہ سے نسلی منافرت کا مسئلہ بڑی نازک صورت اختیار کر گیا۔ سرکار نے جب دیکھا کہ یورپینوں میں سے ایک گروہ ایک ایسی اصلاح کی مخالفت کرتا ہے جو سرکار کی نگاہ میں لازمی بھی تھی اور منصفانہ بھی، تو سرکار نے روشن خیال ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ وہ سرکار کی حمایت کو سامنے آئیں روشن خیال ہندوستانیوں نے اس مسئلہ میں طبعاً سرکار کی پوری پوری امداد کی۔ سرکار نے اس امداد کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اور سوچا کہ جس طرح سرکار ہندوستان کو آہستہ آہستہ خود مختار کرنا چاہتی ہے، اُس کے لیئے ہندوستانیوں سے ایسی امداد بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں سرکار کو یہ بھی اُمید تھی کہ حکومت کے دوسرے

مسائل میں بھی اسی قسم کی امداد حاصل کرنا ممکن ہے۔

"ہندوستانیوں کو اب یقین ہو چکا ہے کہ ہم اُن کے خیر خواہ ہیں۔ ہندوستانی ذہین ہیں۔ اس لئے اب وہ ہمارا ہاتھ بٹائیں گے ہم دوسرے سرکاری اقدامات کے لئے بھی جمہور کی حمایت حاصل کر سکیں گے۔ اس طرح ہندوستان اور انگلستان دونوں جگہ ہمارے ہاتھ مضبوط ہو جائیں گے۔ حکومت تو استبدادی ہے اور استبدادی ہی رہے گی۔ لیکن یہ ایک ایسا استبداد ہے جسے روشن خیال رائے عامہ کی پروا ہے۔ اور اِس وجہ سے رائے عامہ بھی اُس کی حمایت کمر بستہ ہے"۔ غرض سرکار کی امداد اور ہمدردی سے انڈین نیشنل کانگرس معرضِ وجود میں آئی۔

کانگرس تعلیم یافتہ طبقہ کا کلب تھی

کانگرس پڑھے لکھے ہندوستانیوں کا ایک اجتماع تھی۔ ہر ضلع میں جو لوگ ایک معمولی سا چندہ ادا کرتے تھے، انہیں نمائندگان چننے کا اختیار دے دیا جاتا تھا۔ یہ نمائندگان ہر سال کے بعد چند روز کے لئے کسی بڑے شہر میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ اور بحث و مباحثہ کے بعد چند قرار دادیں منظور کر دیا کرتے تھے۔

جیسا کہ نمائندہ اداروں کا قاعدہ ہے، کانگرس میں بھی اپنے

عام اراکین کے نقائص مبالغہ آمیز شکل میں موجود تھے۔ شاید کچھ افراد ایسے بھی ہوں جن کو مدبّر کا نام دیا جا سکے، لیکن کانگرس کی پالیسی میں کوئی تعمیری عنصر نہ تھا۔ کانگرس کا سارا زور اِس بات پر صرف ہوتا تھا کہ رعایا کی شکایات دور کی جائیں۔ لیکن کانگرس کبھی اُن شکایات کا ذکر تک نہ کرتی تھی جن سے واقعی رعایا نالاں تھی۔ زمینداروں کے کے مقروض ہونے کے متعلّق ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا جاتا تھا۔ دستکاروں کی مشکلات کا کوئی چرچا نہ تھا۔ نہ ہی کوئی عدالتوں کی چیرہ دستیوں کا تذکرہ کرتا تھا۔ کانگرس میں عوام کے نمائندگان کو نہ کوئی دخل حاصل تھا، اور نہ وہاں اُن کی کوئی آواز تھی۔

کانگرس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ سرکار پر مخالفانہ، موہوم، اور منفی نکتہ چینی کرتی رہتی تھی۔ کانگرس کے پاس شکایات کی ایک مستقل فہرست تھی جو ہر سال دوہرا دی جاتی تھی۔ یہ شکایات ایسی نہ تھیں جن کا عوام کے مصائب سے کوئی تعلق ہوتا۔ بلکہ اِن سب شکایات میں قدرِ مشترک یہ تھی کہ وہ ایسے حالات کے خلاف احتجاج کی حیثیت رکھتی تھیں جو بیرونی حکومت کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔

لبرل عقائد سلطنت کی بیخ کنی کر رہے تھے

یہ سب شکائتیں لبرل عقائد کی رو سے بڑی قابلِ تحسین تھیں

بڑا غوغا یہ تھا کہ حکومت اور عدالت کے فرائض مختلف افسروں کو سونپے جائیں۔ عملاً اس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت کو عدالت کے ماتحت کر دیا جائے، اور عدالتیں تو ساری ہندوستانیوں سے بھری ہی پڑی تھیں۔ ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ سول سروس کے اراکین بھرتی کرتے وقت ہندوستان اور انگلستان میں دونوں جگہ بیک وقت امتحانِ مقابلہ منعقد کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انتظاماتِ سلطنت میں یورپینوں کی بجائے آہستہ آہستہ ہندوستانیوں کو عمل دخل حاصل ہو جائے۔ اور اس طرح ایک روز وہ سلطنت کے مالک بن بیٹھیں۔ عام شہریوں کے ہتھیار رکھنے کے متعلق قانون کی تنسیخ یا ترمیم ایک دوسرا مطالبہ تھا۔ دلیل یہ دی جاتی تھی کہ لوگوں سے ہتھیار چھیننا اُن کو بزدل بنانے کے مترادف ہے۔ یہ تخیّل اچھا خاصہ پرلطف اور مضحکہ خیز تھا کہ پڑھے لکھوں کو ہتھیاروں سے لیس کر دیا جائے، تو وہ مسلح پٹھانوں اور روہیلوں کا مقابلہ کر سکیں گے۔ یا یہ کہ پیٹی میں پستول باندھ کر کسی بنئے یا لالہ جی کی بہادری بڑھ جائے گی۔ اس میں تو شک نہیں کہ لوگوں کو ہتھیار میسر آجاتے تو یورپینوں کے قتل زیادہ تعداد میں ہونے لگتے۔ شاید بغاوت کی نوبت بھی آجاتی۔

شراب کی فروخت کے خلاف وہ لوگ احتجاج کرتے تھے جنہوں نے یا تو خود کبھی شراب چکھی بھی نہ ہوتی تھی، اور یا چھپ چھپ کر بے تحاشا شراب نوشی کے عادی تھے۔ مقصد یہ تھا کہ بندشِ شراب سے نیچ ذاتوں میں سرکار کے خلاف جذبہ پھیلے گا۔ کسان ناجائز شراب کی درآمد کریں گے تو بار بار حکومت کے ساتھ اُن کا تصادم ہوگا۔ آبکاری کے ٹیکس سے جمع ہونے والی رقوم سے سرکاری خزانہ محروم ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ اِس طرح سرکار درآمد کی تجارت پر ٹیکس لگانے کو مجبور ہو جائے۔

لوکل سیلف گورنمنٹ کا تجربہ

حکومتِ ہند نے کچھ عرصہ سے لوکل سیلف گورنمنٹ کا تجربہ شروع کر رکھا تھا۔ کمیٹیوں کے کچھ اراکین منتخب ہوتے تھے، اور باقیوں کو ضلع کے حکام نامزد کرتے تھے۔ یہ سلسلہ سارے ہندوستان میں پھیل چکا تھا۔ بڑے بڑے شہروں اور دیہاتی علاقوں میں یکساں اِس کا رواج تھا۔ اِن میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو ٹیکس جمع کرنے اور نظم و نسق چلانے کے اختیارات حاصل تھے۔ ہندوستانیوں کے لئے یہ ایک موقعہ تھا کہ وہ اپنے آپ پر خود حکومت کرنے کی اہلیت ثابت کریں۔ منتخب شدہ اراکین زیادہ تر

کانگرسی نمونہ کے اشخاص ہوتے تھے۔ اِن لوگوں کی روش سے صاف ظاہر تھا کہ ہندوستانی طبائع کے وہ نقائص آج بھی بدستور موجود ہیں جو ماضی میں تمام ہندوستانی حکومتوں کی تباہی کا باعث ہوتے رہے ہیں۔ سب سے بڑا نقص تو یہ تھا کہ یہ لوگ کبھی براہِ راست صاف صاف، اور مستعدی سے کوئی کام سرانجام نہ دیتے تھے۔ رشوت عام تھی۔ اقربا پروری کا بھی رواج تھا۔ عوام کے مفاد کی کسی کو پروا نہ تھی۔ جمہور کے مفاد کو نسلی مفاد اور برادری کے مفاد پر قربان کر دیا جاتا تھا۔ اگر یہ میونسپلٹیاں اور ڈسٹرکٹ بورڈ گرتے پڑتے چلتے رہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کی لگام سرکار کے ہاتھ میں تھی۔

کانگرس اِن اداروں کو کامیاب بنانے پر تو توجہ نہ دیتی تھی۔ البتہ یہ شور مچائے جاتی تھی کہ اِن کے اختیارات میں اضافہ کر دیا جائے اور ضلع کے افسروں کو جو نگرانی کے اختیارات حاصل ہیں ختم کر دینے چاہئیں۔

کانگرس کی ذہنیت تخریبی تھی

حقیقت یہ ہے کہ کانگرس کوئی مفید کام سرانجام نہ دے رہی تھی۔ جو کوئی حکومت سے ناراض ہوتا تھا وہ کانگرس میں آشامل

ہوتا۔ سلطنت کے کونہ کونہ میں جہاں کہیں سرکار کے خلاف کوئی
ادنیٰ یا موہوم بیزاری، بھی پیدا ہوتی، کانگریس اُس کو منظم کرنے
اور اچھالنے کو موجود تھی۔ کانگریس کی طفیل لیڈر ایک دوسرے سے
آشنا ہو جاتے تھے۔ ایجیٹیشن کرنے کے لئے منصوبے باندھے
جاتے تھے۔ بغاوت کا چرچا کیا جاتا تھا۔ عام ممبروں کو جمع کرکے
اُنہیں وہ ترشی ترشائی قرار دادیں سنا دی جاتی تھیں جو اُن کے نام
"پُرمنظور" کی جاتی تھیں۔ اس طرح سے بغاوت کی تحریک کو جمہور
کی امداد حاصل ہونے کا دھوکہ دیا جا سکتا تھا۔ درحقیقت یہ تحریک
بالکل فرقہ وارانہ سی تھی۔ اس کی ابتداء تو یوریشینوں اور پارسیوں
نے کی۔ جلد ہی اِس نے پڑھے لکھے ہندوؤں کی ترجمانی کا منصب
حاصل کر لیا۔ شاذ و نادر ہی اِس میں کوئی مسلمان شامل ہوتا تھا۔
زمیندار اور سوداگر طبقہ کے ہندو بھی اِس سے کوئی سروکار نہ
رکھتے تھے۔ قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ یہ جماعت جو جمہوریت،
ترقی، روشن خیالی وغیرہ وغیرہ کے متعلق ایسے فصیح وعظ کرتی تھی،
اُس کے پروگرام میں معاشرتی اصلاح کا کوئی ذکر نہ تھا۔ کانگریس صرف
حکومتِ ہند کی اصلاح چاہنے والوں ہی کا اجتماع نہ ہونا چاہئے
تھا۔ بلکہ مشرقی تمدن کی اصلاح چاہنے والوں کا مرکز بھی بن سکتا تھا۔

کانگرس ہندو رجعت پسندی کی وکیل تھی

خود کانگرس کے ہندو اراکین تو کچھ ایسے دھرم کے پابند نہ تھے، لیکن اگر حکومتِ وقت ہندوؤں کے توہمات یا اعتقادات میں کوئی معمولی سا دخل بھی دے تو وہ شور مچا دیتے تھے۔ اگر اُن میں سے کوئی شخص صغر سنی کی شادی کی مخالفت کرتا تھا، یا نکاحِ بیوگان کی تلقین کرتا تھا، یا یورپینوں سے ملنے جلنے کا حامی تھا، یا ذات پات کے ظالمانہ اصولوں کو نرم کرنے کے حق میں رائے دیتا تھا، تو اُس کے خلاف چاروں جانب غوغا آرائی شروع ہو جاتی تھی۔ وہی اخبارات جو جمہور کے حقوقِ حریّت کے متعلق ایسے شاندار مضامین شائع کرتے تھے کہ برطانیہ کے مشہور حریّت پسند لیڈر برک کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، اُنہیں اخبارات میں ستی کی حمایت میں بھی مضامین شائع ہو جاتے تھے۔ مغربی اداروں کی تعریف کی جاتی تھی، لیکن مغربی تمدّن کا مذاق اڑایا جاتا تھا، اور اُسے گھناؤنا سمجھا جاتا تھا۔ ایک ہی پرچہ میں "انسانی برادری" اور "انگریزوں کو ملک بدر کرنے" سے متعلق مضامین موجود ہوتے تھے۔

حکومت بالکل خوفزدہ نہ ہوئی۔ کانگرس میں زیادہ تر وکیل شامل تھے۔ اس بات کا کوئی خطرہ نہ تھا کہ اضلاع اور صوبوں میں

وکالت کا دھندا چلانے والوں میں سے کوئی ایسا سورما پیدا ہو جائیگا جو سلطنت کو واقعی ضعف پہنچا سکے گا۔ سرکار نے اس بات کا خیال نہ کیا کہ اسی قسم کے لیڈروں کے ماتحت پیرس کے ہجوم نے انقلابِ فرانس کے دوران میں بسٹائیل کے جیلخانے پر دھاوا بول دیا تھا۔ یہ درست ہے کہ اگر حکومت اولوالعزم ہوتی اور فوج پامردی سے ڈٹ جاتی تو بسٹائیل شاید کبھی فتح نہ ہو سکتا۔ لیکن اس امر کی ضمانت کیا تھی کہ ہندوستان کی فوجیں ہمیشہ پامردی سے ڈٹی رہیں گی۔ یا برطانوی حکومت ہمیشہ اولوالعزم ثابت ہوگی۔

دشمن کو حقیر نہ سمجھنا چاہیئے

ہندوستانیوں اور یورپینوں میں "کانگرس والا" ایک قسم کی حقارت آمیز گالی سمجھی جاتی تھی۔ لیکن انگلستان میں بھی تو کبھی نئی تحریکیں چلانے والوں کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ پھر کیا اِنہیں نئی تحریکوں کو بالآخر کامیابی حاصل نہ ہوئی؟ سلطنتوں پر جب بُرا وقت آپڑتا ہے تو وہ عجیب سے عجیب طاقتوں کے ساتھ مصالحت کرنے میں بھی کوئی عذر محسوس نہیں کرتیں۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ پنڈت جی اپنی نجات حاصل کرنے کے لئے محض کانگرس کی سرگرمیوں ہی کو وسیلۂ کامیابی خیال کرتے

تھے۔ کانگرس اُن کے مقصد کے لئے مفید تو ضرور تھی، لیکن لابدی نہ تھی۔ پنڈت جی جانتے تھے کہ برطانوی سلطنت میں زلزلہ پیدا کرنا ہے تو نری کاٹھ کی تلوار چلانے سے کام نہ چلے گا۔ بادشاہوں کو خوفزدہ کرنا ہو تو فقط کپڑوں کی دھجیوں سے بنتے ہوئے ہَوّے سے کام نہیں چلتا۔

باب ششم

بغاوت

مغربی تہذیب کن اجزا سے مرکّب ہے

اب اُس دور کا آغاز ہوتا ہے جب ہندوستان میں مغربی تہذیب کے خلاف عام بغاوت شروع ہوگئی۔ اہلِ مشرق مغربی تہذیب سے بری طرح تنگ آچکے تھے۔ پورب کے رہنے والے اس تہذیب سے گِھن کھاتے تھے۔

مغربی تہذیب کئی عناصر کی آمیزش سے مرکّب ہے۔ اِس ترکیب میں مختلف اجزا شامل ہیں۔ مغربی تہذیب نے تین واسطوں سے یہودیوں سے فیض حاصل کیا ہے۔ دو واسطوں سے یونانیوں سے فیض حاصل کیا ہے۔ اور ایک واسطہ سے

روما کے تمدن سے براہ راست فیض حاصل کیا ہے۔ انہی عناصر میں بنی سام اور بعض وحشی قبائل کے کچھ آثار بھی شامل ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ مغربی تہذیب پر یونان کا رنگ و روغن چڑھا ہوا ہے۔

اگر اس تہذیب کے مباویات کی تحقیق کی جائے تو کچھ حسب ذیل قسم کے نتائج اخذ ہوتے ہیں:۔

(۱) دیوتا زمین پر چلنے پھرنے والی مخلوق ہیں۔ وہ نہ تو عالمِ روحانیات کے باشندے ہیں۔ نہ عقلیات کے ایسے قواعدِ کلیہ ہیں جن کا کوئی مادی وجود نہ ہو۔ دیوتا ایک ٹھوس حقیقت ہیں، اور وہ کچھ کر کے دکھا سکتے ہیں۔

(۲) خدا اور بندے کا رشتہ، آقا اور غلام کا رشتہ نہیں۔ بلکہ یہ باپ اور بیٹے کا رشتہ ہے۔ یا ایک شفیق لیڈر اور اُس کے آزاد لیکن وفادار مقلد کا رشتہ ہے۔ انسان کے بعض حقوق ایسے ہیں۔ جن کو خدا بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بندوں کے حق میں خدا کے ذمے بعض ایسے فرائض بھی ہیں جو اُسے پورے کرنے پڑتے ہیں۔ خدا کی رحمت کی نوعیت کسی من مانی چلانے والے سلطان یا کسی غلاموں کے عاقبت اندیش داروغہ کی رحمت جیسی نہیں۔ خدا کی

رحمت کی مثال اُس محبّت جیسی ہے جو ایک باالفت باپ اور بیٹے کے مابین پائی جاتی ہے۔

(۳) یہ کائنات کوئی نظری دھوکہ نہیں۔ نہ ہی اِس دنیا کو کسی بد روح نے پیدا کیا ہے۔ کائنات کا وجود خدا اور انسان دونوں کے شعور کا محتاج نہیں۔ دنیا ایک اچھی جگہ ہے۔ خدا بھی یہیں رہائش رکھتا ہے۔ خدا کی قدرت اِس سے ظاہر ہے کہ اوّل تو مادی دنیا حُسن سے معمور ہے۔ پھر اس کے علاوہ یہاں ایسی چیزیں بھی پائی جاتی ہیں جو انسانی خوشی کو ختم کر دیتی ہیں۔

(۴) اس میں شک نہیں کہ دنیا میں بُرائی بھی موجود ہے۔ ہم بُرائی کی وجہ معلوم نہیں کر سکتے۔ نیکی کی مقدار بُرائی سے زیادہ ہے۔ انسان کوشش کرے تو برائیوں میں تخفیف کی جا سکتی ہے۔ غالب امکان یہی ہے کہ دنیا میں بُرائی کا وجود اس لئے پیدا ہوا کہ خدا جانتا ہے جب تک تصادم رونما نہ ہو تب تک مسرّت حاصل نہیں ہو سکتی۔ شاید اسی وجہ سے خدا نے انسان کو جنگجو بنایا اور اُسے حریف بھی مہیا کر دیئے۔

(۵) خدا دنیا پر ایک قانون کے ماتحت حکومت کرتا ہے۔ اس لئے انسان بھی قانون کے ماتحت ہے۔ لیکن یہ قانون کوئی

جبری قانون نہیں۔ خدا نے انسان کے ارادے کو آزاد چھوڑ دیا ہے، انسان اپنی مرضی کے مطابق بُرا یا بھلا انتخاب کر سکتا ہے۔ اگر انسان بھلے راستے پر چلے تو اُسے بقا حاصل ہو جائے گی۔ اگر وہ خرابی کے راستے پر چلے تو تباہ ہو جائے گا۔ کوئی شے فی نفسہٖ بُری یا بھلی نہیں۔ یہ دریافت کرنا انسان کا کام ہے کہ کسی خاص موقعہ پر کیا بھلا ہے اور کیا برا۔

(۶) دیوانی حکومتیں اس لئے قائم کی جاتی ہیں کہ انسان کو برے بھلے کے انتخاب میں مدد دیں۔ اس لئے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ دیوانی حکومت کا قیام رضائے الٰہی کے مطابق ہے۔ یہ بھی ٹھیک کہ ایسی حکومتیں خدا ہی کی طرف سے مقرر ہوتی ہیں۔ لیکن خدا نے انسانوں کے ہاتھ باندھ کر اُنہیں غلاموں کی طرح حکمرانوں کے سپرد نہیں کر دیا۔ رعایا اور حاکم کے فرائض ایک دوسرے سے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خدا بغاوت پسند نہیں کرتا۔ لیکن خدا ظلم بھی پسند نہیں کرتا۔ خدا نے کسی خاص طرزِ حکومت کو پسند کر کے اُسے ہمیشہ کیلئے قبول کرنے کا حکم نہیں دے دیا حکومت کی بہترین شکل وہ ہے جو کسی خاص زمانہ میں امن قائم رکھے۔ اور ترقی کے مواقع مہیا کرے آجکل جمہوری طرزِ حکومت اس خاص مقصد کو حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

(۷) ممکن ہے کوئی ایسا قانون بھی ہو جس کے ماتحت یہ دنیا کے

تمام قانون چلتے ہوں، لیکن ایسے قانون سے انسان کا کوئی واسطہ نہیں۔ انسانیت ترقی کر رہی ہے، اور جیسے جیسے انسان ترقی کرتا جاتا ہے ویسے ہی اُس کو نئے نئے قوانین کی بھی حاجت ہوتی ہے۔ بحیثیت سیاسی جانور ہونے کے انسان پر سب سے بڑا فرض یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ دریافت کرے کون سے قوانین ترقی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، اور کن قوانین سے ترقی میں مدد ملتی ہے۔ جس طرح انسان خدا یا کسی بادشاہ کا غلام نہیں، اسی طرح وہ کسی خدائی قانون کا بھی غلام نہیں جو کبھی تبدیل نہ کیا جا سکتا ہو۔

(۸) غرض انسان ایک آزاد مخلوق ہے۔ معاشرت میں وہ دوسری آزاد مخلوق کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرتا ہے۔ ہاں بعض معمولی پابندیاں اُسے ضرور قبول کرنی پڑتی ہیں۔ انسان کا انسان سے رشتہ کسی پیدائشی مرتبہ پر منحصر نہیں۔ انسان اپنے افعال کا خود مختار ہے۔ اس لئے انسان کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ آزادانہ معاہدہ کر کے اپنی آزادی پر کچھ پابندیاں عائد کر لے۔ اگر ایک دفعہ انسان کوئی ایسا معاہدہ کر بیٹھے تو پھر اُسے ضرور پورا بھی کرنا چاہیئے اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اُس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ معاہدہ کرنے کی آزادی کے حق سے محروم رہ جائے گا۔ اگر انسان اپنے معاہدات کی پابندی سے انکار کرے تو مذہب اور حکومت دونوں اُس کو ایسا کرنے سے باز رکھیں گے

(۹) انسان حواسِ خمسہ کا مالک ہے۔ دنیا میں کئی چیزیں ایسی ہیں جن سے حواس کو لذّت حاصل ہوتی ہے۔ ایسی لذّت حاصل کرنا بالکل جائز اور مناسب ہے۔ لذیذ چیزیں اسی مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ لیکن انسان کو اِس طرح لذّت حاصل کرنی چاہیئے کہ وہ یہ کبھی نہ بھولے کہ وہ ایک آزاد انسان ہے، جو دوسرے آزاد انسانوں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کر رہا ہے۔ اُسے نہ اپنا زیان ہونے دینا چاہیئے، نہ کسی کو زیان پہنچانا چاہیئے۔ اس لئے انسان لذّت کوشی کی تلاش میں نکلے تو اُس کا فرض ہے کہ قانون اور مذہب کا پابند رہے۔

(۱۰) اپنی دولت اِس طرح استعمال کرو کہ دوسروں کو نقصان نہ پہنچے۔ کسی انسان یا کسی انسانوں کے گروہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کائنات کے سارے حُسن اور لذّتوں پر قبضہ کر لیں۔ ہر انسان کو مساوی موقعہ ملنا چاہیئے۔ اگر تمام انسان یکساں استعداد نہیں رکھتے تو یہ افسوس کا مقام ہے۔

(۱۱) کائنات کی لذّتیں اور حسن عارضی ہیں، لیکن فنونِ لطیفہ اُن کو غیر فانی شکل دے دیتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ حُسن اور لذّت کو اُن لوگوں کے سامنے ترجمہ کر کے پیش کرتے ہیں جو بغیر اِس ترجمہ کے انہیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ فنکار وہ ہے جسے قدرت نے تخیّل بخشا

ہو۔ یہ اس کا کام ہے کہ وہ اپنے تخیّل کے اظہار کے لئے مناسب علامات اور مثالیں تلاش کرے۔ یوں جہاں تک ہمارا تعلّق ہے، ہمیں تو یونانیوں کی علاماتِ ترجمانی زیادہ سہولت سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔ جو فنکار اپنا تخیّل ایسی علامات کے ذریعہ بیان کرتا ہے جنہیں اکثر لوگ سمجھ نہ سکیں وہ اپنے منصب کا غدّار ہے۔

(۱۲) انسان کا فرض ہے کہ ہمیں تجسّس میں لگا رہے۔ کائنات عجیب عجیب طاقتوں اور نادر مواد سے بھری پڑی ہے، جن کی خاصیتیں ابھی پوری طرح معلوم نہیں۔ یہ انسان کا فرض ہے کہ وہ اِن طاقتوں اور خاصیتّوں سے اپنے مفیدِ مطلب کام لے۔ اس طرح سے انسان دنیائے رنگ و بو پر زیادہ سے زیادہ قدرت حاصل کرتا چلا جائے گا، اور اپنی مادی خوشحالی میں بھی اضافہ کرتا جائے گا۔ تجسّس رکھنے والے ذہن کو تحقیق میں ایک ایسا خاص لطف آتا ہے جو مادّی لذّتوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

(۱۳) عورت اللہ کی خوشگوار ترین مخلوقات میں شامل ہے۔ لیکن عورت صرف لذّت حاصل کرنے کی مشین ہی نہیں۔ اِس میں تو کچھ شک نہیں کہ عورت جس خاص مقصد کو پورا کرنے کے لئے بنائی گئی ہے اُسی کی مناسبت سے عورت کی ہر خصوصیّت کا خمیر اُٹھایا گیا ہے۔

لیکن عورت میں کچھ دوسری خوبیاں بھی ہیں۔ عورت احترام کی مستحق ہے۔ بحیثیت ساتھی، دوست اور پیر و مرشد ہونے کے، عورت وفاداری کی مستحق ہے۔

(۱۴) اگرچہ ایک بیوی رکھنے سے تمدّن میں بڑی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں، اور کئی افراد کو تکلیف بھی پہنچتی ہے، پھر بھی ایک وقت میں ایک ہی بیوی رکھنے کا رواج نافذ ہونا چاہیئے۔ مرد و زن کے اس ازدواج سے ہی آئندہ نسلیں پیدا ہوں گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ انسان آزاد رہے۔ جب تک والدین میں سے ایک فریق دوسرے کے مقابلہ میں پست اور ذلیل ہے تب تک اولاد کس طرح آزادی کی تربیت پا سکتی ہے۔

یہ ہیں مغربی تہذیب کے بنیادی اصول۔ آپ نے خود ہی دیکھ لیا ہوگا کہ یہ اصولوں کا مجموعہ ایک قسم کی مذہبی تعلیم ہے۔ کوئی مذہب ہر جگہ اور ہر وقت سچ نہیں ہوا کرتا۔ یہی حال اِن اصولوں کا بھی ہے۔ اہلِ مشرق اِن میں سے ہر ایک اصول کا انکار کریں گے۔

مشرقی تہذیب کن اجزاء سے مرکّب ہے

(۱) اہلِ مشرق کہیں گے انسان اور خدا کا رشتہ، باپ بیٹے کا رشتہ نہیں۔

(۲) دیوتا ایک روحانی تصور ہیں۔ اگر دیوتاؤں کا کوئی وجود ہے تو وہ انسان کے خیر خواہ نہیں۔ دیوتا اخلاقی اصولوں کے پابند نہیں۔ دیوتاؤں کی طاقت بے حساب ہے۔

(۳) اگر خدا اکیلا ہے تو وہ اپنے بندوں کا مالک ہے۔ اُس کے ایک اشارے سے انسان پیدا ہو گیا، اور اُس کے ایک اشارے سے انسان فنا ہو سکتا ہے۔ خدا کا منشا ہی قانون ہے۔ انسان خدا کے مقابلہ میں کوئی حقوق نہیں رکھتا۔ خدا کے احکام کی کوئی اپیل نہیں۔ خدا چاہے تو تمام بنی آدم کو جہنم بھیج دے۔ اگر خدا ایسا کرے تو اِس سے اُس کے انصاف پر کوئی حرف نہ آئے گا۔

(۴) یہ عالمِ رنگ و بو ایک نظری دھوکہ ہے۔ یا اِسے کسی بدروح نے پیدا کیا ہے۔ یا اِس کو چلانے والے دیوتا کسی اخلاقی اصول کے پابند نہیں۔

(۵) انسان اسی طرح سے اپنی زندگی پوری کرتا ہے جس طرح سے ایک ستارہ اپنی زندگی پوری کرتا ہے۔ یا ایک گوبر کا کیڑا اپنی زندگی پوری کرتا ہے۔

(۶) اگر ایک خدا مانا جائے تو یہ کائنات اُس کے غلاموں کا قید خانہ ہے۔ دنیا میں انسانوں کو جو لذتیں نصیب ہیں، وہ اُسی

قسم کی لذتیں ہیں جیسی کہ کوئی دانا آقا اپنے غلاموں کو اُن کے کام میں لگائے رکھنے کی خاطر مہیا کرتا ہے۔

(۷) دنیا میں بدی کا غلبہ ہے۔

(۸) محض جھنجلا کر اپنے حواس کو لذّت سے محروم رکھنا خدا کے خلاف بغاوت کے برابر ہے۔ یا کم از کم کفرانِ نعمت ہے۔ ہاں اگر دنیا کو بالکل چھوڑ دیا جائے، اور یہ ترکِ دنیا خدا کی راہ میں ہو، تو ایسا کرنے والا ایک عقلمند اور نیک انسان ہوگا۔

(۹) انسان اپنے ارادے کا مختار نہیں۔ انسان مجبور ہے اُسے بُرا بھلا انتخاب کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔

(۱۰) جو شئے اچھی ہے فی نفسہٖ اچھی ہے۔ جو شئے بری ہے فی نفسہٖ بری ہے۔ خدا جس بات کا حکم دے وہ اچھّی ہے۔ خدا جس بات سے منع کرے وہ بُری ہے۔ نیکی اور بدی کا فیصلہ خدا نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسان کی پیدائش سے بہت پہلے کر دیا تھا۔

(۱۱) کائنات ایک قانون کے ماتحت تو ہے، لیکن یہ قانون ناقابلِ ترمیم ہے، اور ازل سے چلا آرہا ہے۔ اِس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ انسان کا بنایا ہوا قانون اِس خدائی قانون کے مطابق ہونا چاہئے۔ خدا نے اپنا منشاء وحی کے ذریعہ ظاہر کر دیا ہے۔ لیکن

انسان قاصر و غافل ہے، اور اِس وجہ سے خدا کا قانون پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ تب خدا اپنے رسول زمین پر بھیجتا ہے جو اُس کے احکام کو پھر تازہ کرتے ہیں۔ دیوانی حکومت چلانے والے حکمران صرف اِس لئے مقرر کئے جاتے ہیں تاکہ وہ اِس ازلی اور ناقابلِ ترمیم قانون کا نفاذ کرتے رہیں۔ اِس حیثیت سے حاکم خدا کا خلیفہ ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی بزرگوں کے راستہ پر چلنے والے اور لائق حکمران کے خلاف بغاوت خدا کے خلاف بغاوت کے برابر ہے۔ حاکم اور محکوم سب اللہ کے غلام ہیں۔ سلطنتیں خدا ہی بخشتا ہے، اور پھر خدا ہی چھین بھی لیتا ہے۔

(۱۲) حاکم کا فرض یہ ہے کہ خدائی قانون کا نفاذ کرتا رہے۔ حاکم کے اپنے بناتے ہوئے قوانین محض عارضی اور ہنگامی قواعد کی حیثیت رکھتے ہیں جو حاکم کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ اِس وجہ سے محکوموں کا حکومت میں حصّہ لینا غیر ضروری بھی ہے اور نامناسب بھی۔ رعایا کا فرض ہے کہ اُن خدائی اختیارات کی تعمیل کرے جو خدا نے حکمران کو سونپ دیئے ہیں۔ اگر حاکم خدائی قانون سے باغی ہو جائے یا اُس قانون کو نافذ کرنے کے صریحاً ناقابل ہو جائے تو رعایا کا چارۂ کار صرف یہ ہے کہ ایسے

حاکم کو بدل ڈالے۔

(۱۳) انسان اپنے افعال کا خود مختار نہیں۔ اگر تمام انسان برابر ہیں تو صرف اِس لحاظ سے کہ سب خدا کے بندے ہیں۔ خدا جس طرح چاہتا ہے اپنے غلاموں سے کام لیتا ہے۔ کسی کو وہ مرتبہ پر پہنچاتا ہے، اور کسی کو مرتبہ پر نہیں پہنچاتا۔

(۱۴) بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو اِس میں زیادہ آرام ہے کہ انسانوں کے باہمی تعلقات اُن کے پیدائشی مرتبہ پر منحصر ہوں، نہ یہ کہ اِن تعلقات کا انحصار باہمی معاہدات پر ہو۔

(۱۵) کوئی معاہدہ خدائی قانون کو نہیں بدل سکتا۔ خدائی قانون کی رو سے انسان پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اُن سے کوئی شخص معاہدہ کر کے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص ایسی کوشش کرے تو قانون اور مذہب اُس کو باز رکھیں گے۔

(۱۶) جب تک مذہبی احکامات کے مطابق کوئی کام جائز نہ ہو اور اُس کام کے کرنے کا مذہبی حکم بھی نہ ہو تب تک کوئی فعل نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ اِس میں بڑے خطرات ہیں۔ ممکن ہے تم ناواقفی میں کسی خدائی قانون کی خلاف ورزی کر بیٹھو۔

(۱۷) فنونِ لطیفہ کے ذریعہ حُسن کا تصوّر باندھ کر انسانی جذبات

کو وہ تحریک نہیں ہوتی جو دہشت اور طاقت کا تخیّل سامنے رکھنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یونانی علاماتِ اظہار لایعنی ہیں۔ اہلِ مشرق کی علاماتِ اظہار، اہلِ مغرب کو بھونڈی اور گھناؤنی معلوم ہوتی ہیں۔

(۱۸) اِس میں شک نہیں کہ انسانی روح کی رسائی دور دور تک ہے، اور وہ کبھی پرواز سے نہیں تھکتی۔ لیکن انسان کی روح مادی اشیاء سے نفور ہے۔ روح کو حقیقی سرور، عالمِ روحانیات کے ساتھ رشتہ قائم کرنے سے ملتا ہے۔ مادی علوم وحشیانہ اور کافرانہ ہیں۔

(۱۹) عورت اللہ کی خوشگوار ترین مخلوق ہے، لیکن عورت صرف مردوں کے لئے ہی کارآمد ہے۔ عورت کی تین حیثیتیں ہیں: یا تو وہ بیٹی ہوتی ہے، یا بیوی ہوتی ہے، اور یا ماں ہوتی ہے۔ عورت کو آزادی کا کوئی حق نہیں۔ جب عورت جوان ہو تو زیادہ تر اس لحاظ سے کارآمد ہے کہ اُس سے لطف اُٹھایا جا سکتا ہے۔ عورت کی جوانی تھوڑے دن قائم رہتی ہے، اور مرد کی جنسی خواہشات موت کے بعد ہی ختم ہوتی ہیں۔ اس لئے ایک بیوی کا رواج مضحکہ خیز بھی ہے اور ضرر رساں بھی۔

صاف نظر آتا ہے کہ اِن خیالات میں اور اُن عقائد میں زمین آسمان

کا فرق ہے جن پر مغربی تہذیب قائم ہے - دونوں عقیدے ایک جگہ قائم نہیں رہ سکتے۔

جب انگریز ہندوستان کے حاکم بنے، اور اُنہوں نے ایک حکمران کے ابتدائی فرائض سے تجاوز کر کے ایسے معاملات میں بھی دخل دینا شروع کیا جو حکمرانوں کے لازمی فرائض میں شامل نہیں یعنی اُنہوں نے ہندوستان میں اپنا تمدّن رائج کرنے کی کوشش کی تو اِس سے تصادم پیدا ہو گیا۔

ہندو دھرم اور برطانوی راج کی ٹکّر

ہندو مت اور اسلام وہ دو مذہب تھے جن کے کندھوں پر مشرق کی ترجمانی کا بوجھ تھا۔ اس زمانہ میں ابھی اسلام نے لڑائی کا جھنڈا بلند نہ کیا تھا۔ اسلام تاحال جنگ میں کودنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ زیادہ مناسب یہی ہوگا کہ اسلام کے اعلانِ جنگ کی روئداد علیحدہ بیان کی جائے۔ پہلے ذیل میں ہندوؤں کے جوابی حملہ کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں :-

ہمارے مقصد کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہندو مذہب اور اُس کے معاشرتی نظام کی پوری تفصیلات یہاں بیان کی جائیں - ہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسلام کی طرح ہندو

دھرم بھی بجائے خود انہیں معنوں میں ایک ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے، جن معنوں میں یونان کی بلدیاتی اُمتوں کے عقائد ایک منفرد اور ہمہ گیر ضابطۂ حیات تھے یعنی دھرم صرف خدا اور انسان کے باہمی تعلقات ہی کی وضاحت نہیں کرتا بلکہ انسان کی دنیاوی حکومت کے لئے بھی ایک بنا بنایا خاکہ پیش کرتا ہے۔ ایک ہندو کی زندگی کی تمام چھوٹی موٹی تفصیلات ہندو دھرم کی رو سے انجام پاتی ہیں۔

اِن حالات میں برطانوی حکومت اور ہندو مت کا تصادم زود یا بدیر لازم تھا۔

برطانیہ نے ہندوستان کو ہندوؤں سے فتح نہیں کیا

یہ کہنا سچ نہیں کہ برطانیہ نے جب ہندوستان فتح کیا تو اِس پر ہندوؤں کا قبضہ تھا، کیونکہ پلاسی اور بکسر کی لڑائیاں کوئی معمولی درجہ کی جنگیں نہ تھیں، اور حیدر علی و ٹیپو سلطان کی سلطنتِ خداداد کا مقابلہ کرتے ہوئے تو برطانوی راج کو جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ ہاں ایک ہندو طاقت کو ضرور انگریز فوجوں نے تخت سے محروم کر دیا تھا۔ وسطِ ہندوستان کا تسلّط مرہٹوں سے چھینا گیا تھا۔ مرہٹوں کے اندر سیاسی معاملات میں برہمنوں کی برتری انتہائے

عروج تک پہنچ چکی تھی۔ مسلمان حکمرانوں کے درباروں میں بھی ہندوؤں کو اور بالخصوص برہمنوں کو کئی جگہ بڑا رسوخ حاصل تھا۔ غرض اس پہلو سے دیکھا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ برطانوی راج کی فتحیابی سے برہمنوں کو مادی طور پر بڑا نقصان پہنچا۔ جلد ہی برطانوی راج نے برہمنوں کو روحانی اقتدار سے بھی محروم کرنا شروع کر دیا۔ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد انگریزوں نے اُن ہندو رسوم کا انسداد شروع کر دیا جو صریحاً تہذیب کے خلاف تھیں۔ انگریزوں نے اس کام میں جتنی تاخیر کی وہ بھی نہ کرنی چاہئے تھی۔ آخر کار انگریزوں نے دیوی دیوتاؤں کے سامنے انسانی قربانی اور ستی کی رسوم قانوناً منسوخ کر دیں۔ انسانی قربانی اور ستی، ہندومت کی تعلیم کے لازمی فرائض میں شامل نہیں۔ پھر بھی مذہبی امور میں حکومت کی مداخلت کو ناپسند کیا گیا۔

"قاضی جی" کے اندیشے

انگریز اب وہ پرانا اصول چھوڑ چکے تھے کہ ہر شخص اپنے بُرے بھلے کا خود مختار ہے۔

۱۸۳۰ء سے لے کر ۱۸۴۰ء تک انگریز قوم میں لبرل عقائد بہت مقبول تھے۔ اس وجہ سے ہندوستان کے اندر بھی انگریزوں نے

ستی اور انسانی قربانی بند کرنے پر اکتفا نہ کی بلکہ مزید اصلاحات جاری کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہندوؤں کے مذہبی توہّمات کی کچھ پروا نہ کی جاتی تھی۔ نکاحِ بیوگان کی اجازت دے دی گئی۔ ایک ایسا قانون بھی زیرِ تجویز تھا جس کے ماتحت ایک سے زیادہ بیویاں کرنے والوں کو ایک خاص تعداد سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ ہوتی۔ اِن اصلاحات کا ردِّ عمل غدؔر کی صورت میں رونما ہوا۔

جو کام طاقت سے نہیں ہوا شاید سازش سے ہو جائے

غدر کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ زورِ شمشیر سے ہندو مت کو بحال کرنے کی تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ تعلیم یافتہ طبقات نے ایک نئے ذوق و شوق سے انگریزی تمدّن کی تقلید شروع کر دی۔ بے یقینی اور لا مذہبیّت فیشن بن گئے۔ مشرق و مغرب کے فلسفہ کو ملانے کی کوشش میں نئے نئے مذاہب اور مت ایجاد ہونے لگے۔ اِس کا ردِّ عمل پہلے سے بھی زیادہ شدید صورت میں ظاہر ہوا۔ ایلبرٹؔ بل کے حق میں ایجیٹیشن نے اِس ردِّ عمل کو مزید تقویّت دی۔

۱۸۸۵ء سے لے کر ۱۸۹۰ء تک کے زمانہ میں اِس ردِّ عمل کے حامیوں نے اپنے آپ کو پونا میں منظّم کرنا شروع کیا۔ پونا مرہٹہ

برہمنوں کا مرکزی مقام تھا۔ مرہٹہ برہمن ہندوستان کی واحد نسل ہیں جو علمی قابلیّت کے ساتھ ساتھ انتظامی قابلیّت بھی رکھتے ہیں۔ اِن کو انگریزوں سے بڑا نقصان پہنچا تھا۔ مرہٹوں کی سلطنت تباہ ہوگئی تھی۔ پونا کی ریاست بھی جس کا راجہ ایک مرہٹہ برہمن تھا تباہ ہوچکی تھی۔ ستارا کی چھوٹی سی ریاست میں برہمنوں کو کچھ رسوخ حاصل تھا، لیکن یہ ریاست بھی مٹا دی گئی۔ حکومتِ بمبئی کئی سال سے زمین کی ملکیتوں سے متعلق ایک کڑی تفتیش کر رہی تھی۔ اِس کا نتیجہ یہ تھا کہ جس کسی کے حقوقِ مالکانہ میں شک پڑتا اُس کی اراضی ضبط کر لی جاتی۔ ضبط شدہ اراضی کے مالکان کو پختہ یقین تھا کہ اُن کے منسوخ شدہ حقوق بالکل جائز تھے۔ حکومت کا تمام ادنیٰ عملہ برہمنوں سے بھرا پڑا تھا۔ اکثر سرکاری خط وکتابت ایک ایسے رسم الخط میں کی جاتی تھی جس کو ایک برہمن کے سوا کوئی پڑھ نہ سکتا تھا۔ گو کتنا تھ برہمنوں کے صحیح النسل ہونے میں کچھ شک تھا۔ اُن لوگوں نے اِس شک کو دور کرنے کی ترکیب یہ نکالی کہ کٹر ہندو بن گئے۔ اور علم وفضل میں بازی لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔

شیو مہاراج کی سرپرستی

ضرورت یہ تھی کہ اِس نئی تحریک کی سرپرستی کسی خاص دیوتا

کے سپرد کر دی جائے۔ بظاہر خیال ہوتا ہے کہ وشنو دیوتا قومی رہنما ہونے کے لحاظ سے یہ فرض بخوبی سرانجام دے سکتے تھے۔ اِس سے پہلے کئی مرتبہ وشنو دیوتا انسان کے روپ میں دھرتی پر نازل ہو کر ہندو مت کو دوبارہ جنم دے چکے تھے، اور ہندوؤں پر ظلم کرنے والوں کو سزا بھی دیتے رہے تھے۔ لیکن بعض وجوہات کی بنا پر، جن کا ذکر بعد میں کیا جائے گا، اِس تحریک کی سرپرستی شیو دیوتا کے سپرد کی گئی۔ شیو مہاراج کی امداد کو دوسرے دیوتا بھی موجود تھے۔ مثلاً گنیش دیوتا۔ گنیش مہاراج کا حلیہ یہ تھا کہ پیٹ مٹکے سا اور سر آپ کا ہاتھی سے ملتا جلتا ہے۔ آپ دنیاوی علوم اور مادی ترقی کے دیوتا ہیں۔ پرانے زمانہ میں آپ کو فرشتۂ انتقام سمجھا جاتا تھا گویا آپ ہندو اتہاس کے میکائیل تھے۔

روایات کی کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھئے تو آپ کو شیو پوجا کی شرمناک تفصیلات لکھی ہوئی مل جائیں گی۔ لیکن حقیقتِ حال صرف یہ ہے کہ شروع شروع میں خدا مکمل اور ہمہ گیر تھا۔ اس وجہ سے خدا نکمّا اور بیکار بیٹھا رہتا تھا۔ بھلا وہ کوئی کام کیسے کرتا جبکہ کام کرنے کے لئے پہلے کسی اوزار اور مواد کی حاجت ہوتی ہے۔ اس لئے بیکاری سے اُکتا کر خدا نے خالق بننے کا ارادہ کر لیا۔ خالق بننے کے

شوق میں خدا نے اپنے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ رجولیت رکھنے والے حصّہ کا نام شیو قرار پایا، اور نسائیت کے خواص رکھنے والا حصّہ دیوی کے نام سے مشہور ہوا۔ اب خدا تخلیق کے قابل بن چکا تھا، اس لئے اُس نے دھڑا دھڑ مخلوق پیدا کرنی شروع کر دی۔ اس دیوتاؤں کے جوڑے کا نشان یہ ہے کہ توالد وتناسل کے مردانہ اور زنانہ اعضا، یکجا کر کے اُنہیں "یونی لنگم" یا خالی "لنگم" کی علامت سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اہل مغرب کو لنگم مہاراج سے کچھ ہندوستان میں پہلی مرتبہ واسطہ نہیں پڑا۔

۲۲۰ء قبل مسیح کا ذکر ہے کہ عماسہ کے دیوتا بعل کو جوپیٹر کیپٹی لینس کے مندر میں نصب کیا گیا۔ اور اِس طرح روما کی سلطنت نے لنگم کو خدائے واحد تسلیم کر کے اُس کی پوجا شروع کی۔ چونکہ اُن دنوں شہنشاہِ روما کو خدا بھی سمجھا جاتا تھا اور زمین پر خدا کا سب سے بڑا پروہت بھی، اس لئے حضور ملکِ معظم کی شخصیت، تذکیر وتانیث دونوں پہلوؤں سے ذاتِ ربّی کا مظہر مانی جانے لگی۔

اہلِ روما کو عبادت کا یہ طریقہ زیادہ دیر تک پسند نہ آیا، اور اس طرح سے مغرب میں مشرق کے ایک دیوتا کا راج قائم کرنے کی یہ کوشش

ناکام رہ گئی۔

آزادی کی دیوی خون کی بھینٹ مانگتی ہے

حیات کے ساتھ موت بھی وابستہ ہے کیونکہ جو مخلوق پیدا ہو وہ ناقص ہوتی ہے، اور ناقص ہونے کے باعث فنا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگ لنگم کی تخلیقی علامت کے تخریبی پہلو کو زیادہ مدنظر رکھتے ہیں۔ اسی طرح ہندو دھرم کا راج دوبارہ قائم کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ پہلے برطانوی سرکار کا خاتمہ کیا جاتا۔ کیا عجب ہے کہ شیو مہاراج بھی شاید اپنی سرگرمیوں کا رُخ یہی مقصد حاصل کرنے کی جانب پھیر دیں۔

اسی مہاراشٹر میں اس سے پہلے ایک مرتبہ ایسا ہو بھی چکا ہے۔ کسی زمانہ میں یہ ملک دو مسلمان ریاستوں کے مابین بٹا ہوا تھا۔ دکنی ریاست میں مسلمانوں کی تعداد نہایت قلیل تھی، یعنی عام باشندوں کے چار فیصدی کے قریب مسلمانوں کی شمالی حکومتیں اُن کی امداد پر آمادہ نہ تھیں۔ اور ایران و وسطِ ایشیا کے جنگجو قبائل سے اُن کا رشتہ طویل مسافت کے باعث کٹ چکا تھا۔ جنوب کی ایک ہندو ریاست اِس مسلمان ریاست کا زبردست اور سرگرم مدِمقابل تھی۔ باوجود اِس کے یہ مسلم ریاست صدیوں تک قائم رہی۔ ظاہر ہے اِس

مسلم ریاست اور اُس کی ہندو رعایا کے تعلقات مذہبی ظلم وستم سے آلودہ نہ ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ فوج اور دیوانی نظم ونسق کے عملہ میں ہندو کثیر تعداد میں ملازم تھے۔ گاہے گاہے تعصب کی وبا ضرور پھوٹ پڑتی رہی۔ اِکّا دُکّا ایسے واقعات بھی ہوئے کہ کسی شخص کو مذہب کی بنا پر دکھ پہنچایا گیا ہو۔ لیکن ریاست کی عام پالیسی یہی تھی کہ ہندو رعایا سے خوشگوار تعلقات قائم رکھّے جائیں۔ باوجود اِس کے غیر ملکی حاکم اور خارجی تمدّن ہندومت کو پنپنے نہ دیتا تھا۔ اِس لئے مسلمان ریاست کے خلاف ایک ردِّ عمل شروع ہوا۔ کئی سادھو اور مہاتما ہندومت کے کملائے ہوئے پودے کو شاداب کرنے کے لئے میدان میں نکل آئے۔ اِس کے بعد ہندومت کو نجات دینے کے لئے ایک دنیاوی رہنما بھی پیدا ہو گیا۔

یہ ہے مشہور شیواجی کی کہانی۔ شیواجی احمد نگر اور بیجاپور کے درباروں کے ساتھ تعلق رکھنے والے ایک رئیس ہندو خاندان کا نونہال تھا۔ وہ خود بھی بیجاپور کا باجگزار تھا۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ دکن کو ترکوں کی حکومت سے آزاد کرواؤں گا۔ پھر اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کی مخالفت کے باوجود وہ اپنے عزم پہ ڈٹا رہا۔ اُس

نے مکاری اور دلیری کی آمیزش سے بالآخر اپنے مقصد میں کامیابی بھی حاصل کرلی۔ ریاست جلد ہی شیوا جی کے خاندان سے بھی نکل گئی۔ لیکن اِس کے بعد دکن کے بیشتر حصّہ پر ہندو اقتدار ہمیشہ کے لئے قائم ہوگیا۔ مسلمان اگر کہیں باقی رہے بھی تو ہندوؤں کے محکوم اور اجیر ہوکر۔

ہندوؤں کے اِس قومی رہنما کا نام ہی بتاتا ہے کہ وہ کس دیوتا کا آلۂ کار تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ شیو مہاراج اب کے ایک نیا نجات دہندہ بھیج دیں جو ہندو مت کا حمایتی بن کر میدان میں نکل آئے؟ ہندو مت کو اب اِس سے بڑا خطرہ درپیش تھا جتنا کہ بیجا پور کے مخلوط عرب تمدّن سے کبھی خطرہ پیدا ہوا تھا۔

جو لوگ برطانوی راج کی جڑیں اکھیڑنا چاہتے تھے، اُنہیں شیوا جی سے بہتر کوئی مثال نظر نہ آتی تھی۔ شروع میں اُس کی طاقت تھوڑی تھی۔ اُس نے ڈاکے مار کر اپنے وسائل میں ترقّی کی۔ کیا قومی تحریک کا خزانہ آج بھی اسی ترکیب سے بھرپور نہیں کیا جا سکتا؟ جب شیوا جی کو ایک بڑی فوج سے مقابلہ کرنا پڑا تو اُس نے صلح کی بات چیت سے اِس بڑی فوج کو اپنے داؤں میں پھنسا لیا، اور اُس فوج کے جرنیل کو مصالحت کی ایسی جھوٹ موٹ کوشش

کے دوران میں قتل بھی کر دیا۔ کم از کم عوام میں یہی کہانی مشہور تھی، اگرچہ مؤرخین کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ شیواجی کا حریف اُس سے فریب کرنا چاہتا تھا، اور شیواجی نے فقط اتنا کیا کہ فریب کاری میں پیش دستی کر دی۔ غرض یہ بات واضح تھی کہ مذہب کے حامی محبانِ وطن کو نہ قتل سے عار ہونی چاہیئے، اور نہ فریب سے۔ شیواجی نے مرہٹوں کو قومی روح کو بیدار کرنے کے لئے نیم مذہبی ناٹکوں اور مذہبی کتب کے پاٹھ کی محافل منعقد کر کے کام لیا تھا۔ نئی تحریک کے لئے سازگار فضا پیدا کرنے کی خاطر بھی اِنہی حربوں سے کام لیا جائے گا۔

احیائے ہندومت کا پہلا شکار مسلمان تھے

اِس نئی تحریک نے سب سے پہلے مسلمانوں کے خلاف قوّت آزمائی شروع کی مسلمان بھی تو آخر غیرملکی ہی تھے، اور پھر اِس میں سہولت یہ تھی کہ وہ کمزور تھے۔ برطانوی حکومت اور اُس کے افسر مسلمانوں کی جنبہ داری کرتے تھے۔ مسلمانوں پر حملہ کر کے حکومت کو مسلمانوں کی حمایت اور ہندوؤں کی مخالفت پر مجبور کیا جاسکتا تھا۔ اگر یہ ہوگیا تو حکومت اور ہندومت میں تصادم رونما ہو جائے گا۔

حکومت نے قانون شکنی کرنے والوں کے خلاف سختی سے کام لے کر تحریک کو فوری طور پر دبا دیا۔ لیکن تحریک کے بانی بعض مخصوص طبقات میں یہ خیال پھیلانے میں کامیاب ہو چکے تھے کہ برطانوی راج مسلمانوں کا حامی ہے، اور ہندوؤں کا دشمن۔

اِس کے بعد طاعون پھیلا۔ حکومت نے وباء کی روک تھام کے لئے جو اقدامات اختیار کئے وہ سخت غیر ہر دلعزیز تھے۔ حکومت کے افسر قتل کر دیئے گئے، اور پھر دوسرے لوگوں کے قتل کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ قاتل اکثر ایسے نوجوان برہمن ہوتے تھے جن پر شیواجی کے فلسفہ کا رنگ چڑھ چکا تھا۔

تحریک عوام میں مقبول ہونے کے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ مرہٹے اور کنبھ ساری تحریک کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ برہمنوں نے شیواجی کے وارثوں سے راج چھین لیا تھا۔ مرہٹوں کو اب یقین نہ آتا تھا کہ برہمنوں کو پھر اسی سلطنت میں برسرِ اقتدار لانے کی کوئی فوری ضرورت ہے، جو برہمنوں نے پہلے شیواجی کے وارثوں سے چھینی اور پھر اجنبیوں کے ہاتھ کھو دی۔ مرہٹے برہمنوں کا احترام تو کرتے ہیں، لیکن اُن کا اعتبار نہیں کرتے۔ یہی تحریک کا سب سے زیادہ کمزور پہلو تھا۔ برہمن

بھول جاتے تھے کہ مرہٹہ سلطنت، پہاڑی مرہٹوں کی تلواروں اور کنبھ کے نیزہ بازوں کے زور سے قائم ہوئی تھی۔ اگر شیواجی کو اِن دلیروں کی امداد حاصل نہ ہوتی تو اُس کا خنجر مسلمانوں کا خون چاٹ کر بھی کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکتا۔

شورش بنگال میں پھیلتی ہے

اسی دوران میں تحریک بنگال تک پھیل گئی۔ بنگال وہ صوبہ تھا جہاں انگریزی تمدّن کی جڑیں سب سے زیادہ گہری جا چکی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ بنگال میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور ردِّ عمل بھی سب سے زیادہ تھا۔ بنگالی کبھی جنگجو نہ تھے۔ وہ ہر حکمران کے بعد دوسرے حکمران کی اطاعت بڑی لاپروائی سے برداشت کر لیتے رہے۔ بنگال میں نظم و نسق کا ایک خاص نظام رائج ہے۔ دوامی بندوبست کے باعث یورپین افسروں کو عام لوگوں سے زیادہ واسطہ نہیں پڑتا۔ یورپین افسر تو بس قاضی اور کوتوال کے فرائض ہی سر انجام دیتا ہے۔ یہ فرائض ضروری تو ہیں اور مفید بھی ہیں، لیکن عوام کے لئے کچھ زیادہ خوش آیند نہیں۔ پڑھے لکھے بنگالی بابوؤں کا بڑی بدتمیزی اور کینہ سے مذاق اڑایا جاتا تھا۔

بنگالیوں کو ہمیشہ سے یہ شوق رہا ہے کہ وہ انگریزی راج کی لاپرواہی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سرکار پر شدّت سے حملے کرتے رہیں، اور اِس طرح اپنی بہادری کا ثبوت دیں، کیونکہ انہیں دوسروں سے سنتے سنتے خود بھی اپنی دلیری کے متعلق شک ہو چکا ہے۔ اب تقسیم بنگالہ کی تجویز سن کر بنگالیوں میں اور بھی شورش پھیل گئی۔ بنگال کا صوبہ بہت وسیع تھا۔ کئی علاقوں میں کلکتہ سے براہ راست جانا بھی ممکن نہ تھا۔ یہی وہ علاقے تھے جہاں مسلمان آبادی کی اکثریت تھی۔ حکومت نے اِن مسلمان علاقوں کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ ہندو زمیندار اور ہندو سود خوار اُن پر خوب ظلم توڑتے تھے۔

مناسب سمجھا گیا کہ اس لمبے چوڑے صوبہ کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے، اور مشرقی اضلاع کو آسام کے چھوٹے سے صوبہ کے ساتھ ملا کر ایک نیا صوبہ بنا دیا جائے۔ اِس تجویز سے سیاسی طور پر بیدار بنگالیوں کو تشویش لاحق ہو گئی۔ اُنہیں ڈر تھا کہ اس طرح صوبہ کے ایک وسیع اور زرخیز ٹکڑے سے اُن کا رسوخ ختم ہو جائے گا۔ اُنہیں یہ گوارا نہ تھا کہ مسلمان اپنے آپ میں آ جائیں۔ تقسیم سے یہ بھی خوف تھا کہ کلکتہ کے ہائیکورٹ

کے حلقۂ اقتدار میں کمی واقع ہو جائے گی۔ اِس کا نتیجہ تو یہ بھی نکل سکتا ہے کہ بندوبستِ دوامی بدل دیا جائے۔ چاروں جانب سے ایک وحشیانہ صدائے احتجاج بلند ہوئی۔

جنم بھومی کی تقسیم "دیوی" اور "ماں" کے دو ٹکڑے کر دینے کے برابر ہے

سرکار نے اس احتجاج کو حقارت سے نظر انداز کر کے اپنی تجویز پر عمل جاری رکھا۔ تقسیم یوں بھی کوئی اچھا نام نہیں۔ اِس سے پولینڈ کی تقسیم اور اِس قسم کے دوسرے مظالم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ تقسیم کا لفظ کان میں پڑے تو ایسے معلوم ہوتا ہے گویا کسی زندہ شئے کے دو ٹکڑے کئے جا رہے ہیں۔ اگر بنگال کو بنگالی نسل کی "ماں" سمجھا جائے تو بنگال کی تقسیم سے کسی کی آنکھوں کے سامنے اُس کی زندہ ماں کو دو ٹکڑے کر دینے کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ اور ماں کا قتل ایک ایسا بھیانک فعل ہے جسے کوئی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ اتّفاق ایسا تھا کہ عوام میں پہلے سے بنگال کو ایک "دیوی" سمجھنے کا رجحان موجود تھا۔ مختصر یہ کہ نظم ونسق کا ایک معصومانہ فعل، مادر کُشی اور دیوتاؤں سے لڑائی مول لینے کے مترادف سمجھا جانے لگا۔

یہ تو آپ کو یاد ہی ہوگا کہ خالقِ اولے نے اپنے آپ کو دو حصّوں

میں بانٹ لیا تھا۔ شیو دیوتا قوائے رجولیت کے نمائندہ تھے، اور پاربتی دیوی خصائص نسائیت کی مظہر تھیں۔ دیوی کی پوجا بنگال میں عام تھی۔ دیوی خبیث راکھشوں کو تباہ کر دیتی تھی، اور نسل انسانی یا ہندو مت کے دشمنوں کو ملیا میٹ کر دیتی تھی۔

ہندوستانی سادھوؤں کا دستور ہے کہ سارے ہندوستان کا چکر کاٹ کر مقدس یاتراؤں کی زیارت کرتے ہیں۔ اس دور میں بارہ برس لگ جایا کرتے تھے۔ ان زائرین کا آجکل بھی قاعدہ ہے کہ قافلے بنا کر چلتے ہیں۔ جب برطانوی سرکار کا راج قائم نہ ہوا تھا، تو ہر دور اندیش یاتری ایسے ہی کسی قافلہ کے ساتھ ہو لیتا تھا۔ ان میں سے اکثر یاتری جنگجو بھی ہوتے تھے۔ ایک جنس کے لوگ اکٹھے ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اٹھارویں صدی میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی کہ اس قسم کے مذہبی دیوانوں کے قافلے ہزاروں کی تعداد میں گھومتے پھرتے تھے۔ وہ خوب مسلح ہوتے تھے، اور ایک قسم کے فوجی ڈسپلن کے ماتحت رہتے تھے۔ زمانہ بدامنی کا تھا۔ جب کبھی ہتھیار بند آدمیوں کی ضرورت پڑتی تو راجے مہاراجے اس قسم کے آوارہ گرد مسلح قافلوں کو عارضی تنخواہ دار سپاہیوں کے طور پر ملازم رکھ لیا کرتے تھے۔ بسا اوقات یہ گروہ خود اپنے

سرداروں کے ماتحت لوٹ مار بھی کرتے پھرتے تھے۔ کئی دفعہ تو انہوں نے حالات ساز گار پاکر اپنی جداگانہ ریاستیں بھی قائم کر لیں۔ وارن ہسٹینگز کے زمانہ میں ایک ایسے ہی مسلح قافلہ کی برطانوی سپاہیوں اور مسلمان سپاہیوں کے ایک ملے جلے چھوٹے سے دستہ کے ساتھ مڈبھیڑ ہو گئی۔ سادھوؤں کے گروہ نے فتح پائی۔ اور برطانوی دستہ وہیں ڈھیر کر دیا گیا۔ اُن دنوں اِس واقعہ کا بڑا چرچا ہوا تھا۔ یہ تو ہندوستان کا اُن دنوں بھی قاعدہ تھا، اور آجکل بھی رواج ہے کہ برطانوی افواج کو ذرا سی ناکامی ہو جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ بس برطانوی سلطنت کا آخری وقت آپہنچا۔ لیکن سادھوؤں کی فتح سے مزید کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اُنیسویں صدی کے وسط میں ایک قابل بنگالی مصنف نے سروالٹر اسکاٹ کی نقل کرتے ہوئے سادھوؤں کی اِس فتح کو افسانوی رنگ دے کر ایک ناول لکھ مارا۔ اِس ناول میں دیوی کے بڑے گن گائے گئے تھے۔ اور کہا گیا تھا کہ "دیوی کے پجاریوں نے انگریزوں کو عبرت ناک شکست دی۔" مصنف نے دیوی کی تعریف کچھ ایسے گول مول الفاظ میں کی تھی کہ یہ نہ کھلتا تھا کہ یہ دیوی، بھارت ہے یا بنگال، یا سچ مچ کی دیوی یا ایک ایسی دیوی جو اُس وقت رونما

ہوگی جب اُس کی قتل و غارت کی قوتیں اپنا کام کر چکیں گی، اور دیوی اپنے رحم دلی کے اصلی روپ میں بحیثیت خالق اور رازق کے ظاہر ہوگی۔ یہ ناول تو برطانوی سرکار کو فی زمانہ تسلیم کر لینے کی تلقین کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ سرکار کو خدا نے اس لئے مقرر کیا ہے تاکہ ہندوستانیوں کو ایک برتر تمدن کی تعلیم دے۔ ہاں مصنف طبعی طور پر یہ توقع ظاہر کرتا ہے کہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب انگلستان اپنا خدا کی جانب سے سونپا ہوا منصب پورا کر چکے گا، اُس وقت ایک تازہ دم ہندوستان برطانیہ کی راہنمائی کا محتاج نہ ہوگا۔ اِس کتاب میں ایک ترانہ بھی تھا جس کا عنوان تھا: بندے ماترم، یعنی "اماں بی کے حضور کورنش بجا لاؤ!"۔ اِس نظم میں دیوی کے قصیدے بڑے اُونچے سُروں میں الاپے گئے ہیں۔ یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ وہ کونسی دیوی ہے۔ البتہ اُسے "دکھوں سے بچانے والی"، "اُمیدیں دلانے والی"۔ اور "ہندوؤں کو پناہ دینے والی" کے اسماء سے یاد کیا گیا ہے۔

غرض یہ "ماں" جو بنگال تھی، یا ہندوستان تھی، یا دیوی تھی، یا اور کوئی ایسی ہی عظیم المرتبت روحانی قوت تھی، جس نے ابھی اپنے آپ کو ظاہر نہ کیا تھا، اب دو ٹکڑے کر دیئے جانے کے

خطرہ سے دوچار تھی۔ ماں کے جسم کے پرزے اُڑنے والے تھے۔ مادرِ وطن کی بہترین اراضی مسلمانوں کے حوالے ہونے والی تھی۔ اور ہندؤوں کے گلے میں انگریزوں کی غلامی کی رسّی کا پھندا اور بھی مضبوط ہونے والا تھا۔ ان حالات میں جو شورش مرہٹوں کے علاقہ سے شروع ہوئی تھی، اب اُس نے بنگال میں عام مقبولیت حاصل کرلی۔ جہاں مہاراشٹر میں شورش کی قیادت شیؔو مہاراج کر رہے تھے، وہاں بنگال میں اِس تحریک کی رہنمائی اُن کی زوجۂ محترمہ یعنی پاربتی دیوی کے ہاتھ میں تھی۔

پاربتی دیوی نے اب "کالی دیوی" کا روپ دھار لیا!

نوجوان محبِّ وطن بنگالیوں نے اپنی اُمیدوں کی دیوؔی کو فی الواقع جو روپ دیا، اُس کے متعلق کچھ زیادہ شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی، اُن کے نزدیک دیوی کا مظہر کالی دیوی تھی، وہ خون آشام اور سیاہ رنگ دیوی جس کی پرستش جادوگر کرتے ہیں، جس کے پجاری حرام گوشت کھا کر، ناجائز نشوں کے سرور سے نڈھال ہو کر، تاریکی کے وقت، اجاڑ مقامات پر، تعیش کی وحشیانہ محفلیں قائم کرتے ہیں، اور اپنی شہوتوں کی دل بھر کر تسکین کرتے ہیں۔ کالؔی خون پیتی ہے، مقتول کی لاش پر مجنونانہ رقص

کرتی ہے، گلے میں مُردوں کی کھوپڑیوں کی مالا پہنتی ہے، اور ہر وبا کو نازل کرنے کا اہتمام بھی اُس کے سپرد ہے۔ یہ دیوی جلد ہی اپنے بھیانک روپ میں ظاہر ہو کر، اپنے دشمنوں سے بدلہ لے گی۔

دیوی کی پوجا تو ہمیشہ سے بنگال میں مقبول تھی۔ اب پہلے سے دس درجہ زیادہ اور بھی مقبول ہو گئی۔ اِس کا رواج ایسے علاقوں میں بھی چل نکلا، جہاں اگرچہ لوگوں کو دیوی کے وجود کا علم تھا، لیکن پوجا وہ زیادہ مہذّب دیوتاؤں کی کرتے تھے، اور کالی کی پوجا کو نیچ ذاتوں سے مخصوص سمجھتے تھے۔

مرہٹوں میں دیوی کی پوجا ماضی میں صرف ایک خاص مقصد کے لیے ہوتی آ رہی تھی۔ دیوی کا سب سے بڑا تہوار موسم برسات کے اختتام پر منعقد ہوتا تھا۔ اُس وقت ندّی نالوں کو پار کر کے، لوٹ مار کے لئے گھر سے باہر نکلنا ممکن ہو جاتا تھا۔ مہاراشٹر میں دیوی کو اُس طرح سے قومی معبود کا رتبہ حاصل نہ تھا جیسا کہ بنگال میں اُسے حاصل تھا۔ بنگالی جن رسموں سے دیوی کی پوجا کرتے تھے مرہٹوں کو نہ اُن کا علم تھا، اور نہ وہاں اُن کا عام رواج تھا لیکن اب تو ایسے نظر آتا تھا کہ دوسری تمام یاترائیں چھوڑ کر سب لوگ

دیوی کے مندر میں ہی اکٹھے ہوا کریں گے۔

لوگوں میں عام چرچا تھا کہ دیوی پیاسی ہے۔ وہ خون پینا چاہتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کا خون پینا چاہتی ہے۔ اب کے دیوی کے سامنے جو بکریاں بھینٹ چڑھائی جائیں گی اُن کے سینگ نہ ہونگے، اور اُن کی چمڑی کا رنگ سفید ہوگا۔

فیل شدہ گریجویٹوں کی بغاوت

بعض خاص طبقات میں یہ نیا مذہب بڑی سرعت سے پھیلا اِس دھرم کا پرچار کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اسٹیج پر تقریریں سنئے یا اخبارات میں مضامین پڑھئے، ہر جگہ ہندوستانی نوجوانوں سے فصیح و بلیغ اپیلیں کی جاتی تھیں کہ وہ "ماں" کی مصیبتوں کا علاج کریں۔ دیوی کو پرسن کرنے کے لئے خون بہانے کی ضرورت ہے۔ یہ وعظ و تلقین بے اثر نہ رہی۔ ہندوستان فیل شدہ گریجویٹوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ نوجوان ایسے تعلیم یافتہ طبقات سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے نئی تہذیب کی تعلیم پائی تھی، لیکن اُن میں یہ قابلیت اور محنت کی ایسی استعداد نہ تھی جس سے وہ معمولی ڈگری حاصل کرسکتے جو سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے ضروری تھی۔ اُنھوں نے جو تعلیم پائی تھی اُس نے اُنہیں سوائے سرکاری ملازمت کے اور

کسی کام کا نہ رکھا تھا۔ وہ غریب تھے۔ وہ مضطرب تھے۔ اِس لئے وہ اُس نظام کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اُنہوں نے کالجوں میں تعلیم پائی تھی۔ یہ کالج بغاوت کی درسگاہ تھے۔ یہ پڑھے لکھے کنگال مذکورۂ بالا نئی تحریک کے عقائد بسرعت قبول کر رہے تھے۔ جیسے کہ ہمیشہ ہوا کرتا ہے اِن لوگوں کی صفوں میں جلد ہی ایسے قابل اور اعلےٰ درجہ کے انسان بھی آشامل ہوئے جو اپنی ذاتی وجوہات کی بنا پر رائج الوقت نظام سے بیزار تھے۔

سارے ملک میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایسی ٹولیاں پیدا ہو گئیں جو آمادۂ بغاوت، اور جرم پر مائل تھیں۔ اِس تحریک کی تنظیم کرنے والوں نے متحدّہ آئرلینڈ کے حامی شورش پسندوں کی مثال اپنے سامنے رکھی۔ لیکن جب عمل کرنے کی نوبت آئی تو ہر ایک رکن کو دوسرے رکن سے بے خبر رکھنا، اور ہر ٹولی کو دوسری ٹولی سے لاعلم رکھنا، ہندوستان میں ناممکن ثابت ہوا، کیونکہ ہندوستانی راز کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ پھر بھی نوآموزوں کو تاریکی میں لے جا کر ٹولی کے اندر شامل کیا جاتا تھا۔ وہ اُس شخص کا چہرہ نہ دیکھ سکتے تھے جو اُن سے خلافِ قانون حلف اُٹھواتا، یا جو اُن سے غیر مقدّس

رسوم ادا کرواتا تھا۔ اِن مختلف ٹولیوں کے اراکین ایک دوسرے کے ساتھ اُنہی رشتوں سے وابستہ رہتے تھے جن رشتوں سے قدیم مصر کے جادوگر ایک دوسرے کے ساتھ متعلق ہوا کرتے تھے۔

اِن ٹولیوں سے ہر جگہ خطرہ پیدا ہو گیا۔ یہ تو سچ ہے کہ سوائے بنگال کے اس تحریک میں ملک کے عام باشندے کہیں شامل نہ ہوئے۔ عوام میں ناٹک، مذہبی کتابوں کے پاٹھ، اور نظم گوئی سے تعصّب کا جنون پھیلانے کی تمام کوششیں رائگاں گئیں تاہم قتل و غارت کا تذکرہ اکثر کرتے رہنے سے معاملہ کبھی کبھی تذکرہ سے آگے بھی بڑھ جایا کرتا ہے۔ لیکن اِس طرح کسی مسلح بغاوت کی توقع حماقت سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی پھر بھی اسکول، کالج، اور اخبارات جب اِس قسم کے عقائد سے مسموم ہو چکے ہوں تو آئندہ نسلوں کی بہتری کی کیا اُمید ہو سکتی ہے۔ سرکار انہیں کالجوں سے ادنیٰ سرکاری ملازمین بھرتی کرتی تھی۔ اگر تمام ادنےٰ سرکاری ملازمین کو شروع سے یہ یقین دلا دیا جائے کہ سرکار اُن کے مذہب کی دشمن ہے، تو پھر سرکاری ملازمین میں وفاداری کس طرح قائم رکھی جا سکتی ہے۔

حکومت کمزور ہو تو فساد پھیلتے دیر نہیں لگتی

بنگال میں حکومت کا انتظامی پہلو کمزور تھا۔ اِس لئے یہاں یہ تحریک مقبولِ عام ہوگئی۔ باغیوں کی ٹولیوں نے بلوائی ہجوم اکٹھے کر کے بازاروں کو خوفزدہ کر دیا۔ تشدّد کے ذریعہ روپے اکٹھے کئے گئے۔ انگریزی مصنوعات تباہ کر دی گئیں۔ حکومت کا انتظامی شعبہ ایسا کمزور تھا کہ بدامنی کی کھلی مثالوں کا بھی تدارک نہ کر سکا۔

بنگال میں سیاسی ڈاکوں کا رواج بھی چل نکلا۔ جس طرح شیواؔ جی نے اُن قافلوں کو لوٹ کر اپنا خزانہ بھرا تھا جو مغربی گھاٹ کے پہاڑی دروں سے گذرتے تھے، اسی طرح اب دیویؔ کے پجاریوں نے اپنے اُن ہموطنوں کو لوٹ کر رقم جمع کرنے کی ٹھانی جو دولت مند تھے، بچاؤ کا کوئی ذریعہ نہ رکھتے تھے، اور سرکار کے ایسے وفادار تھے کہ اُن کو تباہ کرنا جائز سمجھا جا سکتا تھا۔

اس کے بعد قتل کا سلسلہ جاری ہوا۔ پہلا شکار تو کچھ یورپین افسر تھے۔ لیکن دیویؔ کو کچھ یورپین افسروں کے خون کی بھینٹ ہی کی خاص ضرورت نہ تھی۔ وہ ہندوستانیوں کا خون قبول کرنے کو بھی تیار تھی، بشرطیکہ وہ حکومتِ ہند کے وفادار ملازم ہوں، یا کم از کم اِس نابکار گورنمنٹ کے خیر خواہ ہوں۔ جہاں کہیں

تحریک کا وجود تھا وہاں قتل کی وارداتیں عام ہوتی تھیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سلسلہ سوائے اودھ، وسطِ ہند، پنجاب اور سندھ کے سارے ملک پر پھیلا ہوا تھا۔ جن صوبوں کا ذکر کیا گیا ہے اِن میں یہ نئے اعتقادات نہ پھیلے تھے۔ دیسی ریاستوں میں اِن اعتقادات کی تلقین کی کوئی خاص کوشش نہ کی گئی۔

"پن" کی خاطر "پاپ" بھی جائز ہے

یہ تحریک عجیب بھی تھی اور دلچسپ بھی پہلی واضح بات تو یہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف ردِّ عمل لامحالہ شدید ہوگا، ورنہ برہمنوں کے لئے دنیاوی معاملات میں حصّہ لینا بجائے خود ناجائز ہے، کیونکہ ایک ذات کا کام کسی دوسری ذات کے ہاتھ سے انجام پانا دھرم کے زوال کی علامت ہے۔ جب کبھی ایسا ہو تو کوئی دیوتا انسانوں کو نجات دلانے اور آزاد کرانے کے لئے زمین پر ظہور کرتا ہے۔ یہ اصول بجائے خود ایک بدعت تھا کہ ہندو انسانی خون بہانا مذہبی فرض سمجھیں۔ اُن کا مذہب اُنہیں کسی جاندار کو دکھ پہنچانے سے منع کرتا ہے۔ غرض ہندو اب ہندو دھرم پر عمل نہ کر رہے تھے، وہ تو ایک اجنبی تمدّن کا مقابلہ کرنے کے لئے، وحشت و بربریت کا کوئی خونخوار دھرم تازہ کر رہے تھے۔ بدروحوں کی حاضرات کا

عمل تو کچھ ایسا مشکل نہیں، لیکن جب وہ ایک مرتبہ حاضر ہو جائیں تو پھر اُن کو رخصت کر کے جان چھڑانی ذرا مشکل ہوتا ہے۔

اِس نئے دھرم کو ماننے والوں کی جسمانی خصوصیات بھی خواہ نخواہ جاذبِ توجہ تھیں۔ برہمن آریا، نسل کا مکمل ترین جسمانی نمونہ ہے، جس نے قرن ہا قرن سے اپنی ذہانت اور خون کو محفوظ رکھنے کے لئے توالد و تناسل کے قوانین پر سختی سے عمل کیا ہے۔ برعکس اِس کے، نئے دھرم کے پیرو زیادہ تر ایسے جوشیلے نوجوان تھے، جن کے جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے، پیشانیاں اندر دھنسی ہوئی تھیں، دانت باہر نکلے ہوئے تھے، اوپر کا ہونٹ آگے لٹکا ہوا، اور بیچ میں سے پھٹا ہوتا تھا، جسم کی کھال چکنی اور پسینہ سے تر آلود رہتی تھی، غرض "شکلش ببیں حالش مپرس" کا نقشہ تھا۔ اِن لوگوں کی جسمانی حالت، اُن کے اخلاقی زوال کی آئینہ دار تھی۔ اُن کی اس خرابیٔ صحت کی وجہ وہ غیر فطری عادات تھیں، جو بجائے خود اُن کی پست ذہنیت کو ظاہر کرتی تھیں۔ یہ نیا دھرم ہندو مت کے غیر آریائی عناصر کی باغی ذہنیت کا ترجمان تھا۔ اِس کو ماننے والے بھی زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ہندو قوم میں غیر آریائی نسلوں کے نمائندہ تھے۔

یہ صحیح ہے کہ اِس نئے دھرم کے پیرو ویدوں کی اُس تفسیر کو نہ مانتے تھے جسے ساکھی کہا جاتا ہے۔ وہ اپنے اعتقادات کی بنیاد گیتاؔ پر رکھتے تھے۔ لیکن اُن کا استدلال کچھ یقین بخش نہ تھا۔ گیتا کھشتریوں کو لڑنے کی تعلیم ضرور دیتی ہے، اور یہ بھی کہتی ہے کہ دھرم کی حفاظت کے لئے تلوار اُٹھانا جنگ کی بہترین صورت ہے۔ لیکن گیتا برہمنوں کو تلوار اُٹھانے کی اجازت نہیں دیتی مختلف ذاتوں کے اختلاط کو روکنے کے لئے ہی تو بھگوانؔ نے کرشن کا روپ دھارا تھا۔ بھگوانؔ اُس شخص سے سخت ناراض ہوتے ہیں جو دنیا کی تلاش میں دھرم کے اصولوں کو پائمال کر ڈالے۔ مزید بریں ارجنؔ نے کھلے میدانِ جنگ میں تلوار اُٹھائی تھی۔ اُس نے چوری چھپے انفرادی قتل کا ارتکاب نہ کیا تھا۔ ارجنؔ کے ہتھیار تلوار اور تیر تھے، نہ کہ کٹار اور بم!

انگریز نے ہندوستانیوں کو نہتاؔ کر رکھا تھا

ہندو مذہبی دیوانوں کو یہ سب موانعات باز نہ رکھ سکے۔ مہم کے آغاز میں ہی اُنھوں نے عورتوں پر ہاتھ اُٹھانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ عام حالات میں اِن لوگوں کا عورتوں پر حملہ ہی اُن کی تحریک کو دیوی کے آشیرواد سے محروم کرنے کے لئے

کافی ہوتا۔ ہر مادہ ایک طرح پاربتی دیوی کا مظہر اور استھان ہے کسی عورت کو قتل کر کے جو خون دیوی کی بھینٹ چڑھایا جائے اُس سے دیوی سخت بیزار ہوتی ہے۔ باوجود اِن اصولوں کے مذہبی دیوانے اپنا کام کرتے رہے۔

اِن مذہبی دیوانوں کو اپنا کام چلانے میں بڑی دقّت یہ تھی کہ ہتھیار کہاں سے فراہم کریں۔ غدر کے بعد حکومت نے ہمیشہ بارودی ہتھیار ملک میں داخل کرنے، بیچنے یا قبضہ میں رکھنے پر پابندی لگائے رکھی۔ یہ پابندی پستولوں اور ریوالوروں پر خاص طور سے عائد تھی۔ صرف خاص خاص آدمیوں کو سخت شرائط کے ماتحت لائسنس دیئے جاتے تھے۔ ہندو مشین بنانے کا کام ٹھیک نہیں کر سکتے۔ نہ ہی اُنہیں کیمیاوی اجزا کو ملانے کی ترکیب آتی ہے۔ اِس وجہ سے اُنہیں ایک کارآمد بم بنانے میں خاصی دقّت پیش آئی۔ نہ ہی وہ اُس کو ایسے مصالحہ سے بھر سکے، جس کا پھٹ جانا یقینی ہو۔ اُنہوں نے بیرونی ممالک کے گماشتوں سے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ یہ بیرونی گماشتے اُن کی امداد کرنا بھی چاہتے تھے، لیکن بندرگاہوں پر حکومت کا قبضہ تھا۔ ہندو تلوار کے دھنی تو تھے ہی نہیں کہ اُن کا استعمال کر سکتے۔

ایسے بیرونی گماشتوں کا ایک مرکز لندن میں تھا۔ پھر وہ پیرس میں منتقل کر دیا گیا، اور وہاں سے انگلستان میں پڑھنے والے ہندوستانی طالب علموں میں پراپیگنڈا کرنے لگا۔ ایک اور مرکز بحرالکاہل کے امریکی ساحل پر واقع تھا۔ اُس کا رابطہ اُس تخریبی جماعت سے تھا جو بعد میں بالشوزم کی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوئی۔ برلن اور ماسکو میں بھی اِس جماعت کی شاخیں تھیں، اور وہاں کی حکومتیں "بندے ماترم" کی پوشیدہ طاقتوں سے لاعلم نہ تھیں۔ لیکن یہ تمام بیرونی گماشتے اسلحہ کی کمی پوری نہ کر سکتے تھے۔ وہ مقامی طور پر پراپیگنڈا کرتے تھے، خفیہ لٹریچر تقسیم کرتے تھے، وقتاً فوقتاً مالی امداد بھی دیتے تھے، لیکن وہ ملک کے اندر کافی تعداد میں بم یا ہتھیار داخل نہ کر سکتے تھے۔ وہ اِس میں تو کامیاب ہو گئے کہ بم بنانے کی ترکیب کے متعلق ایک رسالہ چھاپ کر مہیا کر دیا، لیکن نوجوان، نیم تعلیم یافتہ برہمنوں کو سائنس کی اتنی لیاقت حاصل نہ تھی کہ اس رسالہ میں لکھے ہوئے فارمولوں کو عملی جامہ پہنا سکتے۔

بحیثیتِ مجموعی اِس تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگال میں ایک حد تک بدامنی پھیل گئی۔ دوسرے مقامات پر ایک ناخوشگوار

شورش کا چرچا ہو گیا، اور کہیں اِکا دُکا قتل کی وارداتیں بھی ہو گئیں۔

"تہذیب" کے ستائے ہوؤں کی حالت قابلِ رحم تھی

شیو اور پاربتی کے پجاریوں پر انسان رحم کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اِن غریبوں کو "تہذیب" نے سخت ستایا تھا۔ اپنی ترقی کی رفتار میں زمانہ جن لوگوں کو کچل کر آگے بڑھ جاتا ہے، اُن پر انسان کو ہمیشہ رحم ہی کھانا چاہئیے۔ جوش اور شوقِ شہادت چاہے کسی بُرے مقصد کے لئے ہی کیوں ظاہر نہ کئے جائیں، ہمیشہ قابلِ احترام ہوتے ہیں۔ وطن اور دھرم کی خدمت پاکیزہ نصب العین ہے۔ کئی لوگوں نے اِن مقاصد کی خاطر اپنا وہ سب کچھ قربان کر دیا جو عام لوگوں کو زندہ رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر بھیڑیں جنون بوٹی چر جائیں تو کیا اِس میں چرواہے کا کچھ قصور نہیں؟۔

حکومت نے اِس تحریک کو تشویش کی نگاہ سے دیکھا لیکن سرکار اِس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ اچھی پوزیشن میں نہ تھی۔ جہاں تک روحانی اعتقادات کا تعلق ہے، حکومت کے پاس اس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ طاقت نہ تھی۔

مادی لحاظ سے بھی حکومت ایسی تحریکوں کے خلاف زیادہ اچھی طرح مسلح نہ تھی۔ حکومت کے اسلحہ خانہ میں دو چیزوں کی کمی تھی۔ اوّل تو ملک کا قانون اِن حالات سے نپٹنے کے لئے کافی نہ تھا جو ملک میں رونما ہو چکے تھے۔ دوسرے ملک کے قانون کو نافذ کرنے والے ضوابط تو اِس مقصد کے لئے اور بھی ناکافی تھے۔

اخباری جرائم کے خلاف قانون ناقص تھا

مثال کے طور پر کسی اخبار میں کوئی ایسا مضمون شائع کرنا تو قابلِ سزا تھا جس میں عوام کو ترغیب دی گئی ہو کہ کسی خاص شخص کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن اگر قتل کی تعریف میں ایک عام قصیدہ کہیں چھپ جائے تو اُس کی کوئی سزا نہ تھی۔ بہر حال مضمون نگار یا ایڈیٹر تو جرم کی پاداش میں قید کئے جا سکتے تھے، لیکن اخبار بدستور جاری رہتا۔ تجربہ سے ثابت ہوا کہ جتنی شدت سے کوئی اخبار حکومت کی مخالفت کرتا، اتنی ہی اُس کی فروخت بڑھ جاتی تھی۔ اِس لئے اخبارات کا رجحان یہ تھا کہ حکومت کی شدید سے شدید تر مخالفت کی جائے۔ جوشیلے نوجوانوں میں سے "قید ہونے والے ایڈیٹر" بآسانی دستیاب ہو جاتے تھے، جو اپنے آپ کو قربان کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ قربانی کے ساتھ ساتھ اُنہیں

اس میں بھی کچھ زیادہ اعتراض نہ تھا اگر تھوڑی دیر کے لئے شہادت کا تاج پہن کر اُن کا نام ہمیشہ کے لئے مشہور ہو جائے، اور ساتھ ہی کچھ مادی نفع بھی پہنچ جائے۔ ایڈیٹر کو سزا ہو جانے سے اخبار کی اشاعت میں کوئی کمی نہ آتی تھی۔ اگر کمی ہو بھی جاتی تو جو شرارت ہونی تھی وہ ہو چکی ہوتی تھی۔ ہندوستان کی مقامی بولیاں لٹریچر کے لحاظ سے کچھ زیادہ امیر نہیں۔ اگر کچھ لٹریچر ہے تو ایسی زبان میں لکھا ہے جو عام فہم نہیں۔ اس وجہ سے اخبارات عوام کے مطالعہ کے لئے واحد مواد بہم پہنچاتے ہیں۔ اگر اخبار کا ایک خریدار ہوتا ہے تو دس پڑھنے والے۔ دور افتادہ دیہات میں کوئی یورپین قرن ہا قرن سے داخل بھی نہیں ہوا۔ ان دیہات کو گورنمنٹ کے وجود کا بھی صحیح علم نہیں۔ ایسے علاقوں میں جب نوجوان اور بچے حکومت کے مظالم کی داستانیں پڑھتے ہیں، اور سنتے ہیں کہ فرنگی کیسے بدمعاش ہوتے ہیں، دیوی کی کیا توہین ہو رہی ہے، اور دیوی کتنی غضبناک ہو چکی ہے، تو اُن پر بڑا برا اثر پڑتا ہے۔ انہیں نوجوانوں میں سے مختلف ٹولیاں قتل کے مجرم منتخب کرتی تھیں، اور انہیں میں سے تحریک کے جوشیلے اور اندھے حامی پیدا ہوتے تھے۔

جلسوں کے متعلق قانون بھی تسلی بخش نہ تھا

علیٰ ہٰذا القیاس اگر کسی، عام جلسہ میں کوئی مقرر باغیانہ تقریر کرے تو اُسے سزا دی جا سکتی تھی، لیکن اِس قسم کے جلسوں اور محفلوں کا انعقاد بند نہ کیا جا سکتا تھا، چاہے اُن کا مقصد ایسی ہی باغیانہ تقریریں کروانا ہو۔

اگر کسی شخص کے قبضہ سے بم برآمد ہو تو جب تک اُس میں بارود بھرا نہ ہو اُس وقت تک اُس کو سزا نہ دی جا سکتی تھی۔ بارودی اور خطرناک ہتھیار قبضہ میں رکھنے کی سزا بھی معمولی تھی۔

یہ تو ملکی قانون کے ناکافی ہونے کی صرف چند مثالیں ہیں۔ اس قانون کو نافذ کرنے والے ضابطہ میں اِس سے بھی زیادہ خامیاں پائی جاتی تھیں۔

ضابطہ کی خامیاں قانون کی کوتاہیوں سے بھی زیادہ تھیں

صوبوں میں عدالتیں عرصہ سے انتظامی حکومت کے ساتھ متصادم چلی آتی تھیں، اور قوم پرستانہ تحریکوں کی حامی تھیں۔ اِن عدالتوں نے ایک اور ترکیب بھی نکال رکھی تھی، جس کے ذریعہ معمولی مقدمات میں بھی جو مجرم اعلیٰ وکیل کر سکتا ہو، وہ سزا سے قریب قریب محفوظ ہو جاتا تھا۔ اگر کوئی مجرم اعلیٰ وکیل کر سکتا ہو

اور اس کے ساتھ ہی قوم پرست بھی ہو تو پھر اُس کو سزا دلوانا محال تھا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی اخبار کسی مضمون کی ابتدا یوں کر دے کہ: "ہمیں افسوس ہے حکومت کے مظالم نے ملک میں حسبِ ذیل عقائد کی تبلیغ کا راستہ صاف کر دیا ہے": تو اس کے بعد وہ عوام کو قتل پر ابھارنے کی جوشیلی سے جوشیلی اپیل شائع کر سکتا تھا۔ ہاں صرف یہ احتیاط لازمی تھی کہ آخر میں مندرجہ ذیل فقرہ بڑھا دیا جاتا کہ: "یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمیں ان اعتقادات سے اختلاف ہے"۔ اس کے علاوہ عدالت کا یہ بھی فیصلہ تھا کہ اگر کوئی ملزم اقبالِ جرم کر لے، تو چاہے اقبالِ جرم کی داستان کتنی ہی مفصّل کیوں نہ ہو، اور چاہے اُس کا بیرونی ثبوت بھی مل جائے، چاہے یہ اقبالِ جرم رضاکارانہ طور پر کیا گیا ہو، لیکن اگر ملزم عدالت کے سامنے، اس اقبالِ جرم کے قبول ہونے سے پہلے اُس سے انحراف کر جائے تو پھر یہ اقبالِ جرم بطورِ شہادت استعمال نہ کیا جا سکے گا۔ یہ بھی عدالت کا فیصلہ تھا کہ مجرم کے شریکِ کار کی شہادت چاہے کتنی ہی سچی کیوں معلوم نہ ہو، پھر بھی ناکافی ہے۔ اگر یقین ہو جائے کہ اِس شہادت پر سزا ملنی چاہیئے، تب بھی شہادت کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو ایک مسلّمہ اصول تھا کہ پولیس جو شہادت بھی اکٹھی کرے اُسے

مصنوعی اور جعلی سمجھ جائے گا۔ انگریزی قانون کے مطابق ملزم پر الزام ثابت کرنے کے طریقے مشرق میں ناکافی ثابت ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ مشرقی گواہ معمولی مقدمات میں گواہی دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اس طریقہ کے مطابق کسی ملزم کو سزا دلانا بڑا مشکل تھا۔ گواہوں کو ہمیشہ یہی خطرہ درپیش رہتا تھا کہ شہادت ختم ہونے سے پہلے کہیں وہ خود قتل نہ ہو جائیں۔ مزید برآں ضابطۂ فوجداری کے ماتحت مقدمہ کی کارروائی کو کھٹائی میں ڈالنے کی کافی گنجائش موجود تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ ملزم کی گرفتاری سے لے کر آخری فیصلہ تک سالہا سال گذر گئے۔

حکومت نے مجبور ہو کر مجلسِ قانون ساز سے قانون میں ترمیم کی درخواست کی، اور مطلوبہ اختیارات حاصل کر لئے۔ حکومت اِن اختیارات کو سخت مجبوری کی حالت میں ہی استعمال کرتی تھی۔ غرض تحریک رک تو گئی لیکن ختم نہ ہوئی۔ اِکّا دکّا جرائم کی وارداتیں ہوتی رہیں، اور شورش تو بدستور جاری تھی۔

پنڈت جی کی اُمید بر آئی

پنڈت جی اِس تمام صورتِ حال سے مطمئن تھے۔ اب سرکار سکھّی کے بغیر حکومت نہ کر سکتی تھی۔ غالب امکان یہی تھا کہ انگلستان

کی رائے عامہ اس سختی کو پسند نہ کرے گی، اور سمجھے گی جو سرکار غیر معمولی اختیارات کے بغیر حکومت نہیں کر سکتی وہ ایک ناکام سرکار ہے اور اُس کے اختیارات دوسرے ہاتھوں کو سپرد کر دینے چاہئیں پنڈت جی آئر لینڈ کی مثال سے غافل نہ تھے۔ صاف نظر آتا تھا کہ برطانوی سرکار کو جہاں منت سماجت سے راضی نہیں کیا جا سکتا وہاں جرائم کے ارتکاب سے اُس کی رائے بدلی جا سکتی ہے۔ اب صرف مسئلہ اتنا باقی رہ گیا تھا کہ پنڈت جی کچھ دوسرے آدمیوں کی جانب انگلی اُٹھا کر کہہ سکتے کہ جو اختیارات موجودہ گورنمنٹ استعمال کرنے کے نااہل ہے، وہ فلاں متبادل شخصیتوں کے سپرد کر دیئے جائیں۔

اس کا کچھ زیادہ امکان نہ تھا کہ بندے ماترم پارٹی کو برطانوی رائے دہندگان میں زیادہ مقبول بنایا جا سکے۔ آئرلینڈ کا قومی جھنڈا جس پر کسی پہاڑی پھول کی نشانی ہے، برطانوی رائے دہندگان کی نگاہ میں بے ضرر ہو سکتا ہے، لیکن لنگم کو تو وہ ایک شرمناک علامت سمجھیں گے۔ انگلستان کے دیہاتی باشندے جس گلاب کی جھاڑی والی بھوتنی کا ذکر کرتے ہیں وہ ایک ہمدرد اور رحم دل شخصیت ہے، لیکن کھوپڑیوں کا ہار پہننے والی کالی دیوی

تو خونخوار ہے۔ چند بڑے زمینداروں، اُن کے گماشتوں، اور کچھ سیاست دانوں کا قتل برداشت کیا جاسکتا ہے، لیکن ایک ایسی تحریک جس کا بس چلے تو صرف کانپور میں ہی نہیں، بلکہ سینکڑوں شہروں میں بچوں اور عورتوں کی لاشوں سے کنویں پاٹ دے، کسی ہمدردی کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ عورتیں اور بچے انگریز نسل کے ہوں، تب بھی ایسی پارٹی کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اِن حالات میں پنڈت جی نے فیصلہ کیا کہ احیائے ہندو دھرم کی تحریک کو پس منظر میں رکھنا چاہئے۔ انگلستان میں لبرل خیالات کے حامیوں، اور انگریز وہابیوں، کو ہندو دھرم کے احیاء کی تجویز پسند نہ آئے گی۔

اعتدال پسند ممدوح الطرفین تھے

ہاں ایک پارٹی ایسی تھی جسے پنڈت جی بھی برسرِ اقتدار دیکھنے کے خواہشمند تھے، اور جس کا پروگرام شاید انگلستان کے اربابِ اختیار کی نگاہوں میں بھی جچ جائے۔

یہ پارٹی ہندوستانی اعتدال پسندوں کی پارٹی تھی حقیقی معنوں میں اعتدال پسند تو چند ہی ہوں گے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے انگریزی تمدن پوری طرح اختیار کر لیا تھا، اور وہ اِس

تمدّن کو اپنے ملکی تمدن پر ترجیح دیتے تھے۔ اُن کی رائے میں برطانوی راج فی الحال قائم رہنا چاہیئے تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ جب تک نیا تمدن بغیر غیر ملکی امداد کے لئے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ بن جائے۔ تب تک انگریزی راج قائم رہنا چاہیئے۔ اکثر اعتدال پسند برہمو سماج کے پیرو کار تھے۔ یہ لوگ تعداد میں قلیل تھے اُن میں سے اکثر بنگالی تھے۔ اُنھوں نے ایک ہندو مت پر مبنی موحدانہ دھرم اختیار کر لیا تھا۔ ہندو مت کے جن اجزا، کو وہ قابلِ اعتراض اور رجعت پسندانہ سمجھتے تھے، وہ انہوں نے ترک کر دیئے تھے۔ انگلستان کے موحدوں کی طرح اِن لوگوں کی تعداد مٹھی بھر تھی، اور اِس امر کے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے کہ اُن کے اعتقادات کبھی ملک میں پھیل سکیں گے۔ برطانوی موحدین کی طرح اس جماعت کے کئی اراکین بھی بڑی قابل ہستیاں تھیں۔ تمام اعتدال پسند برہمو سماج کے پیرو نہ تھے۔ اِن میں سے بعض لوگ اچھے خاصے پرہیزگار قسم کے ہندو تھے۔ اِس تمام گروہ کی تعداد بہت کم تھی۔ اگرچہ وہ سرکار کے جوشیلے حامی تھے، لیکن وہ سرکار کے لئے کوئی عوامی تائید حاصل کرنے کے ناقابل تھے۔ وہ اپنی قوم سے بالکل کٹ چکے تھے۔ اگر ملک میں اُن کا کچھ رسوخ تھا تو اُس کی بنیاد

اُن کی سیاسیات پر نہ تھی۔

حقیقی اعتدال پسندوں کے علاوہ ایک بڑی تعداد جعلی اعتدال پسندوں کی بھی تھی۔ درحقیقت یہ لوگ کٹر انتہا پسند تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہندو رجعت پسندوں کے خیر خواہ تھے، لیکن وہ ہندو رجعت پسندی کی کھلی کھلی حمایت پر تیار نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یا تو وہ ہندو رجعت پسندوں کے طریقۂ کار سے متفق نہ تھے اور اُسے خلافِ اخلاق سمجھتے تھے، یا وہ سمجھتے تھے کہ رجعت پسندی کے مقابلہ میں فریقِ ثانی کی جانب سے بھی مخاصمانہ رجعت پسندی جنم لے سکتی ہے، یا وہ شہادت کا مرتبہ حاصل کرنے پر آمادہ نہ تھے۔

وفادار رعایا کا پہلا فرض حکومت کی مخالفت ہے

اعتدال پسندوں کی تربیت وہگ اعتقادات کے مطابق ہوئی تھی۔ اُنہوں نے یہ سبق اچھی طرح یاد کر لیا تھا کہ وفادار رعایا کا سب سے پہلا فرض سرکار کی مخالفت ہے۔ یوں سرکار نے اپنے آپ کو ہندو رجعت پسندی سے محفوظ رکھنے کے لئے جو ہاتھ پاؤں مارے اس کی کسی نے تائید نہ کی۔ اگر اخبارات پر پابندی کے لئے کوئی قانون بنایا جاتا تھا، تو اعتدال پسند کہتے

تھے کہ ایسی حرکتیں ملٹن کی زندگی کے واقعات کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔ اگر کوئی سپیشل ٹریبونل قائم کیا جاتا تھا تو اُس کی تشبیہ سٹار چیمبر کورٹ اور بلڈی کونسل سے دی جاتی تھی۔ ہتھیاروں اور باغیانہ جلسوں پر کوئی پابندی عائد کی جائے تو بل آف رائٹس کا حوالہ دیا جاتا تھا۔ اگر مقدمہ چلائے بغیر گرفتاری کا مسئلہ پیدا ہوتا تو "آزادیِ رائے" کے نعرے بلند ہونے لگتے۔ اعتدال پسندوں کی روش کچھ اِس قسم کی تھی کہ: سرکار ہے تو بڑی نیک نیّت، لیکن فلاں فلاں سرکاری ملازم کا رویّہ بڑا قابلِ افسوس ہے، فلاں کا قتل ہے تو ایک رنجدہ واقعہ اور اِس سے ہندوستان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا ہے، لیکن . . . . امن اور قانون تو بہر حال قائم رہنے چاہئیں، لیکن . . . . کوئی عقلمند اور محبِّ وطن ہندو اِن وحشیانہ حرکات کو برداشت نہیں کر سکتا، لیکن . . ."

مطلب ایک لیکن لفظوں میں فرق ہے

تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ انتہا پسندوں کے جنگی نعروں میں تھوڑی سی لفظی تبدیلی کر دی جائے تو اُن کا ترجمہ اعتدال پسندوں کی لغت میں کرنا کچھ مشکل نہیں۔ انتہا پسند کہتے ہیں: "گائے کی رکھشا کرو"۔ اعتدال پسند کہتے ہیں: "قیاس غالب یہی ہے

کہ اگر علمِ خوراک کا مطالعہ ہندو علوم کی روشنی میں کیا جائے تو ناگزیر طور پر ثابت ہو جائے گا کہ ہندوستان کی آب و ہوا میں گوشت کھانا مفید نہیں۔ یوں ایک طرف گائے کا گوشت کھانا مضر ہے۔ دوسری طرف بیل زراعت کے لئے مفید ہے۔ اور تیسری طرف دودھ مہیا کرنے کے لئے گائے بہت ضروری ہے۔ اِن حالات میں کوئی ایسا قانون بنانا بہت ضروری ہے جس سے مویشیوں کا ذبح کرنا بند ہو جائے۔" انتہا پسند کہتے ہیں: "غیر ملکیوں کو وطن سے نکال دو۔" اعتدال پسند کہتے ہیں: "انگریزی خیالات اور انگریزی تمدّن جس سرعت سے ہندوستان میں خود بخود پھیل رہے ہیں، اُس کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اگر حکومت کا بوجھ ملک کے باشندوں ہی کو سونپ دیا جائے تو اِس سے خرچ کی بھی بچت ہو جائے گی۔ اور حکومت کی کارگزاری کی رفتار بھی تیز تر ہو جائیگی یہ ٹھیک ہے کہ فی الحال ملک میں انگریز سپاہیوں کو رکھنا ضروری ہے۔ لیکن اگر غیر ملکی تاجر یا غیر ملکی سرمایہ دار بھی ملک میں موجود ہیں تو اِس کے یہ معنی نہیں کہ اِس عظیم الشان ملک کے باشندوں میں سوداگرانہ قابلیت کا فقدان ہے، بلکہ اِس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حکومتِ ہند کا نظم و نسق غیر ملکیوں کی خاص سرپرستی کرتا ہے۔"

اعتدال پسند اور انتہا پسند ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں

غرض اگرچہ نوجوان انتہا پسندوں میں سے بعض "تشدد" حلقے اعتدال پسندوں کو "غیر ملکی حاکم کے ہاتھ میں بکے ہوئے غداروں" کے نام سے یاد کرتے تھے، لیکن پھر بھی دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی باہمی ضرورت خوب سمجھتی تھیں۔

اعتدال پسندوں کا خیال تھا کہ انتہا پسند تو لاعلاج ہیں لیکن ممکن ہے ان کے خوف سے ہمیں اُس حصار کے اندر داخل ہونے کی اجازت مل جائے جس میں اور کوئی رخنہ نظر نہیں آتا۔ ایسا ہو گیا تو اقتدار اور منصب کے متعلق اعتدال پسندوں کی طبعی تمنائیں پوری ہو جائیں گی۔ دوسری طرف انتہا پسند مطمئن تھے کہ جس حصار کی حفاظت اعتدال پسندوں کے سپرد ہو، چاہے وہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو، ایک دن اُسے انتہا پسندوں کے سامنے اپنے دروازے کھولنے پڑیں گے، کیونکہ انتہا پسندوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اُن کا عزم زیادہ راسخ ہے، اور پھر وہ دیوتاؤں کی راہ میں لڑ رہے ہیں۔

اکالیوں اور آریہ سماج کی جارحانہ تحریکیں

اس جگہ دوسری دو مذہبی تحریکوں کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم

ہوتا ہے۔ اگرچہ اِن تحریکوں کی ابتدا بندے ماترم کی تحریک سے بالکل مختلف طریقہ پر ہوئی تھی، لیکن اُن کا آغاز بھی مشرق اور مغرب کی یکجائی کا نتیجہ تھا۔

اس میں سے پہلی تحریک تو سکھ پنتھ کے مجاہدانہ احیاء پر مشتمل تھی۔ سکھ پنتھ ہمیشہ سے ہندوؤں کا درد خواہ رہا تھا۔ ہندو احیاء کا سکھ پنتھ پر بھی اثر ہوا۔ سکھ شیو مہاراج یا پاربتی دیوی سے امداد نہ مانگتے تھے۔ ہاں خالصہ کے دشمنوں کے خلاف گاہے گاہے "مقدس تلوار" ضرور بے نیام کر دی جاتی تھی۔ اِس سکھ تحریک کے خطرات ابھی پوری طرح ظاہر نہ ہوئے تھے۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں سکھوں نے انگریزوں سے جس وفاداری کا ثبوت دیا تھا، وہ اب ناپید ہو رہی تھی۔ یہ سمجھنے کے لئے کچھ زیادہ دور اندیشی درکار نہ تھی کہ اگر جنگجو سکھ برطانیہ سے بالکل منحرف ہو گئے تو پھر مادی لحاظ سے وہ اُس سے بدرجہا زیادہ خطرناک دشمن ثابت ہوں گے جتنے کہ زوال پذیر کوکناتھ برہمن اور امن پسند بنگالی خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ اسی بنا پر سکھوں کو قوم پرستوں کی صفوں میں شامل کرنے کی خاطر زبردست کوششیں شروع ہو گئیں، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ کوششیں پوری طرح کامیاب

بھی ہوئیں۔

دوسری تحریک وہ تھی جسے آریا سماج کا نام دیا جاتا ہے۔ اس تحریک کی ابتدا ایک ایسے "معجونِ مرکّب مذہب" کے طور پر ہوئی جس کی بنیادیں ہندومت پر استوار کی گئی تھیں۔ اِس مذہب کا بانی اسلام اور عیسائیت کی تعلیمات سے خوب واقف تھا۔ اُس نے اپنے حریفوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اُن کے ہی ہتھیار اختیار کر لئے۔ آریا سماجی بہرحال ہندو ہی تھے، لیکن اُنہوں نے بہت سی فرسودہ ہندو رسوم و رواج اور ہندوؤں کے ذات پات کے نظام کو چھوڑ دیا۔ اس طرح انہوں نے ہندومت کی روح کو بچالیا، اور دھرم کو ایسے لوگوں کے لئے بھی قابلِ قبول بنا دیا جو دھرم کی شرطیں پوری کرنے میں ذرا سست تھے۔ قدیم خیال کے ہندو اِس نئی تحریک کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے، لیکن اِس نے جلد ہی اپنی قدر و قیمت ثابت کر دی کیونکہ کئی ہندو ایسے تھے جو قدیم ہندومت سے تنگ آچکے تھے۔ یہ لوگ لامذہب ہو جاتے، یا عیسائی ہو جاتے، یا برہمو سماج بن جاتے۔ آریہ سماج نے اِن کو معقول رعائتیں دے کر اُنہیں ہندومت کے دائرہ کے اندر رکھا۔ کئی لوگ ہندومت کو ترک کر کے اسلام یا عیسائیت

کا دین اختیار کر رہے تھے۔ پرانے ہندو خیال کے مطابق ہندو مت کو چھوڑ کر جانے والے اگر پھر واپس آنا چاہیں تو اُن پر توبہ کا دروازہ بند تھا، چاہے اُنہیں جبراً ہی ہندو مت سے گمراہ کیا گیا ہو، یا چاہے اُن کی تبدیلیٔ مذہب محض ایک ہنگامی وہم کا نتیجہ ہو۔ پرانے ہندو مت کے خیال سے وہ "جاتی" سے خارج ہو چکے تھے، اور اب اُن کے لئے "جاتی" میں واپس آنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ آریہ سماج نے ایسے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور "شُدھ" کر کے دوبارہ ہندو مت میں داخل کر لیا۔ اس کے علاوہ کئی ایسی نسلیں بھی تھیں جو قریب ہندو تھیں، لیکن انہیں ہندو "جاتی" میں شامل نہ سمجھا جاتا تھا۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ اگر اُن کو ہندو مت میں داخل کر لیا جائے تو اِس طرح اُن کا معاشرتی رتبہ بلند ہو جائے گا۔ جب اُنہیں ہندو مت سے باہر رکھا جاتا تھا تو وہ اسلام یا عیسائیت قبول کرنے کی جانب مائل ہو جاتے تھے۔ آریا سماج نے اِن نسلوں میں بھی اپنا پرچار شروع کیا۔ اِس پرچار سے اگر وہ نسلیں کٹّر ہندو نہ بن گئیں، تو کم از کم ہندو مت کے حریف دونوں تبلیغی مذاہب کے چنگل میں پھنسنے سے بھی بچ گئیں۔ غرض آریا سماج ایک قسم کی بے قاعدہ فوج تھی جو ایک

ایسی طاقت کی حمایت میں لڑ رہی تھی جسے اُس پہ پورا اعتماد نہ تھا، لیکن جو اُس کی امداد قبول کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کرتی تھی۔ جلد ہی آریا سماج میں ایک جارحانہ، مجاہدانہ اور مبلغانہ روح پیدا ہوگئی، جس نے آریا سماج کو عیسائیت اور اسلام کے لئے ایک خطرہ بنا دیا۔ غرض آریا سماج چھوٹے پیمانے پر ہندو ردِ عمل کا ایک اچھا خاصہ مظاہرہ اور نمونہ تھا۔ اُس کی آفرینش مشرق اور مغرب کے ملاپ سے ہوئی تھی، لیکن اِس ناجائز ازدواج کا یہ بچہ اس قسم کی دوسری تمام غیر طبعی اولادوں کی طرح، گو اپنی ماں کو بھی حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، مگر اپنے باپ سے تو اُسے نفرت تھی!۔

مسلمان فی الحال سوئے پڑے تھے

ابھی تک اسلام خوابِ استراحت میں تھا۔ اِس نیند سے بیدار ہونے کے لئے اُسے ابھی کئی شدید صدمات برداشت کرنے تھے۔ اِن صدمات نے اسلام کو بیدار ہونے پر ہی مجبور نہ کر دیا، بلکہ اُسے اپنی پرانی زرہ بکتر پہن کر، اپنے قدیم دشمن کے خلاف رزم آرا ہونے پر بھی مجبور کر دیا۔ ہندوستان میں مدت سے ہندوؤں کے ساتھ میل ملاپ اور تعاون نے اسلام کو

اُس کی شدید عصبیّت سے بڑی حد تک محروم کر دیا تھا۔ دین پر ہندومت بہت کچھ اثر انداز ہو چکا تھا۔ کئی ہندوستانی مسلمان مقامی نامسلموں کی اولاد تھے، جنہوں نے اپنا پرانا دھرم کچھ زیادہ رغبت سے ترک نہ کیا تھا، اور مائیں تو قریب قریب سب کی ہندو عورتیں تھیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے کئی علمائے دین، زُہّاد، اور اولیاء اللہ ہو چکے تھے، لیکن فضاء ابھی تک ایک سفر کرنے والے قافلہ کی تھی۔ سوائے سندھ کے اب اُن صوفیاؔ کا کہیں کوئی قابلِ ذکر سلسلہ باقی نہ تھا جو دنیائے اسلام کے اکثر مقامات پر، جہلائیں "شریعت" پر عمل کا جوش زندہ رکھتے ہیں۔ ترکی اور ایرآن کے مسلمان ہندی مسلمانوں کو کافر سے تھوڑا ہی بہتر سمجھتے تھے۔ اِسی وجہ سے مسلمانوں نے دین کا نام لے کر، برطانوی راج کی توسیع کی مخالفت نہ کی تھی، بلکہ مسلمانوں نے تو برطانوی راج کو خوش آمدید کہا تھا۔ ہندو مشرک تھے، اور ہر متدیّن مسلمان پر اُن کا قتل واجب تھا۔

اسلام کی رو سے عیسائی اہلِ کتاب ہیں

برعکس اِس کے عیسائی "اہلِ کتاب" تھے۔ اِس وجہ سے اُن سے اُس قسم کی نفرت نہ کی جاتی تھی جیسی ہندوؤں سے کی جاتی تھی۔

شروع شروع کے زمانہ میں کمپنی کے ملازموں کی عیسائیت بھی کچھ زیادہ نمایاں نہ تھی۔ بعد میں سرکاری افسروں کی صفوں میں بعض جوشیلے عیسائی بھی پائے جاتے تھے، لیکن یہ لوگ زیادہ تر تقدیر پرست اور جبریہ عقیدہ رکھنے والے عیسائی تھے۔ تقدیر پرست اور جبریہ عقیدہ رکھنے عیسائیوں اور مسلمانوں میں کچھ بہت زیادہ اختلاف نہیں۔ اِس وجہ سے مسلمانوں کو برطانوی عیسائیوں کے راج سے خونزدہ کرنے والی کوئی بات نہ تھی۔

انگریزوں نے مسلمانوں کے اندر کوئی ایسا معاشرتی رواج بھی نہ پایا جسے ختم کرنا وہ انسانی فرض خیال کرتے۔ مسلمان غلام ضرور رکھتے تھے، لیکن غلاموں کے ساتھ اُن کا سلوک بہت بُرا نہ تھا۔ قانونی طور پر غلامی کی ممانعت کی گئی تو جن معدودِ چند افراد پر اِس کا اثر پڑا اُنہوں نے بھی اس ممانعت کا زیادہ برا نہ منایا۔ انگریز مسلمانوں کو ہندوؤں سے مقابلتًا بہتر سمجھتے تھے، اور جہاں دونوں قوموں میں تنازعہ ہو جاتا تھا، وہاں مسلمانوں کی طرفداری کرتے تھے۔

ایمان والوں سے دوکان نہ چلتی تھی

باوجود اِس کے برطانوی راج میں مسلمانوں کی مادی حالت

اچھی نہ تھی۔ مسلمان طبعاً ایک سپاہی ہے۔ قدیم وضع کے مسلمان سوداگرانہ ذہنیت نہیں رکھتے۔ اُنہیں کھیتی باڑی بھی اچھی طرح کرنی نہیں آتی۔ اللہ پر اُن کا بھروسہ اُنہیں فضول خرچ اور ناعاقبت اندیش بنا دیتا ہے۔ رئیسوں کو ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ اُن کی شان کو بٹہ نہ لگ جائے۔ اِس دھن میں وہ لنگوٹی کے اندر پھاگ کھیلنے لگتے ہیں مسلمانوں نے بحیثیتِ مجموعی انگریزوں کا تمدن سیکھنے سے قطعاً انکار کر دیا۔ اِس وجہ سے وہ سرکاری ملازمت کے نااہل رہے۔ سرکاری ملازمت کے لئے انگریزی جاننا لازمی تھا۔ مسلمان ہندوؤں کی مقامی بولیاں بھی نہ جانتے تھے، اور نہ اُن کو سیکھنا چاہتے تھے۔ اِس لئے وہ چھوٹی سے چھوٹی ملازمتوں سے بھی محروم رہتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ پولیس اور فوج کی ادنیٰ ملازمتوں کے سوا اُن کے لئے اور کوئی روزگار نہ تھا۔ غرض دیوانی نظم و نسق میں اُن کا کوئی دخل نہ تھا نظم و نسق پر ملعون ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ انگریزی راج میں مسلمان بڑی تیزی سے روبہ انحطاط تھے۔

انگریزی راج مسلمانوں کو تباہ کر رہا تھا

ایسے نظر آتا تھا کہ چند ہی پشتوں میں مسلمان قوم قلیوں کی قوم

بن جائے گی۔ چونکہ اُنہوں نے مغربی تمدّن حاصل ہی نہ کیا تھا، اِس لئے اُن میں اِس کے خلاف کوئی ردِّ عمل بھی پیدا نہ ہوا۔

انگریزی راج مسلمانوں کو تباہ کر رہا تھا۔ چند مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ مسلمانوں نے انگریزی راج کے خلاف بغاوت کر دی جیسا کہ مشرق کا دستور ہے، یہ سب بغاوتیں مذہبی تحریکوں کی شکل میں ظاہر ہوتی رہیں۔ غدر کے دوران میں مسلمانوں نے بغاوت کے اندر جو حصّہ لیا اُس کو بھی مذکورہ بالا سرکشیوں ہی کی ایک مثال سمجھنا چاہیئے۔ اِس کے علاوہ وہابیّت کی ایک عجیب وغریب تحریک چل نکلی۔ اس تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال مغربی سرحدی کوہستانی علاقہ میں باغیوں کا ایک مرکز قائم ہو گیا۔ اِس مرکز کے لئے دور دراز سے رنگروٹ بھرتی کر کے لائے جاتے تھے۔ اِن رنگروٹوں میں بنگال جیسی دور افتادہ سرزمین کے رضاکار بھی شامل ہوتے تھے۔ اتنی دور سے اِن لوگوں کو منزل تک پہنچانے کے لئے ایک وسیع اور باقاعدہ تنظیم کام کرتی تھی۔ حکومتِ ہند کو اس سازش کا پتہ چل گیا، اور جہاں جہاں مقامی مراکز کا پتہ چلا اُنہیں تباہ کر دیا گیا۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عارضی طور پر مذہبی جنون پھوٹ پڑا اور قتل کی بعض وارداتیں بھی ہوئیں۔ بہرحال یہ تحریک کچھ زیادہ شاندار نہ تھی۔ گو اس تحریک کے

مراکز آج تک صوبۂ سرحد کے نواح میں پائے جاتے ہیں، لیکن اُن کی تعداد نہایت قلیل ہے، اور اُن کی طاقت درخورِ اعتنا نہیں۔

نیچری اور آغا خانی مسلمان انگریز کے وفادار تھے

جو مسلمان سلف کی روش سے منحرف ہو چکے ہیں اور معتزلی کہلاتے ہیں، اُنہیں برطانوی تمدّن سے کوئی عار نہیں۔ وہ بخوشی یہ تمدن اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر تاجر پیشہ ہیں۔ نئے راج نے عام طور پر جو امن و امان قائم کر دیا، خوشحالی بڑھ گئی، اور انگلستان کے ساتھ روابط کی وجہ سے نئی نئی منڈیاں کھل گئیں، تو اس سے انہیں بہت فائدہ پہنچا۔ اُن سے کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، مسلمان قوم کے بعض لیڈروں نے محسوس کیا کہ اُنہیں بھی زمانہ کا ساتھ دینا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ہم مذہبوں میں انگریزی تہذیب پھیلانے کی پوری کوشش کی۔ ایک محدود پیمانہ پر اُن کی تحریک کامیاب بھی ہوئی۔ نئے علوم کے طالبعلموں نے جب مغربی تہذیب کے شجرِ ممنوعہ کو چکھا تو اُن کا وہی حشر ہوا جو تمام ایسے اہلِ مشرق کا ہوتا ہے جو مغرب سے آشنائی پیدا کرتے ہیں: تعلیم یافتہ مسلمان عیسائیوں کو ناپسند کرنے لگے اور انہیں بنظرِ حقارت دیکھنے لگے، لیکن ہندوؤں سے تو اُن کو اور بھی زیادہ نفرت اور بغض

پیدا ہو گیا۔

ہندو مسلم اختلافات کی ابتدا ہوتی ہے

اس بات کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی حکومت عنقریب قائم ہو سکے گی۔ اگر کوئی مسلمان ضرور کسی اسلامی حکمران کے ماتحت ہی زندگی بسر کرنا چاہے تو وہ ہندوستان کی بہت سی مسلمان ریاستوں میں سے کسی میں رہائش اختیار کر سکتا تھا۔ جو مسلمان کافروں کی حکومت کے ماتحت رہنے پر مجبور تھے، وہ ایک عیسائی حکومت کو کسی مشرک ہندو کی حکومت پر ترجیح دیتے تھے۔ ہندوؤں کا قومی ردِ عمل جتنا انگریزوں کے خلاف تھا، اتنا ہی مسلمانوں کے خلاف بھی تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ابتدا میں ہندو ردِ عمل تمام و کمال مسلمانوں کے خلاف تھا۔ اِس وجہ سے مسلمانوں کو ہندو ردِ عمل کی قومی تحریک سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ نہ ہی وہ یہ پسند کرتے تھے کہ ہندو نظام حکومت کے اعلیٰ اور حاکمانہ مناصب پر پُرامن طریقہ سے پہنچ جائیں۔ اگر ہندوؤں کو ایسا اقتدار حاصل ہو گیا تو مسلمان، کنگال، غیر تعلیم یافتہ، تعداد میں قلیل، اور ہندو حکومت کے رحم و کرم کے محتاج، ہو کر رہ جائیں گے۔ ہندو سرکار کو برطانوی سلطنت کا سارا اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ یہ صورتِ حال مسلمانوں

کے لئے کوئی خوش آیند مستقبل پیش نہ کرتی تھی۔ اس لئے جہاں تک مسلمانوں سے بن پڑتی وہ برطانوی استبداد کی حمایت کرتے تھے۔ جو مسلمان، کانگرس، یا اعتدال پسند ہندوؤں کے پراپیگنڈے کی حمایت کرتے تھے۔ انہیں اُن کے ہم مذہبوں کے حلقے میں غدارِ اسلام سمجھا جاتا تھا۔

جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس کے تمام دوران میں مسلمانوں کی یہی کیفیت تھی جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ اس کے بعد بھی عرصہ تک یہی حال رہا۔ بعد ازاں یہ بیان کرنا ہے کہ وہ کیا واقعات تھے جنہوں نے مسلمانوں کی ساری قوم کو انگریزوں سے برگشتہ کر کے برطانیہ کے تلخ دشمن بنا دیا۔ جب نوبت دشمنی تک پہنچ گئی تو مسلمان ہندوؤں سے مل گئے، اور ہندو رجعت پسندوں کے ساتھ مل کر اُن کے نہایت خوفناک حلیف ثابت ہوئے۔

تقسیمِ بنگالہ کیوں ضروری تھی؟

صوبۂ بنگال کے جو اضلاع بعد میں مشرقی بنگال کہلائے، وہاں مسلمان باشندوں کی آبادی تو اکثریت میں تھی، لیکن یہ لوگ ایک مظلوم اکثریت تھے۔ آبادی کا بیشتر حصّہ وہ نومسلم تھے جن کے آباؤ اجداد مقامی تھے اِن کا پیشہ کاشتکاری تھا۔ اِن کے علاوہ بعض بڑے بڑے مسلمان

زمیندار بھی تھے، جو باہر سے آکر آباد ہونے والے رئیسوں کی اولاد تھے۔ امیر اور غریب یکساں، مغربی بنگال کے ساتھ رابطہ کے باعث مصیبت میں تھے۔ اِس کے بعد بنگال تقسیم ہوا۔ مشرقی بنگال کا ایک نیا صوبہ بنا، جس کا اپنا علحدہ دارالحکومت تھا۔ اِس صوبہ میں مسلمانوں کا اثر و رسوخ غالب رہتا۔ تقسیم سے پہلے بھی ایسے سرکاری قوانین موجود تھے جو مزارعوں کو ہندو زمینداروں، اور سود خواروں، کے چُنگل سے محفوظ رکھنے کے لئے بنائے گئے تھے۔ لیکن ماتحت سرکاری ملازمین چاہے وہ عدالتی محکموں سے تعلق رکھتے ہوں، یا انتظامی محکموں سے، زیادہ تر بنگالی ہندو تھے۔ عملہ بھی بنگالی ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ اور وکیل بھی سارے بنگالی ہندو تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ قانون کا نفاذ ایسے طریقہ سے کیا جاتا تھا۔ جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچتا تھا۔ کلکتہ کے ہائیکورٹ میں اپیل ضرور کی جاسکتی تھی، لیکن وہاں بھی اونچی ذات کے بنگالی ہندوؤں کا اثر غالب تھا۔

تقسیم کے بعد یہ اُمید پیدا ہوگئی تھی کہ یہ تمام شکایات دور ہو جائیں گی۔ ہندو سرکاری ملازمین یا تو ظلم سے باز رکھے جائیں گے یا اُن کو ہٹا کر اُن کی جگہ مسلمان ملازم رکھے جائیں گے۔

تقسیم سے پہلے محکمۂ تعلیم پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ یہ ہندو خیال رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو بنگالی زبان کی تعلیم پانے کا بھی موقعہ نہ ملے، تاکہ وہ اس طرح سرکاری نظم و نسق کی اونچے ملازمتیں حاصل کرنے کے بھی ناقابل رہیں۔ تقسیم کے بعد توقع تھی کہ یہ حالت بدل جائیگی۔ تعلیم کے خواہاں مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی، نہ کہ حوصلہ شکنی۔

کلکتہ بہت دور تھا، اور وہاں پہنچنے کے ذرائع آمد و رفت بھی محدود تھے۔ حاکموں کو مشرقی بنگال کے متعلق نہ تو زیادہ علم تھا اور نہ وہ اُس کی زیادہ پرواہ کرتے تھے۔ علاقہ زرخیز تھا، اور سالانہ مالیانہ کے ذریعہ معقول آمدنی ہوتی تھی۔ اِس کے عوض اُس خطہ کو سرکار سے کوئی فائدہ نہ پہنچتا تھا۔ مثال کے طور پہ ذرائع آمد و رفت مسدود تھے۔ علاقہ کی ونہ فی پیداوار کو بندرگاہوں تک پہنچانا مشکل تھا۔ کلکتہ کے حسد کی وجہ سے مشرقی ساحل پر کوئی دوسری بندرگاہ بھی نہ بنائی جاتی تھی۔ مقامی مسائل میں کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ جب کبھی مشرقی اور مغربی بنگال کے مفاد میں تصادم ہوتا تو ہمیشہ صوبہ کے اُن علاقوں کی جنبہ داری کی جاتی تھی جو دارالحکومت کے قریب تھے۔

مسلمان رئیسوں کو ایک خاص گلہ تھا: وہ روز بروز قرضہ میں غرق ہوتے جا رہے تھے۔ دوسرے صوبوں میں حکومت نے سرکاری

قرضے دے کر، اور قرضے کا کاروبار کرنے والوں پر پابندیاں عائد کر کے، نیز مقروض جائدادوں کے انتظام کے لئے ایک سرکاری محکمہ جاری کر کے، رئیسوں کے اِس طبقہ کی حفاظت کا بندوبست کر دیا تھا۔ لیکن مشرقی بنگال میں اس قسم کا کوئی قدم نہ اُٹھایا گیا تھا۔ صاف نظر آرہا تھا، کہ ایک یا دو پشتوں میں پرانے خاندانوں کا نیلام ہو جائے گا، اور اُن کی جگہ سود خوار ہندو قبضہ کر لیں گے۔

جرائم بکثرت سرزد ہوتے تھے، اور اُن کے انسداد کا کوئی انتظام نہ تھا۔ مثال کے طور پر سارا سال تک اِس علاقہ کے بڑے بڑے دریاؤں پر منظم ڈاکے پڑتے تھے۔ دریاؤں کے ذریعہ آمد و رفت اِس علاقہ کا باہر کی دنیا سے واحد رابطہ تھا۔ حکومت کو ایک عرصہ تک تو اِس ڈاکہ زنی کا علم ہی نہ تھا، اور جب علم ہوا تو اِس کے تدارک کی کوئی تدبیر نہ کی گئی۔ جب حکومت ڈھاکہ میں قائم ہو جائیگی، تو یہ سب شکایات دور ہو جائیں گی۔ غرض مشرقی بنگال کے مسلمان تقسیم کے پرزور حامی تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی قوم یہ دیکھ کر پھولی نہ سماتی تھی کہ ایک نیا صوبہ بنایا جا رہا ہے، جہاں اُن کے ہم مذہبوں کا اقتدار غالب ہوگا۔ غرض مسلمانوں نے بنگالیوں کی جوشیلی شورش کے خلاف حکومت کی پوری مدد کی، اور سرکار کی طرفداری میں کوئی

دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔

حکومتِ برطانیہ نے کانگریس کا پہلو اختیار کر کے ہندو رجعت پسندوں کو راضی کرنے کی خاطر تقسیم بنگالہ منسوخ کر دی۔ مشرقی بنگال کے مسلمان پھر ہندوؤں کی پرانی غلامی میں دھکیل دیئے گئے۔ اُن سے پھر تغافل برتا گیا۔ اب پھر کوئی اُن کا پرسانِ حال نہ تھا۔ اِس طرح مسلمانوں کی حالت پہلے سے بدتر تھی، کیونکہ اُنھوں نے برسرِ اقتدار ہندوؤں کے خلاف سرکار کی مدد کی تھی، اور اب وہی ہندو اُن کے سر پر دوبارہ مسلط کئے جا چکے تھے۔ جو اشخاص سرکار کی حمایت میں پیش پیش تھے، اب انہیں چُن چُن کر سرکاری ناراضگی کا نشانہ بنایا گیا، اور بعض کو تو جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔

برطانیہ کی پرانی عادت ہے کہ دشمنوں کے ہاتھ دوستوں کو فروخت کر دیتا ہے

انگلستان کی یہ پرانی پالیسی ہے کہ دشمنوں کو راضی کرنے کی خاطر دوستوں کو قربان کر دینا چاہئے۔ اِس میں حکمت یہ ہے کہ دوست تو تمہارا دوست ہے، اور بہر حال تمہاری مدد کرے گا ہی۔ تمہارا دشمن یہ دیکھ کر کچھ راضی ہو جائے گا کہ اُسے تمہارے دوستوں سے انتقام لینے سے باز نہیں رکھا گیا۔ اِس طرح تمہارے خلاف اُس کی دشمنی کم ہو جائے گی۔ عین ممکن ہے، وہ بھی تمہارا دوست

بن جائے۔ یہ پالیسی عام طور پر کامیاب رہتی ہے، بالخصوص جب دوست لاچار ہو اور دشمن آمادۂ مصالحت۔ ایسی مثالوں کی ایک طویل فہرست پیش کی جا سکتی ہے، جن سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ: "انگلستان کا دوست ہونے کی نسبت انگلستان کا دشمن بننے میں زیادہ خیریت رہتی ہے"۔ یہاں صرف ملکہ این کے زمانہ میں ہسپانیہ کے قطلانیوں، انقلابِ فرانس کے دوران میں شہنشاہ کے حامیوں انگلستان سے وفاداری رکھنے والے آئرلینڈ کے باشندوں، اور جنوبی افریقہ کے بوئروں کا تذکرہ کافی ہے۔ فریڈرک اعظم کو اس فہرست میں اس لئے جگہ دی نہیں جا سکتی کہ اُس پر انگریزوں کی اِس چال کا اُلٹا اثر ہوا تھا۔

فریڈرک اتنی طاقت رکھتا تھا کہ کسی مسئلہ کے متعلق جو رائے قائم کرے اُس کو منوا سکے۔ چنانچہ جب اُسے انگریزوں کی غدارانہ فطرت کا علم ہو گیا، تو اُس نے اپنا پورا انتقام لے کر چھوڑا۔

انگریزوں کی حکمتِ عملی کا شکار ہونے والے دوسرے عناصر تباہ ہو گئے۔ اگرچہ وہ "مکر اور فریب" کا رونا روتے رہے، لیکن جلد ہی اُن کی فریادیں پھانسی یا بندوق کی گولی کے زور سے خاموش کر دی گئیں۔ اگر وہ بچ بھی نکلے تو اُن کی حالت اتنی خراب ہو چکی

تھی کہ اب اُنہیں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ انگریزوں پر غداری کا الزام لگانا صحیح نہ ہوگا۔ انگریز پرائیویٹ طور پر، اور پبلک میں، دونوں جگہ، اپنے وعدہ کا پکا ہوتا ہے۔ انگریزوں نے جب کبھی کوئی معاہدہ توڑنا ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں: "قدیم معاہدات کی ترمیم اس لئے ضروری ہو چکی ہے کہ اب نئے حالات پیدا ہو گئے ہیں، جن کا پہلے کسی کو سان گمان بھی نہ تھا۔ رائے عامہ پرانی پالیسی کو ایسا گناہ آلود اور بیہودہ سمجھتی ہے کہ اب سابقہ حکمتِ عملی میں تبدیلی کرنا لازمی ہے۔" جن لوگوں کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچتا ہے، اُن کی حالت ویسی ہوتی ہے جیسی اُس کھلاڑی کی جس کو بتایا جائے کہ کھیل کے دوران میں کھیل کے قواعد بدل دیئے گئے ہیں۔

تقسیم بنگالہ کی تنسیخ سے برطانیہ نے مسلمانوں کا اعتماد کھو دیا۔

جس مثال کا ہم ذکر کر رہے ہیں، وہاں تو سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں برطانیہ کی اِس بزدلی کے غیظ و غضب پیدا ہو گیا۔ انگریزوں کی چال اس لحاظ سے بھی ناکام رہی کہ نہ تو مسلمان اتنے کمزور ثابت ہوئے جتنا انہیں کمزور سمجھا گیا تھا، اور نہ ہندو راضی ہوئے۔ بھیڑیوں کے اُس غول کی طرح جس نے برفانی جنگل میں نانی جان اور اُن کی نواسی اور نواسے سے لدی ہوئی گاڑی کا

تعاقب شروع کر دیا تھا اور جن کے سامنے جب ننھی بی کو بطور قربانی پھینکا گیا تھا، تو اُس کا خون چاٹ کر، انہیں ننھے میاں کا گلا دبوچنے کی خواہش اور بھی زیادہ ہو گئی تھی، ہندو بھی تقسیم بنگالہ کی تنسیخ پر راضی نہ ہوئے۔

مسلمانوں کے آنسو اِس تبدیلی سے نہ پونچھے گئے کہ اب ملک کا دارالحکومت دلّی تبدیل کر دیا گیا تھا، بلکہ اُنہیں اِس تبدیلی سے اور زیادہ رنج پہنچا۔ اِس کی مثال ایسی ہی تھی جیسے کہ نواب لدّھے خاں صاحب کی مالی حالت خراب ہو گئی۔ اُن کی جائداد پر اُن کے دشمنوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ وہ قلی کا کام کرنے پر آمادہ نہ تھے بھیک مانگنے سے اُنہیں شرم آتی تھی۔ کوئی شخص اُنہیں ملازمت دینے پر تیار نہ تھا۔ آخر اُمیّد کی ایک کرن دکھائی دی۔ حضور صاحب بہادر نے نواب لدّھے خاں سے وعدہ کر لیا کہ آپ کو تین پُشت کے لئے ایک چھوٹا سا کھیت معمولی کرائے پر زراعت کے لئے دے دیا جائے گا۔ نواب صاحب نے کھیت کا قبضہ حاصل کر لیا، اور ہل چلانے کی فکر میں تھے کہ اُنہیں صاحب بہادر کی چٹھی آئی جس میں لکھا تھا کہ صاحب بہادر کو اس بات میں کچھ شک پیدا ہو گیا ہے کہ آیا اِس کھیت کے متعلق صاحب بہادر کے

حقوقِ مالکانہ جائز ہیں، یا ناجائز۔ اس وجہ سے صاحب بہادر نواب صاحب کو کھیت سپرد کرنا نواب منافیٔ اخلاق سمجھتے ہیں لیکن نواب صاحب سے جو کرایہ وصول ہو چکا ہے، وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔ کھیت کے جائز مالک کا پتہ چلنے پر، کھیت اُس کو واپس دے دیا جائے گا۔ البتہ نواب لدّھے خاں سے یہ رعایت کی جاسکتی ہے کہ اُن کی خاندانی حویلی پر صاحب بہادر قبضہ کر کے وہاں اپنا دفتر کھول دیں گے۔ نواب لدّھے خاں اپنی رہائش حویلی کے چوکیدار کے چھپّر میں منتقل کر سکتے ہیں۔ دفتر میں جو لوگ صاحب بہادر سے ملنے آئیں، نواب لدّھے خاں کا فرض ہوگا کہ اُن کا شایانِ شان استقبال کریں۔ اُمید ہے کہ یہ آنے والے مہمان نواب لدّھے خاں کو معقول بخشیش عطا کر دیا کریں گے۔

مسلمان کہتے تھے: "ہم وفادار تھے اِس لئے ہمیں قربانی کا بکرا بنایا گیا۔ ہندو وفادار نہ تھے، اس لئے اُنہیں وہ سب کچھ مل گیا ہے جو وہ مانگتے تھے۔ آئندہ ہم بھی وفادار نہیں رہیں گے۔ کم از کم حکومت کی مخالفت تو ضرور کریں گے۔ اگر ہم اسی طرح حکومت کی مدد کرتے رہے اور آخرِ کار حکومت نے ہندوؤں کے سامنے

ہتھیار ڈال دیئے تو پھر ہمارا کیا حال ہوگا۔ کیا ہمیں فاتح ہندوؤں کے انتقام کا خوف نہ ہوگا۔ بر عکس اِس کے اگر ہم بھی رجعت پسند ہندوؤں کے ساتھ مل جائیں تو شاید ہم دونوں مل کر سرکار کی جڑ اکھیڑ سکیں۔ اِس کے بعد امکان ہے کہ ہم جو کہ جنگجو ہیں، انتظامی قابلیت بھی رکھتے ہیں، اور جن میں ایک قسم کا اتحاد بھی پایا جاتا ہے جو ہندوؤں میں مفقود ہے، شاید ہم آخرِ کار ہندوؤں کو بھی مطیع کرنے میں کامیاب ہو جائیں،،

یہ تھی اسلام کی نئی حکمت عملی۔ بین الاقوامی دنیا میں جو واقعات پیش آئے اُن سے مسلمانوں کا یہ عزم اور راسخ ہو گیا۔

مغرب سے مشرق کی ٹکر اور صلیب و ہلال کی آویزش نے ایک نئی کروٹ لی

ہندوستانی مسلمان عرصۂ دراز سے عالمِ اسلام کے ساتھ تعلقات منقطع کئے بیٹھے تھے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ہندوستانی مسلمانوں میں کچھ ایسی خصوصیتیں پائی جاتی تھیں جن کے باعث اُن کو مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ قریب کے مسلمان مُشرک سمجھتے تھے لیکن نئی ایجادات کے باعث اب دنیا کے فاصلے پہلے کی نسبت کم ہو چکے تھے۔ تمام عالمِ اسلام میں ایک نیا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ دنیا کے کسی حصّے میں مسلمانوں کو جو صدمہ پہنچے، باقی کی

دنیا کے مسلمان اُس کا اثر محسوس کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اب
ساری دنیا کے مسلمانوں کے وطن حملہ آور فرنگیوں سے خطرہ میں
تھے۔ اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے دنیا بھر کے مسلمان ایک
دوسرے سے قریب ہونے لگے۔ اُن کے اندر ملّتِ واحدہ
ہونے کا ایک نیا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے
مسلمانوں کو بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ اُن کی حفاظت صرف وعدہ
خلاف انگریزوں کی مدد سے ہی ممکن نہیں۔ اُنہیں کافروں سے
بچانے کے لئے اُن کے ہم مذہب بھی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اسلام
کی اُمّت ایک زبردست اُمّت تھی۔ وہ مراقش سے لے کر
چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ آج وہ زوال پذیر تھی۔ اُن کے گھر میں پھوٹ
پڑ چکی تھی۔ اُن کے حکمران نالائق تھے۔ لیکن پھر بھی یہ ناممکن تو نہ
تھا کہ اسلام ایک دفعہ اور زندہ ہو جائے۔ اسلام کی دوبارہ زندگی
کے لئے صرف اللہ کے حکم کی کسر تھی۔ سالہا سال سے کسی نامعلوم وجہ
کی بنا پر اللہ فرنگیوں کی طرف داری کرتا آیا ہے، لیکن اب ایسا نظر
آتا ہے کہ اللہ کی مہربانی کا رُخ پھر بدل جائے گا۔ یونانی ترکوں سے
شکست کھا چکے ہیں، اور اُن کے عیسائی بھائی بند کچھ نہیں کر سکتے۔
اٹلی، شہنشاہ حبشہ منالیقِ ثانی کی فوجوں کے ہاتھوں پٹ چکی ہے۔

جاپانیوں نے روسیوں کی کمر توڑ دی ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ ہیٹ پوشوں کی برتری کا دور ختم ہو چکا ہے۔

تحریکِ خلافت کی ابتداء

سلطان عبدالحمید نے اسلام کی نئی روح کے امکانات کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ بحیثیت سلطانِ روم وہ اپنی طاقت اور رسوخ کو استعمال کر کے، بحیثیت خلیفۂ اسلام اپنے اقتدار کو ازسرِ نو زندہ کرنے کے لئے ایک جدید تحریک کی سرپرستی کر رہا تھا۔

یہ امر خاصہ مشکوک ہے کہ آیا سلاطینِ عثمانیۂ اسلام کے جائز خلیفہ تھے۔ بہر حال اُن کی خلافت مغل شہنشاہوں نے کبھی تسلیم نہ کی تھی۔ ہاں تیمور کا خاندان اُجڑ جانے کے بعد عام ہندوستانی مسلمان ہمیشہ سے خلافتِ عثمانیہ کے سامنے سرِ تعظیم خم کرتے آتے تھے۔ لیکن خلافت سے مسلمانانِ ہند کی وابستگی اُسی قسم کی تھی جیسی ہنری شاہِ انگلستان اور فرانسس شاہِ آسٹریا سولھویں صدی عیسوی میں روما کے قیصر کو دنیائے عیسائیت کا خاقان مانا کرتے تھے۔

بہر حال سلطان عبدالحمید کی چلائی ہوئی تحریک نے خاصہ فروغ حاصل کیا۔ اسلام کے قدیم فرقوں کے عقائد کی رو سے دینی اور دنیاوی امامت و امارت میں کوئی فرق نہیں۔ خلیفہ اللہ کا نائب

نہیں جو کہ ہر جگہ اور ہر وقت خود موجود رہتا ہے۔ خلیفۂ اسلام نبیؐ کا قائم مقام ہے۔ محمدؐ علیہ السلام صرف پیغمبر نہ تھے بلکہ حکمران بھی تھے۔ جب تک ترکی کے اندر انگورہ پارٹی کا حالیہ انقلاب رونپذیر نہ ہوا تھا، اُس وقت تک خلیفۂ قسطنطنیہ کو صرف روحانی پیشوا سمجھنا درست نہ تھا۔ مزید بریں اگر امارتِ اسلامی کی شرائطِ منصبی پرہیزگاری علم، اور بیعتِ عامۃ المسلمین قرار دی جائیں، تو بنو عثمان کے گھرانے کا کوئی فرد بمشکل ہی خلیفہ کہلانے کا مستحق ہو سکتا تھا۔ یہ درست ہے کہ عباسیوں کے دور میں مدتوں خلیفہ دنیاوی اقتدار سے محروم رکھا گیا۔ لیکن ایک ایسے قانونی مفروضے کی بنا پر جس کا اہلِ مشرق میں خاصہ رواج ہے، جو ترک یا مملوک درحقیقت تاجداری کے اختیارات استعمال کرتے تھے، اُنہیں محض خلیفہ کا نائب سمجھا جاتا تھا۔ اصولاً خلیفہ جب چاہے اُن کو معزول کر سکتا تھا، اور اُن کے اختیارات یا تو خود سنبھال سکتا تھا، یا کسی دوسرے کو سونپ سکتا تھا۔ قدیم عقائد کے مسلمانوں کے نزدیک، قانوناً دینی امام اور دنیاوی امیر کے مابین مستقل تفریق ناممکن تھی۔

مسلمان کا دین اور دنیا جدا نہیں

اسلام کا حکم ہے کہ دنیاوی اقتدار راسخ العقیدہ مومنوں

کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے۔ ہندوستان میں کوئی راسخ العمل مومن حکمران نہ تھا۔ نہ ہی کوئی ایسا حکمران تھا جسے کسی راسخ العمل مومن حکمران نے اپنے اختیارات سونپے ہوں۔ لہذا اصولاً پوزیشن یہ تھی کہ ہندوستان کے موجودہ حکمران مسلمانوں کے نزدیک غاصب تھے۔ ابھی تک اِس الجھن سے کوئی عملی دقّت پیدا نہ ہوئی تھی، کیونکہ مغلوں کے تخت کا کوئی دعوے دار ہی نہ تھا جن حکمرانوں کے ہاتھ میں فی الواقع حکومت کی باگ ڈور تھی، وہ شریعتِ اسلامیہ کی راہ میں کوئی روڑے نہ اٹکا رہے تھے۔ لیکن اگر تحریکِ خلافت کو فروغ حاصل ہو جاتا، اور مسلمانانِ ہند میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ جن علاقوں میں مسلمان آباد ہیں وہاں سلطانِ ترکی کو اسلامی راج قائم کرنے کی کوششوں کی قیادت کرنی چاہیئے، تو پھر ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مؤقف میں بھی ایک تغیرِ عظیم رونما ہو جاتا۔ اس حالت میں اُن کا مذہبی فرض ہو جاتا تھا کہ جہاد کے مقدس جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔

غرض سلطانِ ترکی کے یلدیز کوشک نامی قصرِ شاہی سے جو پراپیگنڈا کیا جا رہا تھا وہ بے اثر نہ رہا۔ کم از کم اس سے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ خیال ضرور پیدا ہو گیا کہ برطانوی سلطنت کے باہر

بھی اُن کے دوست موجود ہیں۔ اُنہیں صرف بحیثیت ہندوستانی ہی اقتدار حاصل نہیں، بلکہ وہ بحیثیت مسلمان کے بھی کچھ طاقت رکھتے ہیں۔

سلطنتِ ترکیہ کا انحطاط

ملکہ وکٹوریہ کے راج میں معاملہ اِس سے آگے نہ بڑھا۔ ٹوری پارٹی بر سرِ اقتدار تھی۔ ٹوری پارٹی اگرچہ رعایا کے حقوق کی ترجمانی کا دعویٰ کر کے سلطانِ روم کے معاملات میں بار بار دخل دیتی تھی، لیکن پھر بھی وہ ترکوں کی حامی تھی۔ اُن کی دشمن نہ تھی۔ توقع یہ کی جاتی تھی کہ ترکی اپنی اصلاح کرے گا، اور ایک ایسی مہذّب اور ترقی یافتہ سلطنت بن جائے گا جسے روسی اقتدار کی توسیع کو روکنے کے لئے استعمال کیا جا سکے گا۔ یہ اُمید بظاہر تھی بے بنیاد۔ سلطنتِ عثمانیہ نالائقی اور رشوت خوری کا شکار ہو چکی تھی۔ جب کبھی اس سلطنت کی اصلاح کے نام پر کوئی قدم اُٹھایا جاتا، تو بالعموم نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ حکومت کے مخالف عناصر کے قتلِ عام کی وارداتیں رونما ہونے لگتی تھیں۔ اس کے بعد سالونیکا میں انقلاب رونما ہو گیا، اور بالآخر سلطان عبدالحمید کو تخت سے اتار دیا گیا۔ ہندوستان کے راسخ العقیدہ مسلمان شروع شروع میں انجمن اتحاد و

ترقّی کو ملحد، باغی، اور غاصب سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ سلطان عبدالحمید کا جانشین جائز خلیفہ نہیں۔ اس لئے اُس کا نام خطبہ سے خارج کر دیا گیا۔ باوجود اِس کے ترکی کا حکمران چاہے کوئی ہو، مسلمان ترکی سے نظریں نہ ہٹا سکتے تھے۔ ایک عام توقّع تھی کہ نئی حکومت بے قاعدہ ہی سہی، لیکن ترکی کو دوبارہ زندگی دینے میں کامیاب ہو جائے گی۔ یہ اُمید کچھ تو خود انجمنِ اتحادّ و ترقی کی بے تدبیری کے باعث کامیاب نہ ہوئی، اور کچھ اِس ناکامی میں یوروپ کی متفقّہ مخالفت کو بھی دخل تھا۔ یورپ اُس وقت دو پارٹیوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک پارٹی کا لیڈر روس تھا، اور دوسری کا جرمنی۔ انگلستان واضح طور پر روسی پارٹی کی امداد کر رہا تھا۔ روس کی پالیسی کئی قرنوں سے یہ تھی کہ مسلمان ممالک کو آزاد رکھا جائے، لیکن اُنہیں طاقتور نہ بننے دیا جائے۔ روس یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ اسلامی ممالک میں کوئی ایسی اصلاح عمل پذیر ہو جس سے روسی حکمتِ عملی منڈھے نہ چڑھ سکے۔ زمانہ نے اب انگلستان کو بھی روس کی اس پالیسی کا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا۔ ایران کی افسوسناک داستان سے اہلِ ہندوستان بھی ناواقف نہ تھے۔ روس انجمنِ اتحادّ و ترقی کا مخالف تھا، کیونکہ یہ انجمن اصلاح کی خواہاں معلوم ہوتی تھی۔ اس طرح انگلستان کی پالیسی

بھی ترکی کی اصلاح کے خلاف ہو گئی۔ عہد نامہ برلن کو پاؤں تلے کچل دیا گیا، لیکن اس عہد نامہ پر دستخط کرنے والی حکومتوں نے رسمی احتجاج سے بڑھ کر کوئی قدم نہ اٹھایا۔ ترکی میں حکومت کی مخالف ہر تحریک، چاہے اُس کے سرغنے عیسائی ہوں یا روایتی رشوت خور ٹولیاں، روس اور انگلستان کے سفارت خانے اُس کی حمایت کرنے پر آمادہ تھے۔

ساری دنیا کے مسلمان ایک جدا قوم ہیں

اِس دوران میں نوجوانانِ ترکی کی پارٹی اگرچہ اتحادِ تورانیت کی بھی حامی تھی، لیکن ساتھ ساتھ خلافت کا پراپیگنڈا بھی زور و شور سے کر رہی تھی۔ وہ کہتے تھے "اسلام ایک جمہوری مذہب ہے سارے مسلمان ایک ملت کے رکن ہیں۔ اس لئے مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ اس قوم کا دنیاوی امیر سوائے سلطان ترکی کے اور کون ہو سکتا ہے۔ سلطان ترکی اب کوئی استبدادی حکمران نہیں۔ اب وہ ایک آزاد قوم کا سردار ہے، اور قوم کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ حکومت کرتا ہے۔"

ہندوستانی مسلمان پہلے تو اِس پراپیگنڈے کو قبول کرنے سے کچھ ہچکچائے، لیکن پھر انہوں نے یہ پرکشش اصول قبول کرنے شروع

کر دیئے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اسلام کی نوزائیدہ ملّت کو اگر تھوڑی مہلت مل جائے تو وہ ایک جدید ترکی کے گرد متحد ہو جائے۔ ترک مدّتوں سے اسلام کی تلوار اور ڈھال کا کام دے رہے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ کوئی نیا الپ ارسلان، کوئی نیا نور الدین زنگی، یا کوئی سلطان مراد پیدا ہو جائے جو سارے عالم اسلام کے مشترکہ حکمران کے فرائض سر انجام دے سکے۔ ایسا ہو جائے تو پھر ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے غلبہ کا کوئی ڈر نہ رہیگا، نہ ہی وہ وعدہ خلاف عیسائیوں کی پیماں شکنی پر تکیہ کرنے کو مجبور رہینگے۔

عیسائی آج بھی اسلام مٹانے پر تلے ہوئے ہیں

جب یہ اُمیدیں ناکام ثابت ہوئیں تو مسلمانوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ ملّتِ اسلامیہ کو وہ مہلت نہیں دی گئی جس کی اُنہیں توقع تھی۔ ایسا نظر آتا تھا کہ عیسائیوں نے تہیّہ کر لیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ اپنے کسی معاہدہ کے پابند نہ رہیں گے۔ اطالویوں نے یوروپ کا بین الاقوامی قانون توڑتے ہوئے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ برطانیہ، فرانس اور روس کی کھلی ایماء سے بلقانی ریاستوں نے یوروپ کے اندر ترکی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اِن دونوں واقعات کے ساتھ ساتھ ترکوں کی شجاعت اور فاتحین کی بربریت کی ایسی داستانیں مشہور ہو گئیں جن سے ہر مسلمان کا خون کھولنے لگتا تھا۔ جس روز سے طرابلس پر حملہ ہوا، اُس

روز سے ہندوستانی مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ عیسائی آج بھی اسلام کے دشمن ہیں۔ اگر آج تک وہ چپ بیٹھے رہے تو اُس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ دنیا سے اسلام کا نام و نشان تک مٹانے کی گھات میں تھے۔ اب صرف ایک اُمید باقی رہ گئی ہے۔ عیسائیوں میں پھوٹ ہے۔ آؤ ہم متحد ہو جائیں۔ نسل اور فرقہ بازی کے تفرقات چھوڑ دیں فرنگی کی ملعون تہذیب پر تین حرف بھیجیں۔ توحید پر عقیدہ رکھنے والی اُمّت کو متحد بھی تو ہونا چاہئے۔ اگر ہم ایک ہو گئے اور نیک بن گئے تو اللہ ہمیں ضرور ٹیک دے گا، اور آسمانی کیک عطا کرے گا۔ نصر من اللہ و فتح قریب۔

اِس کے بعد پہلی عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔ عیسائی اقوام نے اپنے ہاتھوں سے عیسائی راج کی جڑیں کھوکھلی کرنی شروع کیں۔

یہ تھے وہ حالات جن کے ماتحت مشرق میں ہندو دھرم اور دینِ اسلام، دونوں کے جھنڈوں نے مل کر مغرب کے خلاف دنیاوی جنگ چھیڑ دی۔

باب ہفتم

زوال

پنڈت جی کی سلگائی ہوئی آگ بھڑک اُٹھی

ایسے نظر آتا تھا کہ اب پنڈت جی کی پالیسی بار آور ہونے والی ہے۔ حکومتِ ہند کے لئے اب یہ مشکل ہو چکا تھا کہ چپکی بیٹھی رہے۔ اس شورش کے خلاف کوئی قدم اٹھانا اب ضروری معلوم ہوتا تھا، جس کی مادی قوت اگرچہ قابلِ اعتنا نہ تھی، لیکن جس کی اخلاقی طاقت ازحد خطرناک تھی۔

ہندوستان میں برطانوی راج اعتمادِ نفس سے محروم تھا

اصولاً حکومتِ ہندوستان کے لئے کئی راستے کھلے تھے۔ وہ کہہ سکتی تھی کہ ہمارا مقصد اعلیٰ اور مقدس ہے۔ ہم ہندوستان

پر بحیثیت ایک عیسائی اور مہذب سلطنت کے حکومت کرنے آئے ہیں۔ ہم مسیح کے نمائندے ہیں۔ ہم قیصر کے نائب ہیں۔ ہم اس سرزمین کو شیو دیوتا اور خلیفۂ اسلام سے نجات دینے آئے ہیں ہمارے پاؤں لغزش نہ کھائیں گے۔ ہم اصول کا مقابلہ اصول سے کریں گے۔ ہم طاقت کا مقابلہ طاقت سے کریں گے۔ چوری چھپے قتل کرنے والوں کے سامنے ہم استقلال سے ڈٹے رہیں گے۔ ہم حکومت اپنے ہاتھ میں رکھیں گے، اور انتظامی قوت کے مالک بھی ہم خود رہیں گے۔ بغیر اوزار کے کون کاریگر کام کر سکتا ہے۔ اگر تم نے شورش بپا کی تو تمہیں سزا دی جائے گی۔ اگر تم نے بغاوت کی تلقین کی تو تمہیں قید کر دیا جائے گا۔ اگر تم قتل کے مرتکب ہوئے تو تمہیں تختۂ دار پر کھینچا جائے گا۔ اگر تم نے بغاوت کر دی تو گولیوں کی بوچھاڑ سے تمہیں فنا کر دیا جائے گا۔ یاد رکھو، ہماری ان تمام سرگرمیوں میں ہمیں تمہارے اپنے ہم وطنوں کی امداد حاصل ہوگی، کیونکہ ہمارا راستہ امن اور ترقی کا راستہ ہے، اور تمہاری راہ تباہی اور بدنظمی کی راہ ہے۔

حکومت ہند ایسا اعلان کر سکتی تھی۔ اگر اُسے اپنے اس اقدام میں برطانوی حکومت کی امداد حاصل رہتی جو کہ اُس کی حاکم اعلیٰ

تھی تو اِس اعلان کو عملی جامہ بھی پہنایا جا سکتا تھا۔ ایسا ہو جاتا تو حکومتِ ہند رائے عامہ کو قابو میں لانے کے تمام ذرائع اپنے قبضہ میں کر سکتی تھی۔ کالجوں اور عدالتوں کو سختی سے حکومت کے قابو میں لایا جا سکتا تھا۔ جن قوانین کی ضرورت محسوس ہوتی اُنہیں نافذ کیا جا سکتا تھا۔ جرم کی حمایت یا ارتکاب کرنے والوں کو سرکاری ملازمت اور سرکاری انعامات سے محروم کیا جا سکتا تھا۔ جو لوگ حکومت کے وفادار رہتے ان کے لئے سرکاری ملازمتیں اور سرکاری انعامات وقف کئے جا سکتے تھے۔

حکومت کو ہر دلعزیز کیسے بنایا جا سکتا ہے

حکومتِ ہند پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اتر کر عام رعایا سے روابط قائم کر سکتی تھی۔ حکومتِ ہند اپنی رعایا کو صرف اناج کھانے والی اکائیاں یا محصول دہندگان، یا ریاضی کی مفروضہ علامات کے بجائے، انسان بھی سمجھ سکتی تھی۔ وہ چاہتی تو مشرقی تمدّن سے اپنی گستاخانہ نفرت، ترک کر سکتی تھی۔ حکومت رائے عامہ کو ہموار کر سکتی تھی۔ یہ رائے عامہ ذہنی دوغلوں کی رائے عامہ نہ ہوتی، بلکہ بے زبان عوام کی حقیقی رائے عامہ ہوتی۔ حکومت کے کارکنوں کو یہ تعلیم دی جا سکتی تھی کہ بے حسی اور خلوت گزینی

کسی حکمران کے لئے کوئی خوبی نہیں چاہے اس کے ساتھ ہی وہ حکمران بڑی سختی سے اور پوری پاکیزگی کے ساتھ غیر جانبدار بھی ہو۔ حکومت کے اضلاعی افسروں کے لئے جو اوصاف ضروری قرار دیئے جاتے اُن میں قابلیت اور کارگزاری سے زیادہ، خوش اخلاقی، ہمدردی اور پابندیٔ آداب پر زور دیا جاتا۔ یہاں ہمدردی سے مراد زبانی ہمدردی نہیں۔ ضلع کے حاکموں کو ہر روز کے دفتری کاروبار کے طومار سے نجات دے کر فراغت مہیّا کرنی چاہیئے تھی۔ ضلع کے افسر کا سب سے بڑا فرض یہ ہونا چاہئے تھا کہ لوگوں کے ساتھ تعلقات قائم کرتا۔ مرکزی دفتر کی جانب سے بہت زیادہ احکام ضلع کے افسر پر نہ تھوپے جاتے۔ اُس کے اختیارات میں اضافہ ہونا چاہیئے تھا۔ اُس کو ترغیب دینی چاہیئے تھی کہ اِن اختیارات کو استعمال بھی کرے۔ انگریزی کو اُس کے اعلیٰ مرتبہ سے ہٹا کر، ہندوستانی کو سرکاری زبان بنانا چاہیئے تھا۔ انگریز افسروں کے لئے لازمی قرار دیا جاتا کہ وہ کم از کم ایک رائج العام مقامی بولی سے ضرور آشنا ہوں۔ اِس کے بعد مشرق کی علمی زبانوں کا مطالعہ خود بخود شروع ہو جاتا۔

غرض حکومتِ ہند کو صاف صاف اپنے اس ارادے کا اعلان

کر دینا چاہئے تھا کہ وہ ہندوستان کی حکومت چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ جب یہ اُمید نہ رہتی کہ حکومتِ برطانیہ یا حکومتِ ہند کو ورغلا کر ہندوستان چھوڑنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے تو پھر حکومت کی مخالفت بھی تھوڑے ہی عرصہ میں ختم ہو جاتی۔

اہل مشرق مستقل مزاج نہیں ہوتے

اہلِ مشرق مستقل مزاج نہیں ہوتے۔ جب تک کسی فیصلہ کو تبدیل کرنے کی اُمید باقی ہو، وہ چین سے نہیں بیٹھتے، اور ایک عدالت سے دوسری عدالت تک اپیل پر اپیل کئے جاتے ہیں۔ اگر کامیابی کی ذرا سا بھی توقع ہو تو وہ کسی حیلہ کے استعمال سے نہیں ہچکچاتے، چاہے وہ کیسا ہی ناجائز کیوں نہ ہو۔ لیکن اِس کے ساتھ ساتھ وہ تقدیر پرست بھی ہیں۔ جب کوئی آخری ڈگری ہو جائے، جس سے بچنے کی کوئی اُمید نہ ہو، تو پھر وہ حیرت انگیز صبر سے اُسے برداشت کر لیتے ہیں۔ جو شورش واضح طور پر بے سود دکھائی دے، اور جس کی راہ میں بیشمار خطرات درپیش ہوں، اُس میں سوائے چند متعصب مجنونوں کے کوئی مشرق کا باشندہ حصّہ نہ لے گا۔ اگر کوئی حکومت مضبوط ہو، اُس کے کارندے اچھے کارکن ہوں، اور حکومت کو اپنے اوپر اعتماد بھی ہو، تو ایسی حکومت متعصب مجنونوں کو حقارت

سے نظر انداز کر سکتی ہے۔

حکومتِ ہند کے لئے ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا ممکن نہ تھا۔ اِس حکومت کو اپنے اوپر وہ اعتماد نہ تھا، جو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ حکومت پہاڑوں کی خنک چوٹیوں سے اُتر کر گرد و غبار سے اٹے ہوئے گرم میدانوں میں کاشتکاروں کے پہلو بہ پہلو کام کرنے کو تیار نہ تھی۔ نہ ہی یہ حکومت تنگ اور پُر ہجوم بازاروں میں تاجروں اور دستکاروں کے ساتھ ربط و ضبط بڑھانے کی استعداد رکھتی تھی۔ اُس کی کوشش تو ابھی تک یہی تھی کہ اُس کے مقامی افسر بس مشین کے پرزے ہوں۔ اِس حکومت کی خواہش تھی کہ اُس کے کارندے لائق ہوں، پابندِ وقت ہوں، ضبط قائم رکھیں، اور بسرعت کام کر سکیں۔ حکومت یہ نہ چاہتی تھی کہ اُس کے افسر کسی کامل شخصیّت کے حامل ہوں، کیونکہ ایسے افسر حکومت کے لئے باعثِ پریشانی بن سکتے تھے۔

علاوہ ازیں یہ بھی خطرہ تھا کہ حکومتِ ہند ایسی پالیسی اختیار بھی کر لے تو حکومتِ انگلستان کہیں اِس سے منحرف نہ ہو جائے۔ بیس سال کے بعد اب لبرل پارٹی پھر زور پکڑ رہی تھی۔ اِس وقت تک اس پارٹی کی حالت یہ تھی کہ کئی ایسے واقعات پیش آ چکے

تھے۔ جنہوں نے اِس پارٹی کو بے دھڑک بنا دیا تھا۔ برطانیہ کی سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ اِس پارٹی میں ایک بایاں بازو بھی تھا جس میں ایسے انتہا پسند لوگ موجود تھے جو تخریب پسندوں کے ساتھ کم و بیش ہمدردی رکھتے تھے۔ کئی مرتبہ لبرل پارٹی اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جبری ذرائع استعمال کر چکی تھی۔ ٹوری پارٹی کے مقابلہ میں لبرل پارٹی کے اندر جبری ذرائع استعمال کرنے کی استعداد بھی زیادہ تھی۔ تاہم کوئی انگریز، چاہے وہ ٹوری ہو یا لبرل کسی ایسی پالیسی کی حمایت نہ کر سکتا تھا، جو برطانیہ کی مسلّمہ روایات کے خلاف ہو۔

حکومت کو کس حد تک سختی کرنا جائز ہے

اگر برطانیہ ظلم و ستم کو ناروا سمجھتا ہے، تو بڑی اچھی بات ہے، لیکن رفاہِ عامہ کے تمام ادارے کسی حد تک جبر ضرور استعمال کرتے ہیں۔ جب پارٹی کو شکست ہو جائے اُس کے لیڈروں کے لئے ہمدردی تو محسوس کی جا سکتی ہے، لیکن دشمن کی جگہ تختۂ دار کے سوا اور کہاں ہو سکتی ہے۔ اپنے اقتدار کو جبراً قائم رکھنا، جاسوسوں اور پولیس کی امداد سے صدیوں تک بلند خیال اور عالی ہمت افراد کو راستہ سے ہٹاتے رہنا، قید خانہ کے محافظ اور پھانسی

دینے والے جلاّد کے فرائض ادا کرنا، یہ سب دھندے اُن لوگوں کو انجام دینے ہی پڑتے ہیں جو خدائی داروغہ ہونے کا دعویٰ کریں۔

آجکل ایک مقولہ مشہور ہے کہ "تلوار سے جو کچھ چاہو منوا لو، لیکن تلوار کے زور سے زیادہ دیر تم خود چین سے نہیں بیٹھ سکتے"۔ جہاں تک چین سے نہ بیٹھ سکنے کا تعلّق ہے، یہ قاعدہ کلیہ ہر جگہ اور ہمیشہ سچّا ثابت نہیں ہوتا۔ اگر تلواروں کی مطلوبہ تعداد مہیّا ہے، اگر تلوار چلانے والے بلے دھڑک تلوار کے استعمال پہ آمادہ ہیں، اگر شکار کو بسمل کر کے تڑپنے سے باز رکھنے کی طاقت موجود ہے، اگر تلواروں پر زنگ نہیں لگ چکا اور ان کی دھار تیز ہے، اگر تلواروں کی تنظیم میں کوئی خلل نہیں، تو پھر تلواروں کی مدد سے ایک ایسا نظام قائم کرنا ممکن ہے، جس پر اگر حکومت کا سائبان تن دیا جائے اور سرکاری دبدبہ سے اُس کے ارد گرد ایک احاطہ کھینچ دیا جائے تو پھر اس کارخانہ کی مسند پر مدّتوں چین سے بیٹھے رہنے میں کوئی دقّت حائل نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ درست ہے کہ چاہے کوئی شہنشاہ ایسے تخت پر متمکّن ہونے میں کتنی ہی مسرّت کیوں نہ محسوس کرے، لیکن آزادی کے متوالے ایسے تخت پر بیٹھنے میں کوئی خوشی محسوس نہ کریں گے۔ بہرحال برطانوی قوم کو ایسے تخت پر بیٹھنے کی کوئی آرزو

نہ تھی۔

غرض اب ایک ایسا مسئلہ پیدا ہوگیا، جس سے سیاسی مدبرین کو اکثر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ وہ کیا شرائط ہیں جن کو پوری کرچکنے کے بعد کسی تحریک کو شورش کا نام نہیں دینا چاہئے' بلکہ جمہور کے دل و دماغ کی پکار سمجھنا چاہئے۔ کن حالات میں کسی تحریک کو تشدّد سے تباہ کر دینا جائز ہے؟ وہ کیا حالات ہیں جن میں تخت و تاج سے دستبرداری کفرانِ نعمت نہیں، بلکہ پیروئ عدل کہلا سکتی ہے؟ ایک سلطنت کو یہ تو حق ہے کہ اپنے سرکاری ملازمین کو وفادار کارکن بننے پر مجبور کرے، لیکن کسی سرکار کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنے کارکنوں کو مجبور کرے کہ رعایا کو قتل اور ظلم سے اُس کا غلام بنائے رکھیں۔

اگر تعمیری منصوبوں کی تکمیل کی خاطر تشدّد سے باقاعدہ کام لیا جاتا تب بھی جو صورتِ حالات پیدا ہوتی اُس کی ظاہری شکل ظالمانہ استبداد سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوتی۔ میری ذاتی رائے ہے کہ یہ شباہت صرف ظاہری ہوتی، دراصل اس کی کوئی حقیقت نہ ہوتی۔ اس لئے میری رائے میں یہ تشدّد کی پالیسی صرف کارگر اور مؤثر ہی ثابت نہ ہوتی، بلکہ قابلِ تعریف بھی ہوتی۔ لیکن میں آتاترکؔ خود

غلط نہیں کہ اپنی رائے کو ضرور ہی صحیح منوانے پر اصرار کروں۔ حقیقتِ حال کچھ ہو، برطانوی روایات کے خلاف کوئی پالیسی نافذ کرنے کے لئے برطانوی قوم کے اندر غیر معمولی اتفاق و اتحاد کی ضرورت محسوس ہوتی۔ برطانوی قوم میں اس قسم کا اتفاق یا اتحاد ناممکن تھا۔ کیوں ناممکن تھا، اس کی وجوہات اوپر بیان ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں ایسی پالیسی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے عزم بالجزم کی ضرورت تھی۔ ایسا عزم بالجزم صرف اُنہیں قوموں میں پیدا ہو سکتا ہے جنہیں کسی عقیدہ پر پختہ یقین ہو۔ لیکن برطانیہ میں کسی عقیدہ پر پختہ یقین نہ تھا۔ اگر برطانیہ میں کسی اصول پر پختہ یقین تھا تو وہ اصول یہ تھا کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں، اور چار ہزار سالانہ کی آمدنی، تین ہزار سالانہ کی آمدنی سے بہتر ہے۔ اس اصول پر قوم کو پکا ایمان تھا۔ اس اصول میں یہ خوبی تو ہے کہ اس کی سچائی مادی طور پر ثابت کی جا سکتی ہے، لیکن یہ کوئی ایسا اصول نہیں جس پر ایمان لانے سے انسان تقدیر کا مقابلہ کر سکے۔

ہندوستان کو دیسی ریاستوں میں تقسیم کر دینا چاہیئے تھا

ایک دوسرا راستہ یہ تھا کہ سرکاری اختیارات میں منتخب

ہندوستانیوں کو شریک کر دیا جاتا۔ حکومت کی مخالفت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ غیر ملکیوں کی حکومت ہے۔ اِس وجہ سے یا تو اِسے رعایا کی بہتری کا علم نہیں، یا اسے رعایا کی بہتری کی پروا نہیں۔ اس حکومت کے ماتحت ہندوستانیوں کو خود اپنے وطن میں سرکاری فرائض انجام دینے کا موقعہ نہیں ملتا۔ یہ حکومت مشرقی تمدّن کو بنظرِ حقارت دیکھتی ہے۔ یہ حکومت غیر ملکی تمدّن کی تبلیغ کرتی ہے۔ اِس قسم کے بہت سے اعتراضات یوں دور کئے جا سکتے تھے کہ حکومت براہِ راست نظم و نسق میں حصّہ لینا چھوڑ دیتی۔ تمام ہندوستان میں ماتحت ریاستوں کا ایک جال پھیلا دیا جاتا۔ ایسے لوگوں کی کچھ کمی نہ تھی جو بخوبی ہندوستانی راجے اور نواب بن سکتے تھے۔ ہندوستان ایسے خانوادوں سے بھرا پڑا تھا جن کو گدّی پر سے اتار دیا گیا تھا، یا جن کی ریاستوں کا الحاق کر لیا گیا تھا۔ عوام کی نگاہوں میں اِن خاندانوں کا خاصہ احترام تھا۔ اس قسم کی مثالیں موجود تھیں جہاں ایسے خاندانوں کو ایک ریاست سپرد کی گئی اور یہ تجربہ خاصہ کامیاب رہا۔ ریاستِ میسور ایک ایسی ہی مثال موجود ہے۔

بعض منتخب مقامات پر بعض آزاد ریاستیں قائم کر دی جاتیں۔ وہاں ایک چھوٹے پیمانہ پر یہ تجربہ کیا جاتا کہ آیا ہندوستان کے

خواندہ طبقات، اپنے اوپر خود، حکومت کرنے کے قابل بن چکے ہیں؟ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ طریقہ اختیار کرنے کے باعث حکومت کی لیاقت اور کارکردگی کا معیار گر جاتا، عام رعیت اور تاجروں کو شکایت کا موقعہ پیدا ہوتا، لیکن آخر سب طبقات کو تو مطمئن نہیں کیا جاسکتا۔ ریاستوں میں انگریز ریزیڈنٹوں کا قیام اس امر کی ضمانت ہوتا کہ وہاں بہت زیادہ سخت ظلم وستم نہ ہوگا۔

اگر یہ تجویز اختیار کرلی جاتی، تو مالیات، حاکمانہ نگرانی، اور غیر معمولی اختیارات کے متعلق تفصیلات کا تصفیہ کرنا کچھ بہت زیادہ مشکل نہ تھا۔ بالادستی کے اختیارات فرنگیوں کے ہاتھ میں رہتے۔ اعلیٰ افسر بھی فرنگی ہوتے۔ سلطنت کا مرکزی نظم ونسق فرنگیوں کے ماتحت رہتا۔ صوبائی حکومتیں چونکہ مشرقی انداز پر قائم ہوتیں، اس لئے جب کبھی مغرب کے خلاف اہلِ مشرق کوئی بغاوت کرتے، تو اس کو صوبائی حکومتیں خود ہی فی الفور دبا دیتیں یہ حقیقت قابلِ غور ہے کہ بدترین ہندوستانی ریاستوں میں بھی کبھی بغاوت یا غداری کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ اگر کہیں کوئی شورش زیادہ دیر تک فرو نہ ہوتی تو ریاست کا حکمران، اور شورش بپا کرنے والے، ہر دو فریق برطانوی حکومت سے امداد کے خواہاں

ہوتے۔

یہ وہی نظامِ حکومت تھا جو ڈچ قوم نے جاوا میں قائم کر رکھا تھا۔ اِس میں کئی خوبیاں تھیں، اور بعض خرابیاں بھی تھیں ہندوستان بیرونی حملہ کے خطرہ سے باہر نہ تھا۔ اِس وجہ سے یہاں کے سرکاری اخراجات کسی مقررہ رقم تک محدود نہ کئے جا سکتے تھے۔ اگر اختیارات ہندوستانیوں کو منتقل کئے جاتے تو مالیانہ کی شرح اور مدّاتِ خرچ کا مستقل طور پر طے کرنا لازمی ہوتا۔ ممکن ہے اِن قیود سے یہ تجویز ناقابلِ عمل صورت اختیار کر جاتی۔ بہر حال اِس کا تو کبھی تذکرہ بھی زیرِ غور نہ آیا۔

حکومتِ برطانیہ نے کانگرس کیطرف جھکنے کا فیصلہ کر لیا

بڑی غور و خوض اور تذبذب کے بعد برطانوی حکومت نے فیصلہ کیا کہ کانگرس کی مدد کرنی چاہیئے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے برطانوی حکومت کی پرانی عادت ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کی امداد پر آمادہ ہو جایا کرتی ہے۔ ہندوستان کے افسر کسی ایسی پالیسی کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ ہندوستان پر حال ہی میں ایک ایسے زبردست اور خود رائے گورنر جنرل کا راج ختم ہوا تھا، جس نے تمام اقتدار وائسرائے کی ذات کے ماتحت جمع کر دیا تھا۔ اُس نے اپنے

گرد قابل اور مطیع کارکن جمع کر لئے تھے، اور مخالفین کا خاتمہ کر دیا تھا۔

اس گورنر جنرل کا تصادم ایک ایسی شخصیت کے ساتھ ہو گیا جو اُس سے بھی زیادہ زبردست تھی۔ اگرچہ متنازعہ فیہ مسئلہ میں گورنر جنرل کی رائے صحیح تھی، لیکن اُسے شکست ہوئی، اور اُس نے استعفیٰ دے دیا۔ نئے وائسرائے کو نظم و نسق کا کارخانہ اُس حالت میں ملا جس حالت میں اُس کا منصبی پیشرو اِس کارخانے کو چھوڑ گیا تھا لیکن نئے وائسرائے نے برطانوی حکومت کا کارندہ ہونے پر اکتفا کی۔

غرض ہندوستان میں اُس انقلاب کی کوئی مخالفت نہ ہوئی جو بپا کرنے کی اب تجویز کی جا رہی تھی۔ یہ تھا وہ موقعہ جس کی انتظار میں پنڈت جی دیر سے تھے، اور اب آخرِ کار اُن کو یہ موقعہ میسّر آہی گیا تھا۔

اس انقلاب کو برپا کرنے کا عملی سہرا ایک ایسے ہندوستانی سیاستدان کے سر پر ہے جو ہر طرح سے قابلِ تحسین تھا، اور جس نے ایک کٹھن زندگی بسر کرنے کے بعد اب اعتدال پسندوں کی قیادت سنبھال لی تھی۔ اِس سیاستدان کی پارٹی جو دلائل پیش کرتی تھی، وہ

دلنشیں بھی تھے اور خوش وضع بھی۔

جس انگریز کے ہاتھوں اُن دنوں ہندوستان کا قلمدانِ وزارت سپرد تھا وہ اپنی طبعی افتاد اور تربیت کے لحاظ سے لبرل عقیدہ رکھتا تھا، لیکن اُس کا مزاج خود رائی کی جانب مائل تھا۔ وہ کوئی جذبات پرست یا خیالی ہمدردیٔ انسان میں منہمک رہنے والا شخص نہ تھا۔ اُسے بدامنی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اُسے انقلابِ فرانس اور امریکہ کی خانہ جنگی کی تاریخ خوب ازبر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کوئی سنگدل جمہوریت، سرکار سے اختلاف رکھنے والوں کو کس طرح کچل سکتی ہے۔ ہندوستان میں ایک جمہوری حکومت کا قیام نہ تو مستحسن تھا، اور نہ ہی ممکن۔ ہندوستان میں تو نمائندہ حکومت کا قیام بھی مفید ثابت ہونے کی اُمید نہ تھی۔ امن وامان قائم رکھنا بیشک ضروری ہے، لیکن یہ کام ایک ایسی حکومت کے سپرد نہ کیا جاسکتا تھا جو کہ استبدادی حکومت تھی، اور جس کو نوکر شاہی سمجھا جاتا تھا۔ ضرورت یہ تھی کہ امن وامان قائم رکھنے کے لئے عوام کی امداد حاصل کرنے کی کوئی صورت نکالی جائے۔ وزیرِ ہند کا خیال تھا کہ اُس کے سامنے جو تجاویز پیش کی جارہی ہیں اُن سے یہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔

ہندوستانیوں نے دوست بن کر انگریز سے راج چھینا ہے

وزیرِ ہند کو پٹّی پڑھانے والے ہندوستانی کہتے تھے: ہماری سنئے تو حکومتِ ہند کے نظام میں ایک بنیادی نقص ہے۔ اوّل تو یہ حکومت ظالمانہ ہے۔ دوسرے کمزور بھی ہے۔ یہ حکومت ہمیشہ غیر معمولی اختیارات حاصل کرنے کے لئے قانون بناتی رہتی ہے، لیکن یہ اختیارات استعمال کرنے کا حوصلہ اُسے کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ رعایا چاہتی ہے حکومت ہمدرد اور نفع رساں ہو۔ رعایا ایسی حکومت کی عزّت کرتی ہے جو مضبوط اور زبردست ہو۔ لیکن رعایا کسی ایسی حکومت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کے سوا کیا کر سکتی ہے جو ظلم بھی کرتی ہو، اور بزدل بھی ہو۔ حکومتِ ہند نہ جنگ لڑنے کے قابل ہے، اور نہ امن قائم رکھ سکتی ہے۔ سارے ملک میں دبی ہوئی بے چینی کھول رہی ہے۔ اس بے چینی کی وجہ یہ ہے کہ حکومت ہمیشہ رعایا کے جذبات سے لاپروائی کا سلوک کرتی ہے۔ ممکن ہے رعایا کے جذبات احمقانہ ہوں، لیکن کوئی عقلمند حکومت رعایا کے گہرے اور عام جذبات کو مجروح نہیں کرتی، چاہے وہ کیسے ہی احمقانہ کیوں نہ ہوں۔ حکومت کی پالیسی کوئی پالیسی ہی نہیں۔ حکومت کی پالیسی صرف یہ ہے کہ گاہے گاہے

جو من میں آئے کرتی رہے، اور پھر اپنی بے تکی حرکات میں ربط پیدا کرنے کے لئے سرگرداں رہے۔ حکومت کی ناکامی کا سبب بالکل عیاں ہے۔ یہ حکومت ایک دفتری حکومت ہے۔ اِس لئے اِس کو حقیقتِ حال کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ پھر یہ حکومت رائے عامہ سے بھی بالکل منقطع ہے

"ہمیں یہ صورتِ حال دیکھ کر رنج ہوتا ہے، کیونکہ ہم تاجِ برطانیہ اور برطانوی پارلیمنٹ کے وفادار ہیں۔ آجکل برطانیہ کی حکومت لبرل عقیدہ رکھنے والوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے ہم اِس حکومت سے اور بھی زیادہ عقیدت رکھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ برطانیہ کی بالادستی قائم رہے، بلکہ اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان کے عام باشندے ابھی سچے لبرل نہیں بن چکے۔ ہمیں یہ بدامنی دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ ہم ایسی تحریکوں کو دیکھ کر خدشہ محسوس کرتے ہیں جو شاید برطانوی راج ہی کا خاتمہ کر دیں۔ برطانیہ کے مفاد کی حفاظت کے لئے ہم جو کچھ کر سکتے ہیں کرنے پر آمادہ ہیں لیکن ہماری حیثیت کیا ہے۔ ہمارے جاہل ہموطن ہمیں شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کیونکہ ہم برطانیہ کے دوست ہیں۔ اور حکومتِ ہند ہماری توہین کر کے ہمیں پرے

دھکیل دیتی ہے، کیونکہ ہم ہندوستانی ہیں۔

تمہیں تمہاری قسم ہمیں لیڈر بنادو

"دراصل ہم ہندوستانیوں کے لئے طبعی طور پر موزوں لیڈر ہیں ہم جس ذات اور نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اُس کی ہندوستان میں ہر جگہ عزّت کی جاتی ہے۔ بحالاتِ موجودہ جہاں تک کوئی ہندوستانی اقتدار حاصل کر سکتا ہے، ہم اِس اقتدار کے واحد اجارہ دار ہیں۔ ہم یورپین تمدّن سیکھ چکے ہیں، اور اِس کے ساتھ ساتھ ہم نے اپنی مشرقیت بالکل ترک نہیں کی۔ ہماری صفوں میں کئی ایسے لوگ موجود ہیں، جن کو پرانی وضع کے باشندے بھی احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہم رعایا اور حکومت کے مابین بہترین ہمزۂ وصل ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہم جاہل اور بے زبان جمہور کے جذبات کی ترجمانی حکمرانوں کے سامنے کر سکتے ہیں، اور حکومت جو قدم اٹھائے اُس کی وضاحت ہم جمہور کے سامنے ایسے الفاظ میں کر سکتے ہیں جو اُن کی سمجھ میں آجائیں۔ لیکن یہ منصب مؤثر طور پر ادا کرنے کے لئے ہمیں رسمی عہدے بھی ملنے چاہئیں۔ جب تک ہمیں نظم و نسق میں جگہ نہیں دی جاتی، تب تک ہمیں ملک میں وہ وزن حاصل نہیں ہو سکتا جو ہمیں ضرور حاصل ہونا چاہئے۔ جب

تک ہمیں کوئی عہدہ نہیں ملتا تب تک حکومت کبھی ہماری فریاد پر کان نہیں دھرے گی۔ سالہا سال سے ہم عاجزانہ طور پر نہایت معمولی قسم کی اصلاحات کے لئے درخواست کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ اصلاحات نافذ کرانے میں ناکام رہ کر اپنے ہموطنوں کی نگاہ میں ہماری پوزیشن مضحکہ خیز بن چکی ہے۔ لوگ کہتے ہیں: تم تو نرے بے غیرت اور خوشامدی ہو۔ حکومت بھی ہمیں بے شرم اور گداگر بھکاری سمجھتی ہے۔ اگر حالات اسی نہج پر قائم رہے تو خدشہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ اپنی قابلیت اور رسوخ سے انقلابیوں کی امداد پر مجبور ہو جائیں گے۔

"ہم کچھ زیادہ نہیں مانگتے: تھوڑی سی نوکریاں، معمولی سا اقتدار، کوئی ایسی سرکاری حیثیت جہاں سے ہم حکومت کے سامنے اپنے خیالات رسمی طور پر پیش کر سکیں۔ اگر ہمارا کہا مان لیا جائے تو ملک کی سیاسی حالت ایسی بدل جائے گی گویا کوئی جادو ہو گیا ہے۔ حکومت انسانیت سے آراستہ ہو جائے گی۔ ہم مانتے ہیں کہ حکومت آج بھی لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہتی ہے، لیکن ہماری امداد حاصل کرنے کے بعد وہ سچ مچ نفع رساں بن جائے گی۔

ہمیں منصب مل جائے تو سب ٹھیک ہو جائیگا

"حکومت کو پتہ چل جائے گا کہ لوگوں کی اصلی شکایات کیا ہیں اور پھر وہ اِن شکایات کا علاج بھی کر سکے گی۔ یہ علاج سیکریٹریٹ کے خلوت خانوں میں چھپ کر تجویز نہ کیا جائے گا، بلکہ یہ ایک ایسا علاج ہوگا جو مریض کی واقعی حالت کے مطابق ہوگا۔ خلوت خانوں میں بیٹھ کر تجویز کئے ہوئے علاج اکثر مریض کی حالت پہلے سے بھی بدتر بنا دیتے ہیں۔ ہمارے وہ گمراہ ہموطن جو حکومت کے ظلم اور ناقابلیت کے باعث بغاوت پر مجبور ہو رہے ہیں، جب دیکھیں گے کہ اُن کی شکایات دور ہو رہی ہیں، اور اُن کے ملک کے باشندے جن پر اُنہیں اعتماد ہے اقتدار پہ قابض ہیں، تو وہ مخاصمانہ مخالفت سے باز آجائیں گے۔ موجودہ حکومت کے ظلم اور ناقابلیت میں اِس بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ حکومت کو چلانے والے لوگ مخلص، دیانتدار، اور نیک نیت انسان ہیں۔ جب ہمارے گمراہ ہموطن راہِ راست پر آجائیں گے تو پھر وہ حکومتِ برطانیہ اور بادشاہ کی ذات سے ویسی ہی وفاداری اختیار کرلیں گے جو اہلِ مشرق کا خاصہ ہے۔ چونکہ موجودہ حکومتِ برطانیہ لبرل پارٹی کی حکومت ہے اس لئے اُس کے ساتھ اُن کی یہ وفاداری اور بھی زیادہ گہری

ہوگی۔

"جو حکومت یوں قائم ہوگی جس پر اس طرح قابو رکھا جائے گا، اور جس کو عوام کی حمایت حاصل ہوگی، ایسی حکومت موجودہ ظالم اور کمزور حکومت کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ مضبوطی سے بدامنی کا تدارک کر سکے گی۔ سرکار کی مخالفت کا کہیں نام نہ رہے گا۔ اگر تھوڑی بہت مخالفت باقی رہ بھی گئی تو وہ اُس نسلی دشمنی کا نتیجہ ہوگی جو چند کینہ پرور اور بغض رکھنے والے سینوں تک محدود ہے۔ ایسے متعصب اور مجنون لوگوں کو دبانے کے لئے تشدد کا استعمال بالکل جائز ہوگا۔ اگر ایسا تشدد کیا گیا تو ہندوستان کی رعایا اِس کا خیر مقدم کرے گی۔ ہندوستان کے لوگ بدامنی سے تنگ آچکے ہیں۔ جب حکومتِ ہند کو علم ہو جائیگا کہ اُسے برطانوی حکومت کی تائید حاصل ہے تو پھر وہ زیادہ مضبوطی سے تشدد کا استعمال کر سکے گی۔ جب تک حکومتِ ہند ایک استبدادی حکومت اور نوکر شاہی ہے، تب تک اُسے برطانوی حکومت کا بھی پورا اعتماد کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ ذرا حکومتِ ہند عوام کے نمائندگان کو اپنے ساتھ شامل کر کے تو دیکھے، اُس کے بعد حکومتِ ہند کو ایک ایسی حکومت سمجھا جائے گا جو اگرچہ بالکل آزاد نہیں لیکن ایک ایسی حکومت ہے جسے بالادست حکمرانوں

نے اپنے اقتدار میں برابر کا شریک کر لیا ہے۔ اس کے بعد ایسی حکومت جو کچھ کرے گی اُس پر کوئی ترقی پسند سے ترقی پسند سیاستدان بھی زیادہ سختی سے نکتہ چینی نہ کر سکے گا۔ ہم پر بھروسہ کر کے تو دیکھئے!"

انگریز غچا کھا گئے

اس قسم کے دلائل بظاہر خاصے معقول نظر آتے تھے۔ جو سیاستدان سالہا سال سے ایک آزاد آئین کے ماتحت حکومت چلا رہے ہوں اور جانتے ہوں کہ مخالف ٹولیوں کو راضی کر کے لگام دی جا سکتی ہے، اور اُن کی سرگرمیاں حکومت کی تقویت کا سبب بنائی جا سکتی ہیں، اُن پر ایسے دلائل کا خاصہ گہرا اثر ہوتا ہے، بالخصوص جب یہ سیاستدان ہندوستان کے نظامِ حکومت کے خلاف اپنے جذبات مدّتوں سے سینہ میں دبائے بیٹھے ہوں۔ جب اُنہیں پتہ چلتا تھا کہ حکومتِ ہند کی کارگزاری کی رفتار، حکومتِ برطانیہ سے بہتر ہے تو اُنہیں اور غصّہ آتا تھا۔

غرض اِس طرح سے اصلاحات کی پہلی قسط تیار کی گئی، اور پھر اِس پر عمل درآمد کرانے کے لئے اُسی عزم بالجزم سے کام لیا گیا جو جاندار، تنگ نظر اور مستقل مزاج ذہنوں کا خاصہ ہوا کرتا ہے۔

کانگریس کو خاصی مراعات دی گئیں۔ حکومتِ ہند اور پریزیڈنسیوں کی انتظامیہ مجالس میں ہندوستانیوں کو بھی مقرّر کیا جانے لگا۔ بنگال کو گورنر کا صوبہ بنا دیا گیا۔ ایک انگریز مدبّر کو وہاں کا گورنر بنایا گیا، اور گورنر کی ایک کونسل بھی مقرّر کر دی گئی۔ تجویز یہ تھی کہ پریزیڈنسیوں کا نظامِ حکومت بتدریج اُن صوبوں میں بھی نافذ کر دیا جائے گا جہاں لفٹننٹ گورنروں کی حکومت ہے۔ مشرقی بنگال کا صوبہ منسوخ کر دیا گیا، اور اُس کا علاقہ بنگال و آسام میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ بنگال کا کچھ علاقہ علحدہ کر کے بہار کا ایک نیا صوبہ قائم کر دیا گیا۔

جدید آئینی اصلاحات کا ایک خاکہ

مجلس قانون ساز ابھی تک خالی قانون سازی ہی کے فرائض سر انجام دیتی تھی۔ مجلسِ قانون ساز کے اراکین کو خود کوئی مسوّدۂ قانون پیش کرنے کا اختیار نہ تھا۔ مجلسِ قانون ساز کو انتظامی حکومت اور مالیات پر کوئی قابو حاصل نہ تھا۔ اب مجالسِ قانون ساز کے اراکین کی تعداد میں توسیع کر دی گئی اور ایوان میں منتخب اراکین کی بھی اچھّی خاصی تعداد نظر آنے لگی، اگرچہ یہ تعداد ابھی تک اقلّیت میں تھی۔ حق رائے دہندگی محدود تھا، اور اصلاحات کا مصنّف اپنی

رائے کے خلاف فرقہ وارانہ نیابت کا اصول تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مصنّف کا خیال تو یہ تھا کہ فرقہ وارانہ نیابت کا اصول شرارت انگیز ہے، لیکن مسلمان رائے عامہ کو بالکل نا اُمید کر کے حکومت سے منحرف، کر دینا بھی ممکن نہ تھا۔ مجلسِ قانون ساز کے اراکین کو قوانین میں ترمیم کرنے اور مداخلت کے پہلے سے زیادہ اختیارات دیئے گئے۔ سیاسی مجرموں کو مجلسِ قانون ساز کی رکنیت حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ مجلسِ قانون ساز کے وہ اراکین جو سرکاری ملازم تھے، کونسل میں اقلیّت کی حیثیّت رکھتے تھے۔ لیکن حکومت سرکار کی جانب سے کئی اراکین نامزد کر کے ایوان میں اپنی اکثریت قائم رکھتی تھی۔

اِس بات کا پکّا ارادہ کر لیا گیا تھا کہ یورپین افسروں کی کم سے کم ممکن تعداد اِن مجالس کی رکن ہوا کرے گی، لیکن اس تخفیف کی تجویز پر فی الفور عمل نہ کیا گیا۔ یہ حقیقت نظر انداز نہ کی جا سکتی تھی کہ ایک خاص تعداد سے کم یورپین مقرّر ہوئے تو کام نہ چلے گا۔ یورپین سرکاری ملازمین کے تناسب کا یہ مسئلہ ایک کمیشن کے سپرد کر دیا گیا۔ اِس کمیشن کی کارروائی خفیہ نہ رکھّی گئی۔ اِس سے سخت نسلی منافرت پھیلی۔ اسی دوران میں منصب حاصل کرنے کے

متعلق ہندوستانیوں کے مطالبات پر بڑی ہمدردی سے غور کی گئی۔

ابھی یہ کوشش نہ تھی کہ ہندوستان میں کوئی قومی حکومت قائم کردی جائے حکومتِ ہند بدستورِ سابق حکومتِ برطانیہ کی کارندہ تھی، بلکہ اب تو اُسے اور بھی زیادہ سختی سے حکومتِ برطانیہ کے ماتحت کر دیا گیا تھا۔ ہاں حکومتِ ہند اب صرف یورپین حکمرانوں پر مشتمل نہ تھی۔ توقع یہ تھی کہ یورپینوں اور ہندوستانیوں کی یہ ملی جلی نئی حکومت، یورپینوں کا اقتدار قائم رکھنے کے لئے پرانی حکومت کے مقابلہ میں زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ یہ بھی اُمید تھی کہ نئی حکومت کو پہلی حکومت کے مقابلہ میں زیادہ جمہوری تائید حاصل ہوگی۔ اس اُمید کی وجہ یہ تھی کہ نئی حکومت کی تشکیل میں ہندوستانی بھی شامل تھے۔ دوسرے نئی حکومت کے لئے یہ بھی موقعہ تھا کہ لوگوں کو فائدہ پہنچا کر راضی کر لے۔ تیسرے نئی حکومت کو مقامی مشکلات کا زیادہ علم ہونا چاہئے تھا، اور اُسے مقامی لوگوں سے زیادہ ہمدردی بھی ہونی چاہئے تھی۔

برطانیہ کے انڈیا آفس میں بھی اب کچھ تبدیلی کی گئی۔ وزیرِ ہند کی کونسل میں دو ہندوستانی اراکین کا اضافہ کر دیا گیا۔ یہ دونوں اراکین

ہندوستان کے دو بڑے مذہبی فرقوں کے نمائندہ ہوتے تھے۔ اِن تبدیلیوں سے اعتدال پسندوں کے اقتدار میں کچھ بہت زیادہ اضافہ نہ ہوا، کیونکہ وزیرِ ہند کی کونسل کوئی خاص کام بھی نہ کرتی تھی، اور نہ وزیرِ ہند کوئی ایسا شخص تھا جو اپنی کونسل کے مشوروں کی کچھ زیادہ پروا کرتا۔ ہاں اِن دو اراکین کی شمولیت سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ انڈیا آفس میں ہینگ اور عبدالرحمٰن سٹریٹ کی خوشبوئیں جھکنے لگیں۔ کچھ لوگوں کو یہ خوشبو سونگھ کر بڑا لطف آتا تھا۔ وزیرِ ہند اِن دو اراکین سے ذاتی مشورہ کر کے ضرور فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔

یہاں اِس آئین پر تفصیلی تنقید کرنے کی ضرورت نہیں۔ اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں، دونوں نے اِس آئین کا استقبال نعرہ ہائے مسرّت سے کیا۔ اخبارات میں اور اسٹیج پر دیر تک وہ لوگ اِس آئین کی تائید میں قصیدے پڑھتے رہے جنہیں ہمیشہ ان کی قیمت ادا کر کے خریدا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ آئین روزِ پیدائش سے ہی ایک مصنوعی آئین تھا، اور اِسی وجہ سے اِس میں زندگی کے آثار نہ تھے۔

یہ آئین تعلیم یافتہ برہمنوں کی ڈکٹیٹر شپ قائم کر دیتا

میرا خیال ہے کہ اِس آئین کی یہ کمزوری ایک رحمت تھی۔ جہاں تک میں اِس آئین کو سمجھ سکا ہوں، اگر یہ باقی رہ جاتا تو ہندوستان کے سر پر بڑا بوجھ ثابت ہوتا۔ اِس آئین کو باقی رکھنے کو ایک ہی شرط لازمی اور کافی تھی، یعنی یہ کہ حکومتِ ہند اور سیاسی مزاج رکھنے والے ہندوستانیوں میں باہم تعاون رہتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو یقیناً پھر حکومتِ ہند کو جنبش دینا ناممکن تھا۔ چاہے اِس بات کا اقرار نہ بھی کیا جاتا، پھر بھی یہ حکومتِ ہندوستان پر تعلیم یافتہ برہمنوں کی حکومت ہوتی۔ تعلیم یافتہ برہمن ہندوستان کے اسکولوں، اخباروں اور وکالت خانوں پر قابض تھے۔ اُس وقت بھی نظم و نسق کے ماتحت عہدوں پہ اُن کا تسلّط تھا۔ اُن کے دوست اور رشتہ دار ہندوؤں کے ضمیر پر سوار تھے۔ اب ان کے قبضہ میں نظم و نسق کے اعلیٰ عہدے بھی آنے والے تھے۔ تھوڑا ہی عرصہ بعد اُنہیں حکومت کی اعلیٰ مجالس میں بھی اکثریت حاصل ہونے والی تھی۔ مجالس قانون ساز پر اُن کو پہلے سے قابو حاصل تھا، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ مجالس قانون ساز تھیں ہی اُنہیں کی تخلیق عدالتوں پر بھی وہی متمکن تھے۔ یہ ہولناک طور پر مستحکم حکومت ایک نوکر

شاہی ہوتی۔ یہ ایک ہندوستانی نوکر شاہی ہوتی۔ اس کو ہندوستان کی زبردست افواج کی پناہ حاصل ہوتی۔ یورپین ملازم اِس کے تنخواہ دار خدمتگار ہوتے۔ اِس کے خلاف بغاوت تاجِ برطانیہ کے خلاف بغاوت سمجھی جاتی۔

اہلِ مشرق کی استبدادی حکومت خوفناک ہوتی۔ لوگ مشرقی استبداد اس وجہ سے برداشت کر لیتے ہیں کہ اس کا نظامِ حکومت مؤثر نہیں ہوتا، اور اس لئے اگرچہ اصولاً حریت ناپید ہوتی ہے لیکن درحقیقت رعایا کو خاصی آزادی حاصل رہتی ہے۔ یورپین استبداد بھی ایک ہولناک شئے ہے، بلکہ زیادہ ہولناک ہے، کیونکہ یورپین استبداد کا نظامِ حکومت مؤثر بھی ہوتا ہے۔ لیکن یورپین استبداد صرف سیاسی مسائل پر حاوی ہوتا ہے۔ یورپین استبداد نے کبھی اپنی رعایا کی ذاتی زندگیوں پر حکومت جمانے کی کوشش نہیں کی، اور اب تو یورپین استبداد رعایا کے ذاتی خیالات میں بھی دخل نہیں دیتا۔ علاوہ ازیں یورپ میں استبدادی حکومتوں پر اور بھی کئی اَن دیکھی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ اگر یہ پابندیاں از روئے آئین نافذ نہیں ہوتیں تو اس سے اُن کے مؤثر ہونے میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن ایک ایسا مشرقی استبداد جس کی روح مشرق کے آمرانہ تصورات

سے سرشار ہو، جس کے ماتحت فرانسیسی نمونہ کا نظم ونسق ہو، اور جسے سیاسی فنون کے متعلق وہ علوم حاصل ہوں جو نشاۃ ثانیہ کے بعد اٹلی میں فروغ پاتے رہے، ایسا استبداد اگر باقی رہ جائے تو ایک انتہائی بھیانک نظامِ حکومت ثابت ہوگا۔

ہندوستان اگر اس عذابِ الیم سے بچ گیا تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ یہ نظامِ حکومت اپنی طبعی خامیوں کے باعث زندہ ہی نہ رہ سکتا تھا۔ سیاسی مزاج رکھنے والے ہندوستانیوں کی حماقت اور زمانہ کی رفتار نے اِس نظامِ حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس نظامِ حکومت میں بعض ایسی خامیاں بھی تھیں جنہیں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ تعجب اس لئے ہوتا ہے کہ اِس نظامِ حکومت کا آئین تجویز کرنے والا ایک ایسا شخص تھا جو انقلابِ فرانس کی تاریخ سے بخوبی آگاہ تھا۔

جدید آئین فرانس کے آئین سے ملتا جلتا تھا

انقلابِ فرانس کے دوران میں ڈائریکٹری کے وقت جو آئین رائج تھا، اُس میں اور ہندوستان کے زیرِ بحث جدید آئین میں خاصی شباہت تھی۔ فرانس کے مذکورہ آئین کی رو سے بھی انتظامی حکومت اور مجلس قانون ساز کے مابین کوئی رابطہ نہ تھا۔ علاوہ ازیں اُس

آئین میں بھی بالادستی کے اختیارات ایک ایسی مجلس کو حاصل تھے جس کے اراکین اہم مسائل پر بنیادی اختلافِ رائے رکھتے تھے۔ فرانس میں اس وقت کا علاج یہ تجویز کیا گیا کہ مسلسل اور بار بار جبری تبدیلیٔ حکومت کے واقعات رونما ہوتے رہے۔ ہر جبری تبدیلیٔ حکومت کے بعد ایوانِ نمائندگان کی "تطہیر" کی جاتی تھی، اور جو ڈائریکٹر چنیں چناں کرتا تھا اُسے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا جاتا۔ اس طرح کچھ عرصہ فرانس کی حکومت چلتی رہی اور اُس کے بعد: بقولِ شخصے: "جو ڈائریکٹری سارے یورپ کو دہشت زدہ کر چکی تھی، جس نے اپنے اشارۂ ابرو سے کئی حکومتوں کو تباہ کر دیا تھا لیکن جسے نہ صلح کی تمیز تھی، نہ جنگ کا سلیقہ تھا، ایک پھونک مارنے سے ختم ہو گئی۔" بیچارہ ہندوستان اگر اس آئین کے ماتحت رہتا تو نہ تو اُسے موسمِ بہار دیکھنا نصیب ہوتا، اور نہ ہی کبھی موسمِ برسات کا سبزہ وہاں لہراتا، بلکہ ہمیشہ کے لئے ملک موسمِ خزاں میں ہی گرفتار رہتا۔

حکومت کا انتظامی شعبہ مضبوط ہونا چاہیئے

تمام وہ سیاست دان جو کچھ کام کرنا جانتے ہیں، اس امر پر متفق ہیں کہ آئینِ حکومت میں انتظامی اعضاء مضبوط ہونے چاہئیں۔

انتظامی شعبۂ حکومت کو مضبوط بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تمام انتظامی اختیارات کا مجاز کوئی فردِ واحد ہو۔ اگر یہ ضرورت لاحق ہو کہ انتظامی اختیارات ضرور کسی مجلس ہی کے سپرد کرنے ہیں، تو پھر اس مجلس کے اراکین کی تعداد مختصر ہونی چاہیئے، اور اُن کی قیادت کسی ایک باسطوت شخصیت کے سپرد ہونی چاہیئے۔ مجلس کے اراکین ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو اہم امور پہ باہم متفق ہوں۔

لمبی چوڑی کمیٹیوں کے ذریعہ کوئی انتظامی مہم انجام نہیں دی جا سکتی۔ فی زمانہ آئین سازی کے ماہرین کو اپنی تمام توجہ ایسی پابندیوں کی اختراع پر صرف کرنی پڑتی ہے، جن سے ایسے زبردست اختیارات رکھنے والی انتظامیہ کو، خود غرضی، قانون شکنی، اور نفس پروری سے باز رکھا جا سکے۔ ہندوستان میں وہاں کی حکومت کی آمرانہ روایات کے باعث حکومت کے انتظامی شعبہ کو زیادہ با اختیار بنانا اور بھی ضروری تھا۔ وائسرائے اور گورنر جنرل کے اختیارات میں تفریق پیدا کرنے سے حکومت کا انتظامی شعبہ مضبوط نہ بنایا جا سکتا تھا۔ محض وائسرائے کے عہدہ کے لئے مضبوط شخصیتیں منتخب کر کے بھی یہ کمی پوری نہ کی جا سکتی تھی۔

یہاں مجلسِ انتظامیہ اور مجلس قانون ساز کے باہمی تعلقات کا ذکر نہ کیا جائے گا۔ اِس موضوع پر بعد میں بحث ہو گی۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہو گا کہ تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ایسی مجلسِ قانون ساز جس کے کندھوں پر کوئی ذمہ داری نہ ہو، اور ایک ایسی مجلسِ انتظامیہ جسے مجلس قانون ساز معزول نہیں کر سکتی، اُن دونوں کے باہمی تعلقات شاذ و نادر ہی اچھے ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ تعلقات اچھے نہ تھے۔

عہدے تھوڑے تھے اور امیدوار بہت

ہندوستانیوں کو اعلیٰ سرکاری عہدے دینے کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ جن لوگوں کو یہ عہدے نہ ملے وہ شاکی رہنے لگے۔ اُن کا خیال تھا کہ اِن مناصب سے تو خالی عزّت اور نفع حاصل کرنا مراد ہے۔ حکومت جب کبھی کوئی ایسا عہدہ کسی ایک ہندوستانی کو سونپتی تھی تو حکومت کے دس دشمن بڑھ جاتے تھے، اور جس کو عہدہ دیا جاتا تھا وہ بھی ناشکرا ثابت ہوتا تھا جن ہندوستانیوں کو عہدے دیئے جاتے تھے، اُن میں سے بعض تو ضرور اعلیٰ قابلیّت، اچھی تربیّت، بھلے چال چلن والے اور وفادار انسان تھے۔ پھر بھی آدمی کے لئے یہ مشکل ہے کہ

اپنے آپ کو ذات، مذہب، خاندانی تعلقات، ابتدائی تعلیم اور سیاسی روابط سے بالکل علیحدہ رکھے۔ حکومت کی خدمت تو وفاداری سے کی جاتی تھی، لیکن نہ تو اِس خدمت میں کسی کو اعتقاد تھا، اور نہ اِس کے لئے کسی کے دل میں جوش و خروش۔ ابھی وہ وقت تو نہ آیا تھا کہ اعلیٰ مناصب کو مجرمانہ خروج یا حکومت کی دھڑابند مخالفت کا صلہ سمجھا جاتا، لیکن اِس کا انکار نہ کیا جا سکتا تھا کہ یہ ساری تجویز ہی خلافِ قانون شورش پیدا کرنے والوں کے سامنے جھک جانے کے مترادف تھی۔

حکومت کو اعتدال پسندوں سے مصالحت کا کچھ فائدہ نہ ہوا

یوں جب اعتدال پسندوں کو وہ قیمت ادا کر دی گئی جو اُنھوں نے مانگی تھی، اور اب اُن سے تقاضا کیا گیا کہ لائیے صاحب سودا حوالے کیجئے، تو پتہ چلا کہ وہ تو سودا حوالے کر ہی نہیں سکتے۔ حقیقی اعتدال پسند پارٹی کے اراکین کی تعداد معدودِ چند تھی۔ ملک میں اُن کا کوئی رسوخ نہ تھا۔ جب تک اعتدال پسند حکومت کے مخالف تھے تو اُن کو انتہا پسندوں کی امداد حاصل تھی۔ جوں ہی معلوم ہوا کہ اعتدال پسند تو ملیچھوں کی امداد کرنا چاہتے ہیں تو انتہا پسندوں نے اعتدال پسند لیڈروں

کا ساتھ چھوڑ دیا۔ انتہا پسند مذہب کے نام پر اپیل کرنے کے باعث ملک میں اپنے کچھ مقلّدین پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ قدیم وضع کے لوگ انتہا پسندوں کو بھی بداعتمادی اور ایک موہوم ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بہرحال اعتدال پسندوں کا پروگرام تو ایک عام ہندوستانی کی عقل و خرد سے ہی باہر تھا۔ اگر ایک عام ہندوستانی اُن کا پروگرام سمجھ بھی جاتا تو اُسے انتہائی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا۔ اکثر اعتدال پسند بزدل تھے۔ انہیں یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ جو تھوڑا بہت رسوخ انہیں حاصل تھا، وہ بھی نہ چھن جائے۔ اُنہیں یہ بھی خوف تھا کہ کہیں قتل ہی نہ کر دیئے جائیں۔ وہ اپنی جان یا آبرو (جو ہندوستانیوں کو جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے) کسی ایسی پالیسی کی حمایت کر کے ضائع نہ کرنا چاہتے تھے، جو انتہا پسندوں، یا بلوائیوں کے منشاء کے خلاف ہو۔

غرض اعتدال پسندوں نے حکومت کی حمایت کرنے کے بجائے، سرکاری مناصب حاصل کرنے کے بعد بھی حکومت کے خلاف جھوٹا اور منفی پراپیگنڈا جاری رکھا۔ برسرِ اقتدار آنے سے پہلے اپنی کانفرنسوں اور اجتماعات میں وہ حکومت کے خلاف

جس طبعی مخاصمت کا اظہار کیا کرتے تھے، وہ سلسلہ اب بھی جاری رہا۔ جب حکومت پر کچھ بے فائدہ کوششوں کے بعد ثابت ہو گیا کہ اعتدال پسندوں کو نہ تو مراعات سے راضی کیا جا سکتا ہے' نہ روپیہ اور انعامات دے کر، نہ خوشامد سے، نہ تلقین کر کے' اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ اس پالیسی کا انجام کیا ہوگا، اس طرح حکومت کا انتظامی شعبہ مضبوط نہ ہوگا بلکہ حکومت کا اقتدار ہی ختم ہو جائیگا، تو تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد حکومت پھر اُسی راستہ پہ گامزن ہوگئی جس پہ وہ ایک مرتبہ چل چکی تھی۔

باوجود مراعات کے، حکومت کے خلاف شکایات بڑھ گئیں

پروگرام کے پہلے حصّہ کی ناکامی سے، پروگرام کے دوسرے حصّہ کی اجراء میں فرق نہ آیا حقیقت یہ ہے کہ پہلے حصّہ کی ناکامی کے بعد دوسرے حصّہ کی اجراء اب زیادہ ضروری ہو چکی تھی۔ ملک میں قتل کا سلسلہ تو بند ہو چکا تھا، لیکن ایک خطرناک شورش بدستور پھیلتی جا رہی تھی۔ اب افواج کے سپاہیوں کو حکومت سے برگشتہ کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا تھا۔ انتہا پسند تھوڑی دیر تو یہ خوشیاں مناتے رہے کہ برطانوی استبداد ختم ہو گیا، اِس کے بعد اُن کو یقین ہو گیا کہ یہ اصلاحات

تو محض ایک دھوکہ تھیں، اور اُن کی منزل اب بھی کوسوں دور ہے۔ اُن کے اعتدال پسند بھائیوں کو جو انعامات اور رعایات دی جا رہی تھیں، اُن سے انتہا پسندوں کو کوئی خوشی نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ خوشامدی اور مذہب کے غدّار ہیں۔

اب شورش کو سختی سے دبانے کے لئے ایسے قوانین وضع کئے گئے جن کا اثر بڑا دور رس ثابت ہوا۔ اعتدال پسندوں نے اِن قوانین کا بڑی شدّت اور تلخی سے مقابلہ کیا، یا جہاں کہیں اِن قوانین کی حمایت کی تو ساتھ ہی حکومت پر بھی نکتہ چینی کی کہ حکومت کی بدنظمی سے ایسے قوانین وضع کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی ہے۔

سختی کے ساتھ نرمی کو ملانے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا

حکومت نے نامزد کردہ اراکین کی اکثریت سے کام لیتے ہوئے مجالسِ قانون ساز سے یہ قوانین منظور کرا ہی لئے۔ اِن قوانین کے ذریعہ حکومت کو کافی اختیارات حاصل ہو گئے۔ اب حکومت اخبارات پر قابو پا سکتی تھی۔ اِن قوانین کی رو سے قتل اور بغاوت کی کھلی تلقین ممنوع تھی۔ پبلک جلسے اور کانفرنسیں منعقد کرنے پر بھی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ایسے خاص ٹریبونل مقرر کر دیئے گئے جو اگرچہ غیر جانبدار اور با وقار تھے

نیز حکومت کے انتظامی شعبہ کے مرغِ دست آموز بھی نہ تھے، لیکن جن کی کارروائی فوری اور بلا تاخیر ہوتی تھی۔

جب سختی اور تشدّد کی حاجت ہو تو اُس وقت سختی اور تشدّد جائز ہیں، لیکن اُتنی ہی دیر تک جائز ہیں جب تک اُن کی ضرورت ہو۔ جب ضرورت نہ رہے تو سختی اور تشدّد ناجائز ہو جاتے ہیں۔ جب سختی اور تشدّد کی ضرورت ہو اور فیصلہ کیا جائے کہ سختی اور تشدّد کرنا ہے، تب سختی اور تشدّد بے رحمی، سکون، اور سنگدلی کے ساتھ کرنا چاہیئے، اور اُس وقت تک جاری رکھنا چاہیئے جب تک اس کی ضرورت باقی ہو۔ ٹھہر ٹھہر کر سختی اور تشدّد کا استعمال بیکار ہے، اور من مانے ظلم و جبر سے کسی طرح مختلف نہیں۔

بیک وقت بچّے کو ایک طرف تھپیڑ مارنا اور دوسری طرف مٹھائی کھلانا ایک ایسی پالیسی ہے جس سے کبھی کوئی اچھّا نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اگر سزا کسی مستقل اصول کے مطابق نہ دی جائے، اور جب دی جائے لاپروائی سے دی جائے، تو ایسی سزا بالکل بے اثر رہتی ہے۔ حکومت ہند نے یہ سخت قوانین منظور تو کر لئے، اور صوبائی حکومتوں کو بھی ان کے استعمال کی اجازت

دے دی، لیکن اِس کے بعد حکومت اِن قوانین کے ماتحت اختیارات کو استعمال کرنے میں ہچکچانے لگی۔ قانون میں یہ گنجائش رکھی گئی تھی کہ اِن قوانین کا نفاذ کسی خاص علاقہ میں اُسی وقت ہوگا جب حکومت ایک اعلان شائع کر کے ایسے نفاذ کا حکم دے دے گی۔ حکومت بالعموم ایسا اعلان کرنے پر آمادہ نہ ہوتی تھی۔ جب اعلان کے بعد قانون نافذ کر بھی دیا جاتا، پھر بھی ذمّہ دار افسروں کو اِس قانون کے ماتحت اختیارات استعمال کرنے کی اجازت تب تک نہ ملتی تھی جب تک حکومت سے خاص ہدایات وصول نہ کر لی جائیں۔ یہ خاص ہدایات جن اصولوں کے مطابق دی جاتی تھیں، اُن کا کسی کو یقینی علم نہ تھا۔

حکومت اب کمزور ہو چکی تھی

سچی بات یہ ہے کہ حکومت اب بہت کمزور ہو چکی تھی۔ حکومت کے اعلیٰ ترین حلقوں میں اختلافِ رائے پایا جاتا تھا۔ مجلسِ انتظامیہ کے اراکین کو اُن کی آزادیٔ رائے کا وصف مدِّنظر رکھ کر نامزد نہ کیا جاتا تھا۔ وائسرائے اُن کی رائے کی کچھ پروا نہ کرتا تھا۔ ایسے لوگ ہمیشہ اور ہر جگہ پائے جاتے ہیں جو

کچھ نہ کرنے کا مشورہ دیا کرتے ہیں۔ کچھ نہ کرنے میں فائدہ بھی نظر آتا ہے: "لوگوں کو وہم کا دورہ ہو گیا ہے جو جلد ہی ختم ہو جائے گا۔۔۔ جمہور جس بدمزاجی کا اظہار کر رہے ہیں وہ عارضی ہے۔ ہمیں دشمنی پیدا نہیں کرنی چاہیئے۔ ہمیں کسی ایسی شورش کا موقعہ نہ دینا چاہیئے جو سارے ملک میں پھیل جائے، یا جس سے مجالسِ قانون ساز میں مخالفت شروع ہو جائے۔ برطانیہ اور برطانوی مدبّرین کے سامنے ہماری ذمہّ داری کا تقاضا ہے کہ نئے آئین کو کم از کم بظاہر کامیاب دکھایا جائے۔" جب کبھی کچھ نہ کرنے کی پالیسی پر عمل کیا جائے تو ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ "میرا زمانہ تو عافیّت سے کٹ جائے گا۔ مجھے ذرا چند سال آرام کر لینے دو۔ اگر میں سختی کروں گا تو لوگ مجھ سے متنفّر ہو جائیں گے، اور حکومت میری قدر نہ کرے گی۔ اگر میں نرمی دکھاؤں گا، تو میری اتنی تعریف ہو گی جتنی مجھے ضرورت ہے۔ میری بابت کہا جائے گا کہ وہ ایک ہمدرد اور مدبّر حکمران تھا۔ کون جانتا ہے کہ نرمی سے فائدہ زیادہ ہوتا ہے یا نقصان۔ میری کونسل میری تائید پر آمادہ ہے۔ اگر نتیجہ بُرا نکلا تو سارا الزام میرے سر پر نہیں آ سکتا۔"

اس پالیسی کا وہی نتیجہ نکلا جس کی توقع ہو سکتی تھی۔ لوگوں کو مشتعل کرنے کے لئے کافی کارروائی کی گئی، لیکن شورش کو سختی سے دبانے کے لئے جس تشدد کی ضرورت تھی وہ نہ برتا گیا۔ جس بدقسمت شورش پھیلانے والے کو سزا مل جاتی تھی، وہ سمجھتا تھا کہ اُس کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کئی اُس سے بدتر شورش پھیلانے والے بغیر کسی سزا کے اینڈتے پھرتے ہیں۔ سزا یافتہ شورش پھیلانے والے کو یہ بھی یقین ہوتا تھا کہ اُسے شہید قرار دے کر اُس کی تعریفوں کے پل باندھے جائیں گے، اور باغیوں کی ٹولیاں اُس پر واہ واہ کے دونگرے برسائیں گی۔ جن شورش پھیلانے والوں کو سزا نہ ملتی تھی، وہ سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ ہم سے ڈرتی ہے۔ اِس لئے اُن کو اور بھی شورش پھیلانے کا حوصلہ ہوتا تھا۔ یہ خیالات عوام میں پھیل گئے، اور لوگوں نے سمجھنا شروع کیا کہ سرکار بیچاری تو دو تین دن کی مہمان ہے۔ ہندوستان میں چڑھتے سورج کی پرستش جس جوش سے کی جاتی ہے، شاید دنیا کے کسی ملک میں نہ کی جاتی ہوگی۔ نہ ہی کسی اور ملک میں عوام شکست کھانے والوں کو ایسی بیدردی سے بھول جاتے ہوں گے۔ جو حکومت اپنے

دشمنوں کو سزا نہ دے اور اپنے دوستوں کو انعام دینے کے ناقابل ہو، اُس کی دنیا میں کہیں عزّت نہیں کی جاتی۔ ہندوستان میں جب گورنمنٹ کی یہ حالت ہو گئی، تو سرکاری اقتدار ختم ہونے لگا۔

ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ اگر پہلی جنگِ عظیم نہ چھڑ جاتی تو ملک میں ضرور انقلاب رونما ہو جاتا۔

حکومتِ ہند کی افواج کمزور ہو گئیں

ہندوستان جنگ میں حصّہ لینے کے لئے کچھ اچھّی حالت میں نہ تھا۔ جس ملک کی حکومت کا انتظامی شعبہ مفلوج ہو چکا ہو وہ کبھی جنگ لڑنے کے لئے اچھی حالت میں نہیں ہوتا۔ فوج کے ساتھ بھی سخت بے تدبیری کا سلوک کیا گیا تھا۔ وہ زبردست سپہ سالارِ اعظم جس نے دیوانی حکومت کو پاؤں تلے کچل دیا تھا اب ملک سے رخصت ہو چکا تھا۔ اپنے دورِ اقتدار میں اُس نے فوج کا تمام نظم و نسق سپہ سالارِ اعظم کی ذات کے ماتحت مرکوز کر دیا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد دیوانی حکومت نے اپنا انتقام لینے کا موقعہ پایا۔ حکومت کی اعلیٰ ترین مجلس میں اب فوج کو وائسرائے اور سپہ سالارِ اعظم دونوں کے ووٹ حاصل ہونے کے بجائے صرف سپہ سالارِ اعظم کا ووٹ

حاصل تھا۔ جو شخص اپنے اس تنہا ووٹ میں ایک ہزار ووٹ
سے زیادہ اثر پیدا کر سکتا تھا، اب موقعہ پر موجود نہ تھا۔ سپہ سالار
اعظم اور وائسرائے کی بدمزگی کی سابقہ مثال کے پیشِ نظر، اب
ایسا سپہ سالار مقرر ہوا جس میں اور بہت ساری خوبیاں
تھیں، لیکن سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دیوانی حکومت
کے اشارۂ ابرو پر رقص کرتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فوج کے مطالبات
سے بے توجہی برتی جانے لگی، اور فوج میں بے چینی پھیل گئی۔
مزید بریں جدید آئینی اصلاحات کے نفاذ پر حکومت کا خرچ
بہت زیادہ ہو رہا تھا۔ نئے ٹیکس لگانے خلافِ مصلحت
تھے۔ دلّی کا نیا پایۂ تخت ایک شاندار یادگار کی صورت میں
تعمیر ہو رہا تھا۔ اِس شہر کی تعمیر پر پچاس فوجی رسالوں کے خرچ
کے برابر رقم صرف ہو گئی۔ کفایت کی ضرورت تھی، اور کفایت
کی آسان ترین صورت یہ تھی کہ فوجوں کی تعداد میں تو کمی نہ کی جائے
(کیونکہ اِس سے شور مچ جائے گا) البتہ سامانِ حرب کے ذخائر
میں کمی کر دی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ جب پہلی عالمگیر جنگ چھڑی
تو ہندوستان کسی معمولی مہم کی خاطر تھوڑی سی فوج بھی محاذِ
جنگ پر بھیجنے کے ناقابل تھا۔ جنگ چھڑ بھی گئی تو وزیرِ خزانہ

سامانِ حرب کی کمی پوری کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب وائسرائے اور اُس کے رفقائے کار کو مجبوراً لڑائی کرنی پڑی تو ایسی خوفناک غلطیاں سرزد ہوئیں، جن سے تمام سلطنتِ برطانیہ کا وجود خطرہ میں پڑ گیا۔ اِس کے بعد وائسرائے اور اُس کے رفقائے کار کو معزول کرنے کی نوبت آئی۔ سارا الزام وزیرِ ہند اور حکومتِ ہند کے سر پر آگیا، حالانکہ وزیرِ ہند بے قصور تھا اور حکومتِ ہند نے اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی سے زیادہ کوئی جرم نہ کیا تھا۔

پہلی جنگِ عظیم

حکومتِ ہند کی ہچکچاہٹ کے باوجود ہندوستان کو جنگ میں حصّہ لینا ہی پڑا۔ اگرچہ حکومتِ ہند کو اب کسی خاص میدانِ جنگ کی ذمہ داری سپرد نہ تھی، پھر بھی ہندوستانی افواج نے ہر محاذِ جنگ پر لڑائی میں حصّہ لیا۔ ہندوستان کے عسکری مزدوروں نے بھی ہر محاذِ جنگ پر کارہائے نمایاں دکھائے۔ بعض ضروری اقسام کا گولہ بارود تیار کرنے میں ہندوستان بہت مفید ثابت ہوا۔ اخراجاتِ جنگ میں ہندوستان نے دس کروڑ اشرفی کا خرچ برداشت کیا،

لیکن یہ رقم کچھ خوش دلی سے ادا نہ کی گئی، اگرچہ اس رقم میں کئی افراد کے رضاکارانہ عطیات بھی شامل تھے۔

ہندوستان کے اندر رہنے والے انگریزوں نے جنگ میں کوئی غیر معمولی دلچسپی ظاہر نہ کی، کیونکہ جنگ اُن سے بہت دور تھی۔ علاوہ اس کے یورپین لوگوں کے لئے سپاہی اور جنگ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہر یورپین کسی حد تک بجائے خود ایک سپاہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان میں رہنے والے فرنگی جنگ کے متعلق وہ مریضانہ اور قابلِ اعتراض جوش و خروش ظاہر نہ کرتے تھے، جو انگلستان کے بعض طبقات میں پھیل چکا تھا۔ ہندوستان میں رہنے والے فرنگی اُن واقعات میں کیا دلچسپی لے سکتے تھے جو یا تو جان بوجھ کر اُن سے چھپائے جاتے تھے، اور یا اُن کی اطلاع مختصر سرکاری اعلانات اور بناوٹی تاروں کے ذریعہ پہنچتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان میں رہنے والے فرنگیوں کو انگلستان سے بیوفائی کا ملزم گردانا گیا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جب طالع آزما لوگوں کے لئے دنیا کی ہر ترقّی کا راستہ کھلا ہوا تھا، اُس وقت اپنے بے لطف فرائض منصبی ادا کرنا بجائے خود ایک بڑی قومی خدمت تھی۔ جب شکست پر شکست ہو رہی تھی تو چہرے کو بشّاشش

رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جو لوگ انگریز افسروں کے چہرہ کا معائنہ کر کے، اور بڑے شوق سے سوالات کر کے، یہ پتہ چلانا چاہتے تھے کہ برطانوی سلطنت کا خاتمہ کب ہوگا، اُن کے کینہ ورتجسّس کے سامنے ڈٹے رہنا کچھ مخول نہ تھا۔ جب یہ نظر آتا تھا کہ شاید دیوتا بھی برطانیہ کے خلاف جنگ میں شریک ہو چکے ہیں، اُس وقت نہ صرف منہ سے کامیابی کی اُمید دلانا، بلکہ دل میں بھی آخری فتح کا یقین رکھنا ذرا دل گردہ کا کام تھا۔

ہندوستانیوں نے اِس موقعہ پر وہی رویّہ اختیار کیا جس کی اُن کی ذات سے توقّع ہو سکتی تھی۔ سیاسی مزاج رکھنے والے ہندوستانیوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی شورش بند نہ کی۔ جوں جوں جنگ میں برطانیہ کا پانسہ کمزور نظر آتا تھا، توں توں یہ شورش بھی زیادہ شدید صورت اختیار کرتی جاتی تھی۔ اعتدال پسند منہ سے وفاداری کا اقرار کرتے تھے، لیکن عمل سے انتہا پسندوں کے ہاتھ میں کھیل جاتے تھے۔ سرکاری افسروں کا فرض یہ رہ گیا تھا کہ ہندوستانیوں کی باغیانہ حرکات کو گھٹا کر بیان کریں، یا بالکل معاف کر دیں، حالانکہ کسی جمہوری حکومت کے ماتحت ایسی حرکتیں کی جاتیں تو مجرم کو گولی سے اڑا دیا جاتا، یا جیل میں بند کر دیا جاتا۔ خود برطانیہ

میں بھی ایسی حرکتیں برداشت نہ کی جاتیں۔ جب ایک نامصلحت شناس افسر نے اسمبلی میں حقیقتِ حال کا بھانڈا پھوڑ دیا تو چاروں جانب بدحواسی کے مظاہرے ہونے لگے۔

جنگ کا اثر ہندوستان پر

ترکی کے خلاف جنگ سے مسلمانوں پہ بُرا اثر ہوا۔ اکثر مسلمانوں نے بھی اب ہندوؤں کی طرح شورش پھیلانی شروع کر دی، بلکہ بعض پہلوؤں سے تو مسلمانوں کی شورش زیادہ خطرناک تھی

اگر باغیوں کی بعض جماعتوں کے پاس دشمن سے روپیہ پہنچ رہا تھا، تو اس میں تعجّب کی کوئی بات نہیں۔ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں نے اپنی آمدنی کے ذرائع کبھی وضاحت سے بیان نہ کئے تھے۔ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کا اُصول ہے کہ حساب کی جانچ پڑتال ایک فضول سی شئے ہے۔ کانگرس کے ابتدائی ایام سے قیافہ آرائیاں ہو رہی تھیں کہ اِس کو روپیہ کہاں سے ملتا ہے۔ حکومت کے خلاف جو پارٹیاں کھڑی کی گئیں، اُن کے رسمی عہدے دار تو کبھی باہر سے آنے والے روپے کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ اِن پارٹیوں نے بغاوت اور نسلی منافرت کے پراپیگنڈے پر جو بڑی بڑی رقمیں خرچ کیں وہ جائز ذرائع ہی سے جمع کی گئی تھیں۔ البتہ

یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اِن پارٹیوں کے ہر ممبر کی آمدنی کے ذرائع بھی شک و شبہ سے بالاتر تھے۔

ہندوستان کے نواب راجے جنگ کے دوران میں گورنمنٹ کی حمایت پر متحد ہو کر باہر نکل آئے۔ کچھ ریاستوں کے حکمرانوں نے فوجی اسٹاف کے ساتھ مل کر بھی کام کیا۔ اور اپنی رعایا کا مال و جان تو سب نے بے دریغ سرکار کی حمایت میں خرچ کیا۔

کارخانہ داروں اور تاجروں کے لئے جنگ ایک آسمانی نعمت تھی۔ کارخانہ داروں اور ٹھیکیداروں نے بے اندازہ نفع کمایا۔ اِن لوگوں پر معمولی سا دباؤ ڈال کر اُن کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے نفع کا کچھ حصہ سود بخش جنگی قرضوں میں لگا دیں۔ دوسرے ملکوں کے ٹھیکیداروں اور کارخانہ داروں سے ایسا اچھا سلوک نہیں ہوا۔ بعض کو جنگی غدّاری کا مجرم ٹھہرایا گیا، اور بعض کو غیر ملکی حاکموں نے باغی قرار دے کر گولی سے بھی اڑا دیا۔

افواجِ ہندوستان

افواجِ ہندوستان میں بے اندازہ اضافہ ہو گیا۔ جنگجو قبائل سے تعلّق رکھنے والے ہندوستانی کاشتکاروں کو کسی ایسی فوجی ملازمت پر اعتراض نہیں جہاں بھاری تنخواہ ملے، اور پُر لطف

زندگی بسر کرنے کا موقعہ میسر ہو۔ چنانچہ اہلِ ہندوستان اُمڈ اُمڈ
کر بھرتی ہوئے۔ فوج میں بھرتی کا محکمہ بڑا وسیع تھا، اور اُس
نے عجیب عجیب قسم کے فوجی بھرتی کئے۔ تجربہ سے ثابت ہوا کہ
کئی نسلیں جن کو آج تک فوجی لحاظ سے ناکارہ سمجھا جاتا تھا،
بڑے اچھے سپاہی مہیّا کر سکتی ہیں۔ ایسی نسلوں کو فوج میں
بھرتی کرنے کے لئے جو دباؤ ڈالا گیا، اُس میں اور جبری بھرتی
میں تھوڑا ہی فرق تھا۔ افواجِ ہندوستان کی تعداد کاغذی حساب
کے لحاظ سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ یوں کہ عسکری فہرستوں
میں بعض فوجی زاویۂ نگاہ سے ناکارہ رسالے بھی شامل کر لئے گئے۔
اِس کا نتیجہ وہی نکلا جس کی توقع ہو سکتی تھی۔ بعض رجمنٹیں تو دنیا کے
بہترین سپاہیوں پر مشتمل تھیں۔ اِن رجمنٹوں نے بڑے سے
بڑے موقعہ پر گھمسان کے رن میں دادِ شجاعت دی۔ بعض رجمنٹوں
نے مناسب لیڈرشپ کی مدد سے محدود حلقوں میں اچھّا کام
کر کے دکھایا۔ کئی دوسری رجمنٹیں، پولیس کا کام کرنے، یا عام آمد و
رفت کے وسائل کی حفاظت کے لئے موزوں ثابت ہوئیں۔
بعض دوسری رجمنٹیں ایسی بھی تھیں کہ وہ جس فوج میں شامل ہوتیں
اُس کے لئے خطرہ تھیں۔ بعض رجمنٹیں حکومت سے وفادار نہ

تھیں۔ مختصر یہ کہ جنگ کے دوران میں ہندوستان نے برطانیہ کی جو مدد کی، اُس میں کوئی ایسی نادر بات نہ تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ ہندوستان کے بعض علاقوں کے کاشتکار بڑے اچھے سپاہی ثابت ہوتے ہیں، بشرطیکہ اُن کے ساتھ ٹھیک طرح سلوک کیا جائے، اور اُن کی کمان ایسے انگریز افسروں کے سپرد ہو، جن پر اُن کو پورا پورا اعتماد ہو۔ بلاشبہ برطانوی سلطنت کو اِن سپاہیوں، اُن کے رشتہ داروں، اور اُن نسلوں کا ممنون ہونا چاہیئے تھا، جن سے یہ سپاہی بھرتی کئے گئے تھے۔ شاید یہ طبقات انعام کے بھی مستحق تھے۔ اُن کو کیا انعام دیا گیا، اِس کا ذکر ہم ابھی کریں گے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض وسیع صوبوں اور کثیر التعداد نسلوں نے ایک رنگروٹ بھی فوج میں نہ دیا تھا۔ نہ ہی انہوں نے ایک پائی اُس رقم سے زیادہ دی تھی، جو بذریعہ ٹیکس اُن سے وصول کی جاتی تھی۔ باوجود اِس کے جب جنگی خدمات کا تذکرہ ہوتا تھا، تو "ہندوستان" کا ایک لایعنی لفظ استعمال کر کے بنگالی، گجراتی، مارواڑی، برہمن، پنجابی مسلمان، راجپوت اور پارسی، سب کو ایک ہی لاٹھی ہانکا جاتا تھا۔ لطف تو یہ ہے کہ سارے "ہندوستان"

کو گورکھوں کی دلیری اور پٹھانوں کی ہمّت بھی منسوب کر دی جاتی تھی۔

حقِّ خود ارادیّت

آئندہ ترقی کے لئے جو تجویزیں منظور ہوئیں اُن کے مصنّف برطانوی مدبّر کی نسبت کوئی رائے ظاہر کرنا، اِس کتاب کے اسلوبِ بیان کے مطابق نہیں۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اِس مدبّر کی نیّت بالکل صاف اور بے غرض تھی۔ جن طریقوں سے اہلِ برطانیہ کو ہندوستان میں آئینی اصلاحات کا حامی بنایا گیا، اُن پر نکتہ چینی کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اصلاحات کی آئندہ قسط کا فیصلہ بڑی تحقیق اور پوری سوچ بچار کے بعد کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں اصلاحات کے لئے مناسب فضا پیدا کرنے کی خاطر بدامنی کو برداشت کرنے کی غلطی نہ کی گئی۔ نہ ہی انگلستان میں کوئی جھوٹے سرکاری اعلانات چھاپے گئے۔ نہ ہی اخبارات کو گمراہ کیا گیا۔ برطانیہ میں ایک عام خیال پیدا ہو گیا تھا کہ "ہندوستان" بڑا وفادار ہے، اور ہندوستان میں بےچینی پھیلی ہوئی ہے"۔ وفاداری کا صلہ دینا بڑی اچھّی بات ہے، اور وفاداری کا اِس سے اچھّا صلہ اور

کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اسباب دور کر دیئے جائیں جن سے بے چینی پھیل رہی ہو۔ جنگ کا مقصد یہی تھا کہ دنیا میں جمہوریت کی حفاظت کی جائے، اور اقوام عالم کو "حق خود ارادیت" مل جائے۔ ظاہر ہے کہ اِن حالات میں ہندوستان کی شکایات رفع کرنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ ہندوستان کو بھی جمہوری حکومت بخش دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اہل ہندوستان بھی حق خود ارادیت کا استعمال کر سکیں گے۔ چونکہ تمام جمہوری حکومتیں عاقبت اندیش ہوتی ہیں، اور چونکہ عاقبت اندیشی کا تقاضا ہے کہ برطانیہ کی اطاعت سے منہ نہ موڑا جائے اِس لئے ہندوستان کو جمہوری حکومت بخشنے کا مطلب یہ ہوگا کہ برطانیہ سے ہندوستان کا رشتہ پہلے کی نسبت زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔ میں اِس جگہ جدید آئینی اصلاحات کا کوئی مفصّل تذکرہ نہ کروں گا۔ آئین بنانا ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ اِس دلچسپ مشغلہ میں کئی ذہین لوگ مہینوں مصروف رہے۔ پھر بھی آج تک کوئی آئین اپنے مصنفوں کے حسب منشاء کام نہیں چلا سکا، اور چونکہ ایک آئین تبھی کارگر ہوتا ہے، جب وہ طبعی طور پر کچھ ایسے رسوم و رواج اور اداروں سے نشو و نما

پا کر تیار ہو، جو پہلے سے موجود ہوں، اس لئے ایک کاغذی آئین اس سے زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتا کہ آئندہ نشو و نما کا نقطۂ آغاز ثابت ہو۔

اِن حالات میں آئین بنانے والوں کی نیت کیا تھی، یہ سوال شاید آثارِ قدیمہ کے ماہرین کے لئے تو کوئی دلچسپی رکھتا ہو، لیکن اس سوال کی کوئی تاریخی اہمیت نہیں۔ آئین کیا ہے یہ بالکل غیر اہم سوال ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ اِس آئین کے ماتحت ملک پر حکومت کیسی ہو رہی ہے۔ اِس سوال کا جواب آئندہ باب میں پیش کیا جائے گا۔

باب ہشتم

نزع

عیسائی قومیں ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہی تھیں

جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے ہمیشہ سے زیادہ دانائی کی ضرورت تھی۔ چھ سال تک سیاسی مزاج رکھنے والے ہندوستانی دیکھتے آئے تھے کہ یورپ کی قومیں ایک دوسرے کا گلا گھونٹ رہی ہیں۔ عیسائیت، عیسائی اقوام کو بدترین خانہ جنگی سے باز رکھنے میں ناکام رہی تھی۔ عیسائیت نے اگر کوئی خدمت سرانجام دی تھی تو یہ کہ جب اِس جہنّمی جنگ میں فوجیں ایک دوسرے پر حملہ کرتی تھیں تو اُن کے لبوں پر عیسائیت کے نعرہ ہائے جنگ اور عیسائی مذہب کی

دعائیں ہوتی تھیں۔ وہ سب وعدے جھوٹ اور بکواس ثابت ہو چکے تھے کہ مغربی تہذیب امن اور ترقی کی علمبردار ہے۔ آج بھی دنیا اُسی ضرب المثل پر عمل پیرا ہے کہ جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس۔ جس کے پاس لشکر زیادہ ہوگا، وہی دنیا پر حکومت کرے گا۔ تہذیب و تمدّن کا منصب صرف یہ ہے کہ زبردست افواج کے آقا کو مادی اور روحانی لحاظ سے زیادہ مہلک اسلحہ مہیّا کریں، اُس سے بھی زیادہ مہلک اسلحہ جو ہلاکو اور نپولین کو میسّر تھے۔ اتحادی جنگ کے دوران میں بڑے بڑے بلند اخلاقی اصولوں کا وظیفہ پڑھتے رہے تھے، لیکن جوں ہی فتح حاصل ہو گئی تو وہ اُن تمام اصولوں کو فراموش کر بیٹھے اور اُنہیں صرف ایک اصول یاد رہا کہ مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے۔ پھر اِس میں تعجّب کی کیا بات ہے کہ اہلِ ہندوستان جنہیں مدّت سے مغربی تہذیب کی قدر و قیمت کے متعلق شکوک و شبہات تھے، اب پختہ یقین کرنے لگے کہ یہ تہذیب اندر سے بالکل کھوکھلی ہے۔ آخر اہلِ مغرب کو کیا حق ہے کہ وہ مشرقی ممالک کے چوہدری بنے رہیں؟ اُن کی چودھراہٹ بس ڈنڈے ہی کے زور سے تو قائم ہے نا! اور اب اُن

کا ڈنڈا بھی تو اُن کے ہاتھ سے پھسل رہا ہے !!-

پہلی عالمگیر جنگ دوسری جنگِ عظیم کا پیش خیمہ تھی

یہ تو صاف نظر آ رہا تھا کہ جنگ درحقیقت ختم نہیں ہوئی، بلکہ عارضی طور پر بند ہوئی ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد جو صلحنامے تیار ہوئے اُن کا کوئی تصفیہ باقی رہنے والا نہ تھا۔ سخت باہمی منافرت کے باعث یورپ کی اقوام میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ ہاں ایک مسئلہ پر یورپ کی سب قومیں متفق تھیں، اور وہ یہ کہ اُن سب کو انگلستان سے یکساں دشمنی تھی۔ اِس دشمنی سے بچنے کے لئے انگلستان کے پاس کون سی زرہ تھی؟ ہندوستانی چونکہ خود قومیت کے جذبہ سے محروم تھے، اس لئے وہ نہ جانتے تھے کہ وطن پرستی کا روحانی جذبہ کتنی بڑی طاقت ہے۔ ہندوستانیوں کو کیا پتہ کہ اگرچہ انگلستان میں قوم سے اُلفت کی آگ فرانس کی طرح شعلہ بار نہ تھی، اور اندر ہی اندر سلگ رہی تھی، لیکن اُس کی گرمی دنیا کے کسی تندور سے کم نہ تھی۔ پہلی جنگِ عظیم میں اہلِ برطانیہ بڑی ہمّت دکھا چکے تھے، اگرچہ برطانیہ کی طاقت ٹھیک طرح منظّم نہ ہوسکی تھی، اور بارہا اس کا استعمال بھی غلط ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انگلستان وہ

کارنامے نہ دکھا سکا تھا جو وہ درحقیقت کر سکتا تھا۔ جنگ کے کئی محاذات پر ہندوستانی فوجیں حصّہ لے چکی تھیں۔ اہل ہندوستان ۱۹۱۵ء میں فلانڈرز کی ہولناک لڑائی، گیلی پولی کی شاندار پسپائی، اور عراق کے شرمناک واقعات کو خاص طور پر یاد رکھتے تھے۔ زمانۂ جنگ کے پراپیگنڈا نے ہندوستان کو یقین دلا دیا تھا کہ برطانوی سلطنت، ہندوستانی خزانے اور اہلِ ہندوستان کی شجاعت سے ہی جنگ کے بعد بھی بچ گئی ہے۔ ان حالات میں جن لوگوں کو "ہندوستان" کی ترجمانی کا دعویٰ تھا، بھلا وہ اپنی منہ مانگی شرائط سے کس طرح ٹل سکتے تھے؟۔

اُدھر یورپ میں مزدوروں اور کسانوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اللہ نے طاقتوروں کو نیچا دکھا کر ضعیفوں اور عاجزوں کے مرتبے بلند کر دیئے تھے۔ فاتحین نے اعلان کر دیا تھا کہ آئندہ یورپ میں کوئی ایسی زبردست حکومت قائم نہ ہونے دی جائے گی جو فرانس کے غلبہ کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو سکے۔ تمام مشرقی یورپ کو بلقان کی طرح چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہ تمام بلند پایہ چالبازیاں "حرّیت" اور "خود اختیاریّت" کے نام پر کی جا رہی تھیں۔ "حقِ خود ارادیّت"

ایک نیا دیوتا تھا، جس کا بت حال ہی میں یورپ کے مندروں کے اندر لا کر رکھا گیا تھا۔ کیا ہندوستان کی ترجمانی کے مدّعی حریت اور خود اختیاریّت کے مستحق نہ تھے؟

یورپ کا کچومر نکل چکا تھا

یورپ اور خاص طور پر برطانیہ جنگ سے تنگ آچکا تھا۔ اتنی انمول جوانیاں رائگاں گئی تھیں، اس قدر مشقّتیں بے نتیجہ رہیں، کہ دل ٹوٹ چکے تھے۔ سارا یورپ: غصّہ، تباہی، پاگل پن، مایوسی اور قہرِ درویش برجانِ درویش کے جذبات سے اُبل رہا تھا۔ مشرق میں بالشوزم کا خوفناک بھوت صورت پذیر ہو رہا تھا۔ یورپ کی پریشان حال قومیں اس بھوت کا سایہ دیکھ کر تھرتھرا رہی تھیں۔ عیسائی اقوام نے باہمی جنگ کے دوران میں عجیب و غریب اتحادیوں سے ناطے جوڑ رکھّے تھے۔ شمالی افریقہ کے بربری سوار اور لنکا کی فوجیں دریائے رائن کے کنارے لڑتی رہی تھیں۔ اب کیا وجہ تھی کہ چین اور لٹویا سے لینن کے سپاہی دریائے ایلبے کے کنارے آکر اپنے جوہر نہ دکھاتے؟

ایک طرف تو یوں یورپ کا کچومر نکل چکا تھا، اور ہمّت ٹوٹ چکی تھی، دوسری طرف مشرق نے کس بَل دکھانا شروع کر دیا تھا۔

نسل کے مقابلہ میں نسل، مذہب کے مقابلہ میں مذہب، پگڑی باندھنے والے ہیٹ پہننے والوں کے مقابلہ میں، نقاب اوڑھنے والیاں ووٹ ڈالنے والیوں کے مقابلہ میں، غرض دونوں فریق اپنی اپنی صفیں آراستہ کر رہے تھے۔ کیا تمام مشرقی ممالک سے قطع تعلّق کر کے صرف ہندوستان ہی اس لشکر آرائی میں حصّہ نہ لیتا؟۔

جنگ ختم ہونے پر ہندوستان میں ایک تزلزل رونما ہوا

اگر حالات اس سے مختلف ہوتے، تب بھی جنگ کے بعد ہندوستان میں ایک تزلزل ضرور رونما ہونا تھا، لیکن اب تو ایسے خاص حالات موجود تھے، جن کے باعث ملک میں شورش پھیل رہی تھی۔ کئی سال سے قحط پڑ رہا تھا۔ ضروریاتِ زندگی گراں ہو چکی تھیں۔ تجارت نے جنگ کے دوران میں قمار بازی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جس دن جنگ بند ہوئی، اُسی روز کئی سوداگروں کا دیوالہ نکل گیا، اور نقصان تو بہتوں نے اُٹھایا۔ ایک نئی وبا پھیلی، اور اُس نے چند ہفتوں میں اتنے لوگ مار ڈالے جو سارے جنگ کے دوران میں دنیا بھر کی قوموں کے اندر قتل نہ ہوئے تھے۔ اسی دوران میں افغانستان کے ساتھ ایک

جنگ ہوئی۔ شاہی فوجوں نے افغان حملہ آوروں کو بآسانی شکست دے دی، لیکن حکومتِ ہند پر ایسا ضعف طاری تھا کہ وہ حملہ آوروں کو عبرتناک شکست دے کر آئندہ کے لئے سبق سکھانے کے ناقابل تھی۔ طویل گفت و شنید اور عاجزانہ خوشامد کے بعد شکست خوردہ افغانستان کے ساتھ ایک شرمناک معاہدہ کر لیا گیا۔

تجویز تو یہ تھی کہ اُدھر سے افغانستان حملہ کرے گا، اور اِدھر ہندوستان میں بغاوت رونما ہو جائے گی۔ لیکن ہوا یہ کہ دو صوبوں میں قبل از وقت بغاوت پھوٹ پڑی۔ ایک صوبہ کا تو جنگ کے بوجھ نے بُرا حال کر رکھا تھا۔ دوسرے صوبہ میں جنگ نے کوئی اثر پیدا نہ کیا تھا۔ مقامی افسروں نے دونوں صوبوں کے اندر یہ بغاوت بڑی سختی سے کچل دی۔ پنجاب میں بلوائیوں کی بڑی تعداد گولیاں کھا کر ہلاک ہو گئی۔ اُس کے بعد بغاوت کے قائدین کو معاف کر کے انعامات بخشے گئے۔ مقامی افسروں کی یا تو مذمت کی گئی، اور یا اُن سے لاپرواہی برتی گئی۔

تحفظِ حرمینِ شریفین

ترکی کے ساتھ لڑائی کے باعث مسلمانوں میں بڑی بے چینی

پھیلی ہوئی تھی۔ انگریزوں نے عربوں کے ساتھ جو وعدے کر رکھے تھے، انگریزوں نے فرانس سے جو وعدے کر رکھے تھے، انگریزوں نے مسلمانوں سے جو وعدے کر رکھے تھے، انگریزوں نے یونانیوں سے جو وعدے کر رکھے تھے، اِن سب وعدوں کی معجون مرکّب کا کوئی لقمہ میں آپ کو یہاں کھلانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ترکی کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، مسلمان اُس سے راضی نہ تھے۔ حجاز اور عراق میں جو نئی ریاستیں قائم کر دی گئی تھیں اُن کے متعلق مسلمانوں کا خیال تھا کہ کافروں کے ہاتھ بکی ہوئی ہیں۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ ترکوں کے علاقہ میں یونانیوں کی سلطنت قائم کروانا، کس طرح "حق خود ارادیت" کی تعمیل کہلا سکتا ہے۔ اُنہیں خیال ہو رہا تھا کہ اُن کے ساتھ فریب کیا گیا ہے۔ اُنہیں چکمہ دیا گیا ہے، اور اُن سے غداری کی گئی ہے۔ خلافت کی تحریک شدید تر اور کھلے بندوں باغیانہ بنتی گئی۔ حکومتِ ہند اور حکومتِ برطانیہ کے بعض مقتدر ارکان خلافت کی تحریک سے خفیہ ہمدردی رکھتے تھے: ترکی سلطنت کے کھنڈروں کی بندر بانٹ پر گِدھوں کا جھگڑا ہو رہا تھا۔ مدبّرین اور سرمایہ داری کی باہمی سازشوں میں "ہندوستان کی رائے عامہ"

ایک مفید حربہ ثابت ہو سکتی تھی۔

"ماتا" کے پجاریوں کو اب ایک "پتا" میسّر آگیا

ہندو اب "ماتا" کی پرستش چھوڑ کر، گاندھی کی پوجا اختیار کر رہے تھے۔ گاندھی ایک گجراتی بنیا تھا جس نے بیرسٹری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ سب سے پہلے اُس نے جنوبی افریقہ میں شہرت حاصل کی۔ جنوبی افریقہ میں جو ہندوستانی آباد کار رہتے تھے، اُن پر افریقہ کے گورے باشندے اِس لئے سختیاں کرتے تھے کہ افریقہ میں کالے باشندوں کی تعداد غالب نہ آجائے۔ گاندھی نے اِن سختیوں کے خلاف جدوجہد میں ہندوستانی آبادکاروں کی رہنمائی کی۔ جنوبی افریقہ میں مسلح بغاوت یا بغاوت کی دھمکی مضحکہ خیز ہوتی، کیونکہ آبادکاروں کی تعداد قلیل تھی، اور وہ جنگجو لوگ نہ تھے۔ اِس وجہ سے گاندھی نے "عدم تشدد" اور "عدم تعاون" کا سبق پڑھایا۔ اِس پالیسی سے کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ انجامِ کار مصالحت ہوگئی جس کی رو سے آبادکاروں کے سابقہ حقوق بحال کر دیئے گئے۔ گاندھی کو زعم تھا کہ روحانی طاقت جسمانی طاقت سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ گاندھی نے جب طالسطائے کا مطالعہ کیا اور اُس کے مقلّدین سے روابط قائم کئے تو گاندھی کا یہ عقیدہ اور بھی زیادہ

مضبوط ہوگیا۔

گاندھی بذاتِ خود ایک رشی تھا۔ وہ پرہیزگار تھا، تارک تھا، اور نیک تھا۔ اُس میں کوئی دنیاوی حرص نہ تھی۔ نہ ہی اُسے روپے کمانے کا شوق تھا۔ ہندوستان کے عام انتہا پسند سیاسی مدبّرین کا حال یہ ہوتا ہے کہ موقعہ ملے تو سر پر سوار ہو جاتے ہیں، اور گستاخی سے بھی دریغ نہیں کرتے اور اگر یہ سمجھیں کہ مدِمقابل زبردست ہے تو اُس کے پاؤں پڑنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ برعکس اِس کے گاندھی ہمیشہ پابندِ اخلاق اور باوقار رہتا تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ اپنے سینہ میں سے خوف اور نفرت کے جذبات بالکل رفع کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ ہاں اُس میں ایک نقص ضرور تھا، اور یہ نقص بھی کچھ کم نہ تھا۔ وہ مغرور تھا، اور تحسینِ عوام کا مشتاق تھا۔

گاندھی کا فلسفہ

"گاندھی نے جو فلسفہ ایجاد کیا، اُس کا لُبِّ لباب حسبِ ذیل الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے:۔

تہذیبِ مغرب ابلیس کی چھایا ہے۔ ہمیں اس سے بچنا چاہیئے۔ آلاتِ تمدّن دراصل ابلیس کے اوزار ہیں۔ تہذیبِ نو

کی اقتصادی ترقیات بھی درحقیقت ابلیسیت کی مختلف شکلیں ہیں۔ لہٰذا اِن آلائشوں سے اپنا دامن پاک رکھو۔ مثال کے طور پر سوتی کپڑوں کے کارخانے ارواحِ بد کی اختراع ہیں۔ اِن میں تیار ہونے والا سوتی کپڑا بدی سے ملوّث ہے۔ ہاتھ کا بنایا ہوا کپڑا پہنو۔ ریلوے بھی ابلیس کی ایجاد ہے۔ (جہاں تک ہندوستان کی ریلوں کا تعلق ہے، ہم بھی گاندھی کے اِس مقولہ سے متفق ہیں) اس لئے پیدل سفر کرو۔

بنی آدم طبعًا نیک ہیں۔ انسانوں کو نیکی پر مجبور کرنے کے لئے کوئی نظام کھڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔ انسان کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ جلد ہی مکمّل انسان بن سکتا ہے۔ تہذیب و تمدن خود ہی جرائم کی تخلیق کرتے ہیں، اور خود ہی مجرموں کو سزا دیتے ہیں۔ جو مذہب خود ہی گناہگار پیدا کرتا ہے، اور پھر خود ہی گناہوں کی سزا دیتا ہے، وہ سچّا مذہب نہیں ہو سکتا۔ نظم و نسق کی دنیا میں بظاہر قوّت کا غلبہ، دراصل ایک دھوکہ پر مبنی ہے۔ جسمانی قوّت کچھ نہیں کر سکتی۔ روحانی قوّت سب کچھ کر سکتی ہے۔ حکومت برطانیہ ابلیسؔ کا خاص گماشتہ ہے۔ یہ اِس حکومتِ کے کارندوں کے پھیلائے ہوئے غلط خیالات کا نتیجہ ہے کہ

ہمارے ملک میں جا بجا کارخانے بن رہے ہیں، اور ریلوں کا جال پھیلتا جا رہا ہے۔ اس حکومت کی طفیل دستکار طبقہ اور بالخصوص کھڈیوں پر کام کرنے والے تباہ ہو رہے ہیں۔ غضب یہ ہے کہ بیل جیسے مقدّس جانور کو بھی آمد و رفت کے ادنیٰ امیغوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، حالانکہ اُسے تو ریلوے کا حریف سمجھنا چاہیئے تھا!

کسی حکومت کو ابلیسی حکومت ثابت کرنے کے لئے تشدّد کے استعمال کی شہادت کافی ہوتی ہے۔ چونکہ حکومتِ برطانیہ تشدّد پر قائم ہے، اِس لئے یہ خاص طور پر ابلیسی حکومت کہلانے کی سزاوار ہے۔ جیسا کہ مشہور ماہرِ آئین آسٹن نے کہا ہے، حکومتیں ہمیشہ تشدّد پر مبنی ہوتی ہیں۔ اِس وجہ سے افواج، پولیس، عدالتوں اور مجسٹریٹوں کا سارا انتظام ابلیسیت پر مبنی ہے۔ حکومت برطانیہ چونکہ ہندوستان کی قومی حکومت نہیں، بلکہ متشدّدانہ غضب کا نتیجہ ہے، اس لئے یہ خاص طور پر ایک ابلیسی حکومت ہے۔

کسی حکومت کا تشدّد سے مقابلہ جائز نہیں، اور حکومتِ برطانیہ کا تشدّد سے مقابلہ تو بالخصوص ناجائز ہے۔ جسمانی طاقت کا استعمال خلافِ قانون ہے۔ حکومت کو تشدّد کے زور سے نکالنے کی کوشش کی مثال ایسی ہے جیسے ابلیس سے نجات پانے کے لئے کسی آسیب

کو سر پر چڑھا لینا۔ حکومت کو تشدد سے شکست دے کر جو نظام قائم ہوگا وہ خود ابلیسی نظام ہوگا۔

ابلیس کا مقابلہ کرنے کے لئے انسان کو روحانی طاقت درکار ہے۔ اپنے دل کو پاک اور ذہن کو پرسکون رکھو۔ تشدد کا تصور بھی من میں نہ آنے دو۔ حکومت کی اطاعت سے انکار کر دو۔ کوئی ٹیکس ادا نہ کرو۔ کسی عدالت کے سامنے مت جاؤ۔ قانون شکنی نہ کرو۔ صرف قانون کے ساتھ تعاون کرنے سے باز رہو۔ پرہیزگار والدین اپنے بچوں کو ابلیسی مدرسوں میں نہ بھیجیں گے۔ اس اخلاقی جنگ میں لڑنے والے سپاہی اپنا یا اپنے بچوں کا لباس شیطانی کارخانوں میں تیار ہونے والے کپڑوں سے نہ بنائیں گے۔ وہ کھڈی کا بنا ہوا کھدر پہنیں گے۔

روحانی قوت کے اظہار کے سامنے حکومت بھی لاچار رہ جائے گی۔ شروع شروع میں وہ ضرور تم کو تکلیف پہنچائے گی۔ اگر تم ٹیکس ادا نہ کروگے تو وہ تمہاری جائداد قرق کرکے فروخت کر دے گی۔ اُسے ایسا کر لینے دو۔ حکومت روحانی سپاہیوں کے خلاف دل بھر کر اپنے ظالمانہ قانون استعمال کرے گی۔ اُسے ایسا کر لینے دو۔ حکومت کے سامنے کوئی ایسی فریاد نہ کرو جس سے اُس کو حکومت ماننا لازم آئے۔ اگر حکومت تمہیں جیل بھیجے تو جیل چلے جاؤ۔ تھوڑے ہی عرصہ میں روحانی ہتھیار فتح پائیں گے۔ حکومت ایسے لوگوں کو دکھ دے کر شرمندہ ہوگی جو اُس کے مقابلہ میں ہاتھ نہیں اُٹھاتے۔ تب حکومت

ابلیس کے ساتھ اپنا رشتہ منقطع کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس کے بعد جو حکومت باقی رہ جائے گی وہ ایک رضاکارانہ نظام ہوگا جس کا وجود اور فرائض کی ادائیگی دونوں عوام کی رضامندی کے مرہون ہوں گے۔ اگر حکومت ضد کرے اور بدی کے راستہ پر ہی چلتی رہے تو تم بھی مستقل مزاجی دکھاؤ۔ فتح تمہیں کو حاصل ہوگی۔ جب کسی حکومت کی رعایا اور اُس کا عملہ اُس کے احکام ماننے سے انکار کر دیں، تو ایسی حکومت زیادہ دیر قائم نہیں رہا کرتی۔ حکومت جلد ہی بے اثر ہو کر ختم ہو جائے گی۔

"ترکِ دنیا" تخریب پسندوں کا عقیدہ ہے

اِن اصولوں میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ روسّیو نے بھی ایسے ہی اصولوں کی تلقین کی تھی، اور روسّیو سے پہلے کئی دوسرے تخریب پسند فلسفی اِسی قسم کے اصولوں کا چرچا کر چکے تھے۔ اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام نے تخریب پسندی سے برّیت ظاہر کی، اور سینٹ پال نے تخریب پسندی کا مقابلہ کیا، پھر بھی ایک پہلو سے دیکھا جائے تو تخریب پسندی کا بیج خود عیسائیت میں بھی مضمر تھا۔ اِس قسم کے اصول ہمیشہ اُن لوگوں کو کشش کرتے ہیں جو اعلیٰ درجہ کے متمدّن سماج میں زندگی بسر کر رہے ہوں۔ اگر اِن اصولوں پر

عمل کیا جائے تو وہ اِنسان کو شہروں سے نکال کر، جنگلوں میں واپس پہنچا دیں گے۔ آخر انسان میں ابھی تک جانوروں کی بہت ساری خصلتیں اور خواہشیں باقی تو ہیں ہی کبھی کبھی انسان اپنی دُم گم ہو جانے پر افسوس محسوس کرتا ہے، اور گاہے گاہے درختوں کی پھُننگی پر گھونسلے میں زندگی بسر کرنے کی ہڑک بھی اُٹھ ہی آتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو تہذیب و تمدّن کی ساری تاریخ گواہ ہے کہ تہذیب و تمدّن نام ہے انسان کی حیوانیت کو بتدریج دُور کرنے کا۔ چونکہ بہترین اور شریف ترین انسانوں میں بھی حیوانیت کا اثر ابھی باقی ہے، اِس لئے ایک لحاظ سے تہذیب و تمدّن اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے۔

حیوان وحشی ہوتا ہے۔ وحشیوں سے روحانی قوّت کا تذکرہ مفید نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان نما حیوانوں سے کہا جائے کہ تہذیب و تمدّن بالکل فضول ہیں تو وہ کان کھڑے کر کے بڑی خوشی سے یہ تذکرہ سنتے ہیں، کیونکہ تہذیب و تمدّن سوائے اُن پر پابندیاں عائد کرنے کے اُن کی اور کیا خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ لیکن جب اُنہیں تلقین کی جائے کہ تشدّد ناجائز ہے تو وہ ایک کان سے سن کر، دوسرے کان سے اُڑا دیتے ہیں۔ غالباً

یورپینوں کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کے اندر حیوانیت کی خصلتیں کم ہیں، لیکن پھر بھی اُن میں یہ خصلتیں موجود تو ہیں۔ خاص طور پر آبادی کے ادنےٰ طبقات میں خاصی حیوانیت باقی ہے۔ ذات پات کی پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ادنےٰ طبقات اُن پسماندہ نسلوں پر مشتمل ہیں۔ جنہوں نے کبھی تہذیب و تمدّن کو پوری طرح قبول نہیں کیا۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں اِن اصولوں کی تلقین پھیلی، وہیں واقعات کا ایک یکساں چکّر چلا: عوام نے تہذیب و تمدّن کے خلاف بغاوت کر دی۔ حکومت اور اعلیٰ طبقات نے اِس بغاوت کو کچلنے کی کوشش کی۔ بغاوت کچلنے میں کامیابی ہو گئی تو فبہا۔ اگر بغاوت دبائی نہ جا سکی تو نیچ ذاتیں برسرِ اقتدار آگئیں پرانی سرکار ختم ہو گئی۔ کچھ عرصہ کے لئے سکون قائم ہو گیا۔ اِس عرصہ میں حیوانوں نے جو چاہا کیا۔ لیکن جنگل آجکل شہروں سے دور ہیں، اور اخروٹ کھا کر گزارہ چلانے کا موسم نہیں بیچارے حیوان تو ایسی کوئی چیز بنا نہیں سکتے جس کے لئے سوچ بچار کی ضرورت ہو۔ جلد ہی حیوان نما انسانات پر انسان قابو پا لیتا ہے، اور اُنہیں پھر اُن کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں کی

جانب بھگا دیا جاتا ہے۔

غرض گاندھی کی تعلیم کا عملی نتیجہ صرف یہ نکلا کہ تخریبی فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نتیجہ کو دیکھ کر خود گاندھی کا دل بھی دہل گیا۔ کچھ دیر تو اُس کی خواہش یہ رہی کہ اپنا پر چار بند کر کے باقی کی زندگی اپنے روحانی مقامات بلند کرنے میں صرف کرے لیکن وہ اپنے آپ کو عوام کی تحسین سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جلد ہی اُس نے اپنی کٹیا سے نکل کر پھر ملک کے طول و عرض میں اپنی شہرت پھیلانی شروع کر دی۔ ابلیسی ریلوے، گاندھی اور اُس کے چیلوں کو ہندوستان کے دور و دراز حصوں میں بآرام اور جلدی سے پہنچا دیتی تھی۔ ابلیسی حکومت اور ابلیسی کارخانوں کی طفیل ملک میں جو دولت جمع ہو گئی تھی، اُس سے گاندھی کو معقول رقمیں فراہم ہونے لگیں۔

ہندو مسلم اتحاد

کچھ عرصہ کے لئے گاندھی کی پارٹی اور تحریکِ خلافت دونوں میں اتحاد ہو گیا۔ اس سے کسی فریق کو تقویت نہ پہنچی البتہ کچھ وقفہ کے لئے ہندوستان میں برطانیہ کی دونوں دشمن پارٹیوں نے ایک متحدہ محاذ ضرور قائم کر لیا۔ دونوں تحریکو

میں بنائے مشترک صرف یہ تھی کہ انگلستان کی "ملیچھ" اور "کافر" حکومت سے دونوں بیزار تھیں، اور یہ حکومت اِن دونوں کو کچل رہی تھی۔ اِن دونوں تحریکوں میں مستقل اتّحاد کا کوئی امکان نہ تھا۔ دونوں جماعتوں میں جو عارضی الحاق ہو گیا، اُس کا ایک نتیجہ ضرور نکلا۔ وہ یہ کہ جو لوگ خود اپنے دل کی تسلّی کے لئے ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستان ایک متحدّہ قوم ہے، اور اِس وجہ سے حرّیت، خود ارادیّت، اور قومیّت کے لازمی حقوق کا سزاوار ہے، اُنہیں ضرور ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔ اِن سب واقعات کا ایک عجیب نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں بغاوت کی تحریک نے نقلِ مکانی کر لی۔ آج تک بغاوت کے دو زبردست گڑھ دکن اور بنگال میں واقع تھے۔ دورانِ جنگ میں دونوں جگہ سکون تھا۔ جنگ کے دنوں میں بمبئی اور بنگال دونوں صوبے، دو قابل اور صاحبِ ہمّت گورنروں کے ماتحت رہے۔ اِن گورنروں نے جنگ کے خلاف غدّاری کرنے والوں کو سختی سے دبا دیا۔ دکن یا بنگال نے گاندھی کے فلسفہ کو قبول کرنے کے لئے کسی ذوق و شوق کا اظہار نہ کیا۔ دکن کے برہمن سیاسی مزاج رکھتے ہیں اور بڑے ذہین ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ ایسی واحد نسل ہے جو

عسکری استعداد کے ساتھ ساتھ سیاسی تدبر کی بھی مالک ہے۔
اِن لوگوں کو جذباتی تخریب پسندی کے ساتھ کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ
خوب جانتے تھے کہ جب کوئی اجنبی قوم، وطن پر غاصبانہ قبضہ
کرلے تو اُس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔ ایسے موقعوں پر فلتے کرنے
یا عاجزی سے گڑگڑانے سے کام نہیں چلتا۔ ایسے موقعوں پر تو
پیش قبض کام آتی ہے۔ علاوہ ازیں اُنہیں یہ عقیدہ بھی کچھ بھونڈا
معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بنیا مہاتما بن سکتا ہے۔ وہ گاندھی کی ہنسی
اڑاتے تھے۔ اُس کی خوشامد کرتے تھے، اور اُسے اپنے مطلب
کے لئے استعمال کرتے تھے۔

بنگال میں اِن تخریبی اصولوں کا استقبال اِس سرد مہری سے
نہ کیا گیا۔ لیکن بنگال پر مسلمانوں کے خوف سے رعشہ طاری تھا۔
بنگال نے حال ہی میں اپنے صوبہ کی مسلمان آبادی کو دبایا تھا۔
بنگالی جب دیکھتے تھے کہ گاندھی اور خلافت میں اتحاد ہو رہا
ہے تو اُنہیں ڈر پیدا ہوتا تھا کہ یہ تو ممکن ہے کہ ہندو مت جیسا
بوسیدہ دھرم سرکار کا تختہ الٹ دے، لیکن اِس کے بعد
اِسلام کے فلسفۂ جہاد سے ہندوؤں کو کون بچائے گا۔ علاوہ ازیں
بعض صوبوں میں گاندھی کی تحریک نے مزارعوں کی شورش کی

صورت اختیار کر لی تھی، اور بنگال کے زیادہ تر سیاست دان بڑے زمیندار تھے۔

زمین پر دبنے والے آسمان پر کہاں چڑھ سکتے ہیں

گاندھی کے مداحوں کو یہ بڑا شوق تھا کہ وہ گاندھی کا مقابلہ عیسیٰ علیہ السلام سے کیا کرتے تھے۔ گاندھی بھی اس میں کچھ مضائقہ نہ سمجھتا تھا کہ استقلال سے مصیبتیں برداشت کر کے ثابت کر دے کہ وہ اپنے اصول کا دھنی ہے۔ غالباً اُس کا خیال تھا کہ اگر اُس نے معمولی ظلم وستم کا نشانہ بننا گوارا کر لیا تو اِس سے اُس کی ذاتی ہردلعزیزی میں اضافہ ہو جائے گا۔ یہ اُس کی غلطی تھی۔ خود عیسیٰ علیہ السلام کی مثال سے ثابت ہے کہ دنیا ستم رسیدوں کی مرید نہیں بنا کرتی۔

جس روز حکومتِ وقت کسی مہدی کو گرفتار کر کے دنیاوی سزا دیتی ہے، اُسی روز مہدی کی دنیاوی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اُس کا روحانی اثر باقی رہے۔ لوگوں کو یقین نہیں آتا کہ کوئی مافوق العادت طاقت رکھنے والی ہستی خوشی سے کوڑے کھا سکتی ہے، یا ایک ابلیسی حکومت کے ہاتھوں صلیب پر کھینچا جانا قبول کر سکتی ہے۔ اگر مہدی صاحب فرشتوں کی فوجیں بروقت

طلب نہ کریں تو اُس کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے کہ فرشتوں کی درگاہ میں اُن کا کوئی خاص رسوخ نہیں۔

وقت کی ضرورت تھی کہ ہندوستانیوں کی خوش اعتقادی کا طلسم توڑا جاتا۔ سوائے دکن اور بنگال کے سارے ہندوستان کو مہاتما کی روحانیت پر یقین ہو چلا تھا۔

دور افتادہ دیہات میں رہنے والے کسانوں کو روحانی قوتوں کا تو زیادہ علم نہ تھا، البتہ اُنہیں تلقین کی گئی تھی کہ ٹیکس ادا نہیں کرنے چاہئیں۔ اور اِس وجہ سے اُنہیں توقع تھی کہ گاندھی کے روپ میں دیوتا، زمین پر اُتر کر اُنہیں ٹیکسوں سے نجات دلا دیں گے۔ پھر اِن دیوتاؤں کے ماتحت دنیا میں رام راج قائم ہو جائیگا۔ اجنبیوں کی حکومت خود بخود دُم دبا کر بھاگ جائے گی۔ اگر اجنبی سرکار نے مقابلہ کی کوشش کی تو اُسے آسمانی فوجوں کے سامنے منہ کی کھانی پڑے گی۔ اِس کے بعد دنیا میں جنّت کا نقشہ قائم ہو جائے گا۔ نہ کوئی حکومت کو ٹیکس دے گا۔ نہ زمین کا مالک کرایہ وصول کر سکے گا، اور نہ بنیا اپنے قرضہ کی وصولی کے لئے ڈگری حاصل کر سکے گا۔

جہاں تک گاندھی کا تعلق ہے، حکومتِ وقت اور قاضئ شہر

دونوں کو ابھی تک مہاتما جی کو سزا دینے کا خیال ہی نہ آیا تھا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حکومت کو موجودہ شورش کے خطرناک ہونے کا پورا اندازہ نہ تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ حکومت کو ڈر تھا کہ گاندھی کو ایک مرتبہ سزا دے بھی دی گئی تو کہیں عدالتیں قانون میں کوئی رخنہ نکال کر اُسے پھر آزاد نہ کر دیں کسی حد تک یہ خطرہ بھی تھا کہ گاندھی کو سزا دی تو اُس کے مرید قتل پر نہ اُتر آئیں۔ زمانۂ قدیم کے اسماعیلیوں کی طرح گاندھی کے ماننے والوں میں سے بھی ممکن ہے کوئی "برہانِ قاطع" پیش کرنے پر نہ اتر آئے۔ گاندھی نے قتل کی وارداتوں کی ممانعت کر دی تھی، اور قتل اُس کے فلسفہ کے بھی خلاف تھا۔ اگر کوئی بڑا افسر واقعی قتل ہو گیا تو گاندھی کو غالباً سچے دل سے دکھ ہو گا اور شاید وہ چھ دن تک مسلسل پرائشچت کا برت بھی رکھے۔ لیکن مہاتما جی کی تپسیا سے غریب مقتول کے جسم میں گولی کا چھید تو ٹھیک نہ ہو جائے گا۔ کسی حد تک حکومت کی روایتی کمزوری کو بھی اِس تامل میں دخل تھا۔ اگر تم کچھ نہ کرو گے تو تم سے کسی بات کی پُرسش نہ کی جا سکے گی۔ یہ شورش خود ہی امتدادِ زمانہ سے ختم ہو جائے گی۔ اگر اس شورش کو سختی سے دبانے کی کوشش

کی گئی، تو اِس سے شورش اُٹھانے والوں کی حوصلہ افزائی ہو جائے گی۔ کسی حد تک یہ خوف بھی تھا کہ ممکن ہے کہ گاندھی کی تحریک کا رسوخ برطانیہ کے ذی اقتدار حلقوں میں بھی ہو۔ گاندھی کی تحریک اور بالشوزم کے کئی اصول باہم ملتے جلتے ہیں۔ ماسکو تو مزدوروں کا مکہ بن چکا ہے۔ دنیا میں کئی ایسی زبردست تحریکیں موجود ہیں جن کے پروگرام میں تخریبی اصولوں کا اثر شامل ہے۔ ہندوستان اور انگلستان، دونوں جگہ یہودیوں کو بڑا رسوخ حاصل تھا۔ یہودی گو تخریب پسند نہیں، لیکن یہودی تہذیبِ مغرب کا کچھ ایسا مدّاح بھی نہیں۔ وزیرِ ہند عرصہ تک بڑے فخر سے گاندھی کو اپنا دوست کہہ کر خطاب کرتا رہا۔ کئی مہینوں تک تو یہ تماشا جاری رہا کہ جب گاندھی کی تعلیمات کے باعث ملک میں بدامنی پھیل جاتی تو حکومت کی جانب سے گاندھی کے پاس اپیل کی جاتی کہ اِن فسادات کو ختم کرانے میں مدد دیجئے۔ گاندھی اکثر بخوشی ایسی امداد دینے پر آمادہ ہو جاتا۔ لیکن ایسی درخواستوں کا نتیجہ صرف یہ نکلتا کہ گاندھی کی اپنی نگاہوں میں اُس کی وقعت بڑھ جاتی، اور اُس کے ماننے والوں میں بھی اُس کی عقیدت پہلے سے زیادہ پختہ ہو جاتی۔

موپلہ بغاوت

اس مرحلہ پر مالابار میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ قدیم ایام میں میں مالابار ہندوستان کا وہ سب سے پہلا حصّہ تھا، جہاں موسمی ہواؤں کی امداد کے بغیر چلنے والے بادبانی جہاز سب سے پہلے پہنچتے تھے۔ مالابار کے باشندوں میں بیویوں کو ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کی اجازت تھی یعنی وہاں عورتوں کی شادی کا رواج نہ تھا، بلکہ جب کسی سے عورت کا دل چاہتا مستقل یا عارضی طور پر تعلق قائم کر لیتی۔ مالابار میں سب سے پہلے آنے والے مسافر عرب تاجر تھے۔ عربوں نے مقامی عورتوں سے تعلق قائم کر کے ایک مخلوط نسل پیدا کر دی۔ یوں افغانستان کے درّوں کے راستے محمود غزنوی رح کے حملوں سے مدّتوں پہلے مالابار میں اسلام مضبوطی کے ساتھ اپنی جڑیں جما چکا تھا۔ پسماندہ اقوام میں اسلام بڑی تیزی سے پھیلا۔ مالابار کی اونچی ذاتیں اپنے ہاں کی نیچ ذاتوں سے سخت غیر انسانی سلوک کرتی تھیں۔ آج بھی مالابار میں اسلام بدستور پھیل رہا ہے۔ موپلے جاہل ہیں، لیکن اپنے "درِ ایمان" پر فدا ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں بالعموم غازی بننے کا شوق عام نہیں لیکن مالابار میں ہر جگہ غازی موجود ہیں۔ مالابار کے مالکان زمین، سودی

قرضے دینے والے، اور سرکاری افسر، سب ہندو ہیں۔ یہ لوگ "غازیوں" پر بڑے ظلم ڈھاتے ہیں۔ حکومت نے کبھی غازیوں کو بچانے کے لئے کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ مدراس میں ہندوؤں کا رسوخ ہمیشہ سے بڑا قوی رہا ہے۔ حکومت نے بڑی کوشش کی کہ غازیوں کو فوج میں شامل کر لیا جائے لیکن پھر یہ تجربہ کسی قدر عجلت سے ترک کر دیا گیا۔ غرض غازی غریب بھی تھے، اور مظلوم بھی۔ غضب یہ تھا کہ اُن پر ظلم ڈھانے والے کافر تھے۔ گاہے گاہے غازی ہمت کی کمر باندھ کر، اور ہتھیار سنبھال کر اُس "جنت" کی تلاش میں نکلتے تھے، جو انہیں زمین پر میسّر نہ تھی۔ بار بار فوجوں کی کثیر تعداد کو جان پر کھیل جانے والے مذہبی دیوانوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں کچلنے کی خاطر بھیجنا پڑتا تھا۔ دس بارہ موپلے" دین کے دشمنوں کو قتل کرنے نکل پڑتے تھے۔ یہ لوگ کسی مضبوط عمارت میں مورچہ لگا کر بیٹھ جاتے تھے، اور اپنی جان بڑے مہنگے داموں بیچ کر ٹلتے تھے۔ نہ تو وہ کسی کی رعایت کرتے تھے، اور نہ کسی سے کوئی رعایت مانگتے تھے۔ سپاہی اِن تہوّر کے پتلوں کا احترام کرتے تھے، لیکن اُن کو گولی مار کر اُسی بیدردی سے ہلاک کرتے تھے جس طرح دیوانے کتّوں کو ہلاک کیا جاتا ہے۔

اِن دنوں مدراس کا گورنر ایک انتہا درجہ کا خلیق افسر تھا۔ اُس نے ہندوستان میں اپنے لئے ایسی ہر دلعزیزی اور وفاداری پیدا کر لی جو صرف کوئی اعلیٰ خاندان کا انگریز ہی ہندوستان میں حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اِس گورنر میں ایک نقص بھی تھا۔ وہ نقص یہ تھا کہ جب شہزادہ قمرالزماں کے کلدار گھوڑے کی طرح، اُس کا اوپر چڑھنے کا بٹن دب جائے، تو نیچے اترنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اپنے تدبّر اور حکمتِ عملی سے وہ اتنی کامیابیاں حاصل کر چکا تھا کہ اب اُسے خیال پیدا ہو گیا کہ ہر جگہ اور ہر مسئلہ کا حل نرمی سے ہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ گاندھی کے پرچارک مالابار میں گستاخانہ طور پر حکومت کی شیطنت کا چرچا کرتے پھرتے تھے۔ خلافت پارٹی کے لیڈر کھلے بندوں اسلام پر ظلم و ستم، اور اسلامی مقاماتِ مقدّسہ کی توہین کے رونے روتے تھے۔ مقامی مذہبی دیوانوں نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا، اور چاروں جانب بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ دور افتادہ مقامات میں یورپینوں کو قتل کر دیا گیا۔ لیکن خلافت کے مجاہدوں کا غصّہ زیادہ تر ہندو ظالموں پر نکلا۔ چاروں جانب قتلِ عام شروع ہو گیا، اور غیر مسلموں کو زبردستی مسلمان بنایا جانے لگا۔ یہ درست ہے کہ یہ غیر مسلم کچھ

نکمّی اور ستم پروری مخلوق تھے، لیکن پھر بھی وہ تھے تو برطانوی رعایا۔ اِس لحاظ سے حکومت اُن کی حفاظت کی ضامن تھی حکومت نے مجبور ہو کر مالابار میں فوجیں بھیجنی شروع کیں۔ موپلوں کے پاس ہتھیار نہ تھے۔ لیکن علاقہ دشوار گذار، اور آب و ہوا مضرِ صحت تھی۔ بغاوت کئی مہینے تک پھیلی رہی، حتیٰ کہ تمام علاقہ اجاڑ ہوگیا، اور قحط کے باعث باغیوں نے ہار مان لی۔ موپلے ایک ایسی بے یار و مددگار قوم تھے کہ اِس واقعہ سے باقی کے ہندوستان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ بغاوت اِسی علاقہ تک محدود رہی، البتہ اُس حکومت کو سخت بدنامی ہوئی جو نہ اپنی رعایا کو گمراہی سے بچا سکتی تھی اور نہ قتلِ عام سے روک سکتی تھی۔ ہاں موت کے فرشتہ کا ہاتھ بٹانے کو خود بھی آمادہ تھی۔

سکھ گوردواروں کی تحریک

پنجاب میں دوبارہ کوئی بغاوت رونما ہونے کی نوبت تو نہ آئی، لیکن درحقیقت صوبہ میں طوائف الملوکی پھیل چکی تھی۔ گاندھی کی تحریک کے ساتھ ملتی جلتی ایک دوسری تحریک اکالیوں کی تھی۔ عرصہ دراز سے سکھ ایک ایسا مذہبی فرقہ چلے آتے تھے جس میں ہندو مت اور اسلام دونوں کا اثر شامل تھا۔ مسلمانوں نے

سکھوں کو دبایا۔ اس پر سکھ تلوار لے کر میدان میں آ گئے۔ جو سکھ جنگجو گورو کی خدمت کرتے ہوئے جان کی بازی لگا دینے کا حلف اُٹھاتے انہیں اکالی کہا جاتا تھا۔ جب رنجیت سنگھ نے باقاعدہ تربیت یافتہ رسالے مرتب کر لئے، اور اس کے بعد سبراؤں کے مقام پر خالصہ نے انگریزوں سے فیصلہ کن شکست کھائی تو اکالیوں کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی۔ کچھ عرصہ سے سکھوں میں بھی حکومت کی مخالفت پھیل رہی تھی۔ کئی سکھوں نے اس مرحلہ پر اکالیوں کا حلف اُٹھا کر اکالیوں کا لباس پہننا شروع کر دیا۔ یہ اکالیوں کی ٹولیاں ملک میں دورہ کرتی پھرتی تھیں۔ بہانہ تو یہ تھا کہ خیرات اکٹھی کرنے، اور زیارات پر حاضری دینے کی خاطر گھوم رہے ہیں۔ لیکن دراصل وہ بدامنی پیدا کرنے کے موقعے ڈھونڈتے پھرتے تھے۔

سکھوں کی کئی زیارتیں مہنتوں کے قبضہ میں تھیں۔ یہ مہنت سکھوں کے ابتدائی دور کی یادگار تھے۔ اور یہ زیارات خاصی مالدار تھیں۔ اکثر مہنت بھی دنیادار آدمی تھے۔ اکالیوں نے بعض مہنتوں کو جبراً بے دخل کرنے کی کوشش کی۔ مہنت ان زیارتوں کو اپنی جاگیر سمجھے بیٹھے تھے۔ مہنتوں نے حکومت سے امداد کی

درخواست کی، لیکن حکومت نے امداد دینے سے انکار کر دیا۔ حکومت نے کہا یہ ایک مذہبی مسئلہ ہے، اور سرکار اِس میں دخل نہیں دینا چاہتی۔ اگر آئرلینڈ کے محبانِ وطن اسی طرح لندن کے سرکاری قبرستان پر جبری قبضہ کرلیں، اور اُس جائداد پر بھی تسلّط حاصل کرنا چاہیں جو کیتھولک باشندوں سے زبردستی چھینی گئی تھی، تو شاید حکومت پھر بھی مداخلت گوارا نہ کرے گی! مہنتوں نے پٹھان چوکیدار ملازم رکھ کر اکالیوں کی مداخلتِ بیجا کا مقابلہ کرنا چاہا، نتیجہ یہ نکلا کہ اکالیوں کا ایک خوفناک قتلِ عام ہوگیا۔ اب گورنمنٹ موقعہ پر پہنچ گئی، مجرم مہنت کو گرفتار کر کے اُس پر مقدمہ چلایا گیا، اور وہ سزایاب ہوا۔ اس کے بعد لوگ اکالیوں کے سامنے بے بس تھے۔ وہ کہتے تھے، اگر ہم اکالیوں کا مقابلہ نہ کریں تو وہ ہمیں لوٹ کر لے جاتے ہیں، اور اگر ہم مقابلہ کریں تو ہمیں پھانسی دی جاتی ہے۔ آخر یہ سرکار کس مرض کی دوا ہے؟۔

سارے ملک میں جابجا چھوٹے موٹے بلوے اور فساد جاری تھے۔ جب زمانہ نے اتنی ترقّی نہ کی تھی تو اِن بلووں اور فسادات

کو خاصہ اہم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب تو اس طرف معمولی توجّہ ہی کافی سمجھی جاتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ بلوہ اور فساد کا تذکرہ ایک قسم کی بدتمیزی اور رجعت پسندانہ ذہنیّت کا، اظہار سمجھا جاتا تھا۔ مقامی بلوائیوں یا باغیوں کو گولی سے اُڑا دیا جاتا تھا۔ بغاوت کے ادنیٰ درجہ کے کارندوں کو مقدمات چلا کر سزائیں دی جاتی تھیں۔ لیکن تھوڑا عرصہ بعد اُنہیں رہا کر کے، انعامات سے نوازا جاتا تھا۔ جہاں تک شورش کے سرغنوں کا تعلّق تھا، اُن سے تو پرسش بھی نہ کی جاتی تھی۔ لوگ کہتے تھے، ایسی حکومت کا فائدہ کیا ہے جو نہ اپنے دوستوں کو بچا سکتی ہے اور نہ دشمنوں کو سزا دے سکتی ہے۔

فوج پر تحریکِ خلافت کا اثر

اب فوج کو ورغلانے کے لئے ایک تحریک شروع ہوئی۔ سکھ پہلے ہی خاصے گمراہ ہو چکے تھے۔ مسلمان سپاہیوں کو بتایا جاتا تھا کہ ایک ایسی سرکار کی حمایت گناہ ہے جس نے مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی کی ہے اور جو ترکوں کی جانی دشمن ہے۔ ہندو، مسلمان، اور سکھ سپاہی زیادہ تر کاشتکاروں میں سے بھرتی کئے جاتے تھے۔ مسلمان کاشتکاروں میں خلافت کی تحریک، اور

ہندو کاشتکاروں میں گاندھی کے پراپیگنڈا نے گہرا اثر کیا تھا۔ اب فوج کو ورغلانے کی اس تحریک کی حمایت میں گاندھی اور اُس کے چیدہ چیدہ معاونین نے کھلی شرکت بھی شروع کر دی۔ مہاتما جی کی تعلیم کا ایک لازمی جزو یہ بھی تھا کہ فوج سرکار کی اطاعت سے انکار کر دے۔ وجہ یہ تھی کہ سرکار کی ابلیسی قوّت کا بنیادی سہارا فوج ہی تو ہے۔

جنگ کے بعد فوج بدنظمی کی حالت میں تھی۔ اکثر رجمنٹیں وزیرستان کے کوہستانی علاقہ میں باغیوں سے نپٹنے میں مصروف تھیں۔ سپاہیوں کے رشتہ داروں کو اور خود سپاہی بھی چھٹی لے کر گھر جائیں، تو اُنہیں ہر وقت توہین اور بدسلوکی کا خدشہ تھا۔ سپاہیوں نے افسروں کے پاس اپنی حفاظت کے لئے درخواست کی۔ لیکن اُن کی کچھ شنوائی نہ ہوئی۔

آخر کار حکومتِ برطانیہ نے شملہ کے حکّام پر دباؤ ڈال کر اور قریب قریب اُنہیں مجبور کر کے خلافت پارٹی کے لیڈر گرفتار کروائے۔ اربابِ شملہ گاندھی پر مقدمہ نہ چلانا چاہتے تھے۔ اس وجہ سے خلافت کے لیڈروں پر اُن جرائم کے ارتکاب کا الزام لگایا گیا جو بظاہر گاندھی سے سرزد نہ ہوئے تھے۔ اِس کے معنی یہ

ہیں کہ بغاوت یا غدّاری کا الزام لگانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ اسیرانِ خلافت پر معمولی درجہ کے جرائم کے مقدمات چلائے گئے، جن کے پاداش میں اُن کو تھوڑی مدّت کے لئے قید کی سزا ہوگئی۔ اِس مقدمہ کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ وہ یہ کہ مسلمان ملزموں نے دوران مقدمہ میں جس زنّاٹے سے جارحانہ ذہنیّت کا اظہار کیا، اُس سے ہندو خوفزدہ ہو گئے۔ ہندو عوام تو پہلے ہی مالابار کے واقعات سے متوحّش ہو رہے تھے، اب سیاسی مزاج رکھنے والے ہندوستانیوں نے بھی قائدینِ خلافت کا دین پر اصرار پسند نہ کیا، کیونکہ اِس سے اِنگلستان کی رائے عامہ برہم ہو جانے کا خدشہ تھا۔ اِس مقدمہ کی کارروائی کے بعد خلافت اور گاندھی کی تحریک میں جدائی پیدا ہوگئی۔ اِس کے بعد حال ہی میں ترکی کے اندر جو واقعات درپیش آئے ہیں، اُنھوں نے تحریکِ خلافت کو مضحکہ خیز بنا کر رکھ دیا ہے۔ شاید گاندھی یہ بھی سمجھتا ہو کہ ایسی تحریک کو اب ساتھی بنائے رکھنے کا کیا فائدہ ہے۔

حکومتِ ہند کی جڑیں ہل چکی ہیں

گاندھی پر بھی بالآخر مقدمہ چلایا گیا۔ اور اُسے طویل قید

یا یوں کہنا چاہیئے، کہ نظر بندی کی سزا ملی - اِس وقت تک گاندھی کے رسوخ میں بہت کمی آچکی تھی۔ تحریک اُس کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی - اس لئے اُس کی گرفتاری سے کچھ زیادہ ہنگامہ بپا نہ ہوا -

جو اُمید بھرے دل خیال کرتے ہیں کہ اب چاروں جانب چین ہی چین ہے، وہ غلطی پر ہیں - یہ درست سہی کہ آج خلافت اور گاندھی کی تحریکیں ویسی طاقتور نہیں جیسی کہ کل طاقتور تھیں، لیکن بہر حال یہ تحریکیں چند زندہ اصولوں کی ترجمان ہیں - وہ اصول اب بھی قائم ہیں، اور ہمیشہ کی طرح عوام پر اپنا اثر پیدا کر رہے ہیں - شورش پیدا کرنے والوں نے یہ سبق سیکھ لیا ہے کہ وہ بغیر کسی ڈر کے شورش پیدا کر سکتے ہیں، بلکہ شورش پیدا کرنے والے عزت افزائی اور انعام کی بھی توقع رکھ سکتے ہیں - مجالسِ قانون ساز میں شورش پسندوں کی حمایت کی جاتی ہے، اور حکومت بھی اُس کے ساتھ رعایت برتتی ہے - اگر کسی کو مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں تو گمراہ ہونے والے عوام کو کسی نامور باغی کو جیل بھیجنے کی نوبت آجائے تو حکومت گڑگڑا کر معذرتیں شائع کرتی ہے - ایسا باغی اور اُس کے دوست یقین سے توقع

رکھ سکتے ہیں کہ جلد ہی" حکومت اپنی نیک دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے" اُس کو رہا کر دے گی۔ بلکہ جیل میں رہ کر اِن باغیوں کو چھٹی مل جاتی ہے کہ تھوڑی دیر سستا کر اپنا دم تازہ کر لیں۔ گناہ بخشی بڑی اچھی عادت ہے، لیکن کمزوری دکھانا کوئی قابلِ تعریف خصلت نہیں۔ اگر کسی باغی پر باقاعدہ مقدمہ چلانے کے بعد اُس کو سزا ملتی ہے، اور پھر فی الفور اُسے رہا کر دیا جاتا ہے تو یہ مقدمہ سننے والی عدالت کی صریح توہین ہے۔ امن و امان کا قیام کوئی ایسا مسئلہ نہیں جسے حکومت اور باغی باہم بیٹھ کر آپس میں طے کر لیں۔ وفادار، اور امن پسند رعایا کے بھی کچھ حقوق ہیں قانون، بغاوت۔ اور غدّاری کی مخالفت کرتا ہے۔ جس حکومت کا انتظامی شعبہ مجرموں پر مقدمہ چلانے سے انکار کرتا ہے، یا مقدمہ چلانے کے بعد مجرموں کو معاف کر دیتا ہے، وہ حکومت تنسیخِ قانون کی ایک خطرناک مثال قائم کرتی ہے۔ یہ حکومت اپنے قانونی اختیارات کا ناجائز استعمال کر رہی ہے۔ ایسی حکومت کو جلد ہی تجربہ ہو جائیگا۔ کہ اُس کے کارندے جی ہار کر بیٹھ جائیں گے۔ وہ کہیں گے، ہمیں مجرموں کو ڈھونڈنے اور قید کرنے کی زحمت اُٹھانے کی کیا حاجت ہے۔ یہ مجرم تو ایک دو مہینہ میں رہا ہو جائیں گے، اور ہم ناحق

ہمیشہ کے لئے اُن کی دشمنی مول لیں گے۔ پھر اگر اُن کی دشمنی سے ہمیں کوئی نقصان پہنچا، تو حکومت نے کون سی ہماری مدد کرنی ہے۔ اس طرح جب کبھی حکومت کو سختی کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو پتہ چلتا ہے کہ حکومت کے ہاتھ پاؤں مفلوج ہو چکے ہیں۔

ہندوستان میں پرنس آف ویلز کی آمد

یہ سب کچھ ہوتا رہا، اور برطانیہ میں کسی بات پر توجہ نہ دی گئی۔ انگریز قوم نے اپنی حکومت کو مکمل اختیارات سونپ رکھے تھے۔ وہ اب نکتہ چینی کر کے اپنی حکومت کو پریشان نہ کرنا چاہتے تھے۔ ایک طاقتور گروہ ہندوستان میں نظامِ حکومت کی اصلاح کا حامی تھا۔ قریب قریب تمام انگریزی اخبارات اس گروہ کے تسلّط میں تھے۔ جو چند اخبارات اِس گروہ کے زیرِ اثر نہ تھے، اُنہیں عام طور پر ناقابلِ اعتماد سمجھا جاتا تھا، اور وہ قدامت پسندوں کے پٹھو یا "پرانے وقتوں کے لوگ" کہلاتے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات کا کچھ حصّہ موجودہ نظامِ حکومت کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ باقی کے اخبارات روایتی طور پر حکومت کے وفادار تھے۔ اِن اخبارات کو ہندوستان میں برطانیہ کا ترجمان سمجھا جاتا تھا۔ غرض کسی کو اندرونی روگ کا علم نہ تھا۔

اگر برسرِ اقتدار طبقہ انگلستان کے شہزادہ پرنس آف ویلز کو ہندوستان کی سیر پر روانہ کرنے کا فیصلہ نہ کرتا، تو شاید یہ راز ہمیشہ پوشیدہ رہتا۔ ہندوستان میں اِس نوجوان شہزادہ کی آمد پر مسلسل سیاسی ہڑتالوں اور بلووں کا موقعہ بنا لیا گیا۔ اِس شہزادہ سے کسی شخص کو ذاتی بغض نہ ہو سکتا تھا۔ اِس وجہ سے اِس توہین آمیز سلوک کا نشانہ خود شہزادہ نہ تھا۔ اِس توہین کا نشانہ برطانیہ کا شاہی خاندان تھا۔ لیکن انگلستان کا شاہی خاندان صرف تخت نشینی کرتا ہے، حکومت نہیں کرتا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ یہ ہنگامے حکومت کے چند مخصوص اقدامات کے خلاف احتجاج کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہاں تاجِ برطانیہ، برطانوی قوم کا اسمی نمائندہ ضرور ہے۔ گویا اِس توہین کا نشانہ خود برطانیہ تھا۔

یہ مظاہروں کی تحریک سارے ملک میں کچھ اس طرح پھوٹ پڑی تھی کہ اِس کو شورش پسندوں کا وقتی ہنگامہ قرار نہ دیا جا سکتا تھا۔ اگر اِن مظاہروں کو وقتی ہنگامہ سمجھ بھی لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا تھا کہ یہ کِس قسم کی حکومت ہے، جو کسی ایک شہر میں بھی دو چار روز کے لئے شہزادہ کی موجودگی کے ایام میں امن و امان قائم نہیں رکھ سکتی۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اِن مظاہروں کے پیچھے ملک میں کوئی گہری اور منظم سازش کام کر رہی ہے جو برطانیہ

کی دشمن ہے۔ اِس دشمنی کا باعث حکومتِ ہند کی حرکات نہیں ہوسکتیں، کیونکہ حکومتِ ہند تو اب ایک بہت حد تک آزاد حکومت ہے۔ وہ دن گئے جب یہ حکومت خالی برطانیہ کی گماشتہ ہوا کرتی تھی۔ اب حکومتِ ہند کی کوتاہیوں کا انتقام برطانیہ سے لینا ایک لایعنی فعل ہوگا، کیونکہ اِن کوتاہیوں کا علاج خود ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ گویا اِس دشمنی کا باعث خالص نسلی منافرت ہے۔ غضب ہے کہ آج تک کیا کیا جھوٹ بول کر برطانوی قوم کو گمراہ کیا جاتا رہا ہے۔ اگر تم جانتے تھے کہ ہندوستان میں ایسی بدتمیزی کا مظاہرہ بھی ہوسکتا ہے تو تم نے خاندانِ شاہی کے نمائندہ کو اِس توہین کے ارتکاب سے پہلے ہندوستان آنے کی ممانعت کیوں نہ کردی۔ اگر تمہیں اِس خطرہ کا علم نہ تھا، تو تم سخت لاعلم واقع ہوئے ہو۔ غرض اِس سانحہ کے بعد اہلِ برطانیہ میں ایک تشویش پیدا ہوگئی کہ "ہندوستان میں سب اچھا نہیں"۔ اِس کے بعد زمانہ کی رفتار نے وہ غیر سرکاری پابندیاں بھی رفع کردیں جو اِس سے قبل ہندوستان سے آنے والی خاص خاص قسم کی خبروں پر عائد تھیں۔ اس کے بعد ہندوستان سے جو اطلاعات فراہم ہوئیں، اُنہوں نے برطانیہ میں مزید تشویش پیدا کردی۔

ہندوستان میں آئینی اصلاحات ناکام ثابت ہوئیں

یہ تشویش تھی بھی حق بجانب، کیونکہ، اصلاحات کی حمایت میں جو غوغا بپا کیا جا رہا تھا اُس کے باوجود، حقیقت یہی تھی کہ ہندوستان کے نظامِ حکومت میں جو آئینی اصلاحات کی گئی تھیں، وہ قابلِ عمل ثابت نہ ہو رہی تھیں۔ یا اگر ان اصلاحات پہ کچھ عمل ہو رہا تھا، تو وہ توقّع کے مطابق نہ تھا۔

صوبوں میں کیفیت یہ تھی کہ حکومت کا انتظامی شعبہ کمزور تھا، لیکن عوام کے نمائندے ارکانِ حکومت کو منصب سے معزول بھی نہ کر سکتے تھے۔ حکومت کے انتظامی شعبہ کو ایک ایسی مجلسِ قانون ساز سے واسطہ تھا جس پر نہ حکومت چلانے کی کوئی ذمّہ داری تھی، اور نہ اِس مجلس پر حکومت کا کوئی قابو چلتا تھا۔

دہلی میں بھی حکومت کا انتظامی شعبہ کمزور تھا، اور عوام کے نمائندے اُسے منصب سے ہٹا نہ سکتے تھے۔ مرکزی حکومت کو ایک ایسی مجلسِ قانون ساز کا سامنا تھا جس کے ایک ایوان پر حکومت کا کوئی قابو نہ تھا۔ مرکز اور صوبوں میں، دونوں جگہ، گورنروں اور گورنر جنرل کو یہ اختیار حاصل تھا کہ موقع پڑے تو مکمل ڈکٹیٹرانہ اختیارات سنبھال لیں۔

اصلاحات کی تجویز کے وقت توقّع یہ تھی کہ صوبوں میں حکومت
بعض محکموں کے نظم ونسق کے متعلق عوام کے نمائندوں کے سامنے
جواب دہ ہوگی۔ بر عکس اس کے بعض دوسرے محکموں کا انصرام
ایسے ارکانِ حکومت کے سپرد ہوگا جنہیں عوام کے نمائندے
منصب سے معزول نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک سخت نامعقول تجویز
تھی، جسے دو عملی حکومت کا نام دیا گیا تھا۔ اس اسکیم کی پیدائش
سے پہلے ہی اِس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ کوئی وزیر کبھی محض
اِس خیال سے استعفےٰ نہ دیتا تھا کہ اُسے ایوان میں اکثریّت
حاصل نہیں۔ یہ بھی اچھّا ہی تھا، ورنہ وزرا ایوان کی نارضامندی
کے پیشِ نظر استعفےٰ دینے لگتے تو اُن کی جگہ پُر کرنے کا کوئی بندوبست
نہ تھا۔ اگر کوئی وزیر ذاتی اسباب، یا دھڑا بندی کے باعث مستعفی
ہو بھی جاتا، تو اُس کا جانشین حزب الاختلاف کی مرضی کے
مطابق مقرر نہ کیا جا سکتا تھا، کیونکہ کوئی حزب الاختلاف موجود
ہی نہ تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ملک میں سوائے حکومت کے، اور
کوئی نظام ہی موجود نہ تھا۔

غرض مستعفی وزیر کی جگہ پُر کرنے کی واحد صورت یہ تھی کہ
حکومت محض اپنی موج کے مطابق کسی اور کو وزیر بنا دیتی۔ جدید

آئین کے مصنّف خاصی عجیب ذہنیت کے لوگ تھے، لیکن اُن کی تجویز بھی یہ نہ تھی کہ حکومت مختلف شعبوں کو ایک دوسرے سے بالکل جدا رکھ سکے گی۔ مثال کے طور پر قلمدانِ خزانہ اور قلمدانِ تعلیم کو ایک دوسرے سے کیونکر منقطع کیا جا سکتا تھا۔

دو عملی کی دقتیں

توقع یہ تھی کہ مجلسِ انتظامیہ کے نامزد اراکین، مجلس قانون ساز میں سے منتخب وزراء کے ساتھ مل جل کر باہمی تعاون سے کام چلائیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ کابینہ ایک متحدّ ادارہ کے طور پر کام کرنے لگا۔ مجلسِ انتظامیہ اور وزراء کے مابین کوئی فرق باقی نہ رہا۔ البتہ وزراء کی تنخواہ، اُن کا مرتبہ، اور وقار، مجلسِ انتظامیہ کے اصلی اراکین سے کم تھا۔ یہ وزراء اُن سیاست دانوں میں سے چنے جاتے تھے جو عوام کے اندر کام کر رہے ہوں۔ بعض اوقات تو ایسے لوگوں کو وزیر بنا دیا گیا جو حکومت کے خلاف شدید مخالف رہ چکے تھے۔ ایک ایسے شخص کو بھی وزیر بنایا گیا جو ملکِ معظّم کے خلاف بغاوت کرنے اور دوسرے غدّارانہ افعال کے ارتکاب کی پاداش میں سزایاب ہو چکا تھا۔

جن صوبوں میں مجالسِ انتظامیہ پہلے سے موجود نہ تھیں، اب

وہاں ایسی مجلسیں قائم کی گئیں۔ وزراء کو علیحدہ رکھتے ہوئے، کونسل کے دیگر اراکین کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا گیا۔ آئین میں کہیں درج نہ تھا کہ مجلسِ انتظامیہ کے اراکین صرف ہندوستانی ہوں گے، لیکن عملاً اگزیکٹو کونسل کے تمام اراکین ہندوستانی ہی ہوتے تھے۔ کسی شخص کا گوری نسل سے تعلق رکھنا اُس کو اگزیکٹو کونسل کا ممبر ہونے کے ناقابل بنا دیتا تھا۔ سول سروس کے انگریز ملازمین کی اجارہ داری تو عرصہ سے ختم ہو چکی تھی۔ اور سول سروس کے ہندوستانی ملازمین کو اگزیکٹو کونسل کے اراکین نامزد کرنے کا کسی کو خیال ہی نہ آیا۔ یہ بھی تجویز تھی کہ جہاں تک ممکن ہو، تمام صوبوں کے گورنر ایسے انگریز مقرر کئے جائیں جو برطانیہ کے "سیاسی مدبرین" کی صف میں شمار ہوتے ہوں۔

حکومتِ برطانیہ کی خوش قسمتی سمجھئے کہ ایک اہم صوبہ کا گورنر ایک ایسا شخص مقرر ہوا، جو ہندوستانی بھی تھا اور "انگریز مدبرین" کی فہرست میں بھی شمار ہوتا تھا۔ شملہ کی مرکزی حکومت میں کوئی وزیر شامل نہ تھا۔ ہاں اگزیکٹو کونسل کے اراکین کی تعداد یہاں بھی بڑھا دی گئی، اور بعض ہندوستانی جو حکومت کے اعتدال پسند مخالف تھے اِس کونسل کے اراکین مقرر ہو گئے۔

ایک ایسی مجلس انتظامیہ، جو گویا مختلف الخیال آدمیوں کی کمیٹی تھی، جن کی نسل میں اختلاف تھا، تربیت میں اختلاف تھا، سابقہ ذاتی مخالفت کی مثالیں بھی موجود تھیں، اور جن میں اپنے سیاسی مخالفوں کو شکست دے کر خود برسرِ اقتدار رہنے کی خواہش بھی بنائے مشترک نہ تھی، بھلا ایسی مجلسِ انتظامیہ سوائے بے اثر اور کمزور رہنے کے کیا کر سکتی تھی۔ جب اِس اگزیکٹو کونسل کا صدر ایک ایسا شخص ہو جو اُس ملک کے حالات سے بالکل بے خبر ہے جہاں اُسے حکومت کرنی ہے، تو پھر ایسی حکومت کے کمزور اور بے اثر رہنے میں رہی سہی کسر بھی پوری ہو جاتی ہے۔ ایسی کمیٹی کے اراکین جس قدر زبردست شخصیت کے مالک ہوں، جس قدر باضمیر، دیانتدار، اور وفادار ہوں، اُتنا ہی اُن میں باہمی اختلافات کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ مخلوط وزارتوں کو پسند نہیں کرتا۔ میں اس مسئلہ پر کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، کیونکہ یہ تو سیاسیات کا ایک مسلّمہ اور بنیادی اصول ہے۔

یہ بھی سیاسیات کا ایک مسلّمہ اور بنیادی اصول ہے کہ جہاں حکومت کا انتظامی شعبہ عوام کے نمائندوں کے سامنے جوابدہ

نہ ہو، اور ساتھ ہی مجلسِ قانون ساز پر حکومت چلانے کی ذمہ داری نہ ہو، وہاں سوائے خاص خاص مثالوں کے، حکومت کا انتظامی شعبہ آزادی سے کام نہیں کر سکتا۔ ایک سلطنت ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہوتی ہے۔ مساوی رتبہ کی آزاد طاقتیں ایک سرکار کے اندر نہیں رہ سکتیں۔ حکومت کے فرائض کی تقسیم حسب ذیل شعبوں میں کی جا سکتی ہے: انتظامیہ، قانون ساز، اور عدلیہ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ شعبے مختلف وزرائے حکومت میں بانٹے جا سکتے ہیں، لیکن اس صورت میں تمام وزرائے حکومت کا ایک حکمران قوت کے تابع ہونا لازمی ہے۔

مختلف اعضائے حکومت میں افتراق مفید نہیں ہوتا

اٹھارھویں صدی کے کوتاہ اندیش مصنفین سرسری انداز سے برطانیہ کے آئین کا جائزہ لے کر فرض کر لیتے تھے کہ کامیاب جمہوریت کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ حکومت کے مذکورۂ بالا تینوں فرائض کو ایک دوسرے کو قطعی طور پر جدا کر دیا جائے۔ جو دساتیرِ حکومت اِس غلط اصول پر وضع کئے گئے تھے، وہ چار پشتوں سے نوعِ انسانی کے لئے ایک لعنت ثابت ہو رہے ہیں۔ اِس قسم کی قطعی علحدگی یا تو ناممکن ہوتی ہے، اور

یا شر آمیز ثابت ہوتی ہے۔

یہ تو سچ ہے کہ ججوں کو غیر جانبدار ہونا چاہیئے۔ ججوں کا تقرر حکومت کے انتظامی شعبہ کے من کی موج پر نہ منحصر ہونا چاہیئے ججوں کے فیصلے قانون کے منشاء کے مطابق ہونے چاہیئں اور اِن فیصلوں میں سرکار کی وقتی مصلحتوں کو دخل نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ بہر صورت ججوں کا تقرر حکومت کے انتظامی شعبہ کے ذریعہ ہی عمل میں آتا ہے۔ قوانین، مجلس قانون ساز منظور کرتی ہے۔ جمہوری یا پنچایت اُنہیں رائے دہندگان میں سے چُنی جاتی ہے، جو مجلسِ قانون ساز کے اراکین کو منتخب کرتے ہیں۔ مجلسِ قانون ساز ہی حکومت کے انتظامی شعبہ کے اراکین کے تقرر کی منظوری دیتی ہے۔ مجلس قانون ساز اور حکومت کا انتظامی شعبہ، شدید نوعیت کی خطا سرزد ہو جانے پر ججوں کو اُن کے عہدوں سے معزول کر سکتے ہیں۔ اگر ججوں کے فیصلہ میں کوئی سخت سقم رہ جائے تو حکومت کا انتظامی شعبہ ایسے فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے سے انکار کر سکتا ہے۔ اِن حالات میں یہ ناممکن ہے کہ ملکی سرکار کا عدالتی شعبہ ہمیشہ کے لئے حکومت کے انتظامی شعبہ کا، یا مجلسِ قانون ساز کا دشمن بن کر اُن کے سامنے ڈٹ جائے

اگر ایسا ممکن ہوتا، تب بھی اس کا نتیجہ سلطنت کی تباہی کے سوا اور کچھ نہ نکلتا۔

اگر عدالت کی قوت بے قابو ہو کر استعمال کی جائے تو اِس سے ملکی سرکار مفلوج ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر مجلسِ قانون ساز اور حکومت کے انتظامی شعبہ کے مابین ایک اونچی دیوار کھڑی کر دی جائے تو یہ اور بھی زیادہ مضر ثابت ہو گا کیسی حکومت کا انتظامی شعبہ، قانون کی امداد اور روپے کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ قانون اور روپیہ دونوں کی منظوری دینا مجلسِ قانون ساز کے ہاتھ میں ہے۔ مجلسِ قانون ساز ہی حکومت کو وہ اختیارات دے سکتی ہے جن کی ضرورت حکومت محسوس کرے، اور مجلسِ قانون ساز ہی حکومت کو ٹیکس وصول کرنے اور مختلف مدّات پر خرچ کرنے کی اجازت دے سکتی ہے۔ دوسری طرف مجلس قانون ساز کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کروانا حکومت کے انتظامی شعبہ کا کام ہے، چاہے یہ شعبہ اِن قوانین کو ناپسند ہی کیوں نہ کرتا ہو۔

انگلستان ایسے نظامِ حکومت کے باعث پیدا ہو جانے والے خلل سے اچھی طرح آگاہ ہے جس کا ہر شعبہ ایک دوسرے

سے متصادم ہو۔ اِس آگاہی کی وجہ یہ ہے کہ سو سال تک انگلستان خود اِس قسم کے نظامِ حکومت سے پیدا ہونے والے خلل کا شکار رہا ہے۔ یہ حکومت کے مختلف شعبوں کے باہمی تصادم ہی کا نتیجہ تھا کہ برطانیہ کا ایک بادشاہ سولی پہ کھینچا گیا، اور دوسرے کو فرانس بھاگنا پڑا۔ حکومتِ انگلستان کی اِسی سو سالہ بدنظمی کے دوران میں تین خانہ جنگیاں برپا ہوئیں۔ ہر چوک اور ہر منڈی میں شجاعوں، وفاداروں اور محبانِ وطن کی لاشیں بکھری پڑی تھیں ایمسٹرڈم اور پیرس کے وہ محلّے جہاں کنگال آباد تھے، برطانیہ کے ایسے ایسے سپوتوں کی رہائش گاہ بن گئے جو مادرِ وطن کی شہرت کو چار چاند لگا سکتے تھے۔ انگلستان، جو کبھی یورپ کی قسمت کا مالک تھا، اور تھوڑا ہی عرصہ بعد پھر اُسی پرانی شان کا مالک ہونے والا تھا، اِس دوران میں اتنا بے وقر ہو کر رہ گیا کہ پرتگال اور وینس سے بھی گھٹیا سلطنت سمجھا جانے لگا۔

انگلستان کی حکومت کے مختلف شعبوں کے مابین کشمکش نے ہی آئرلینڈ کی وہ گت بنادی ، جو آج سب کے سامنے ہے یہ اِسی دستورِ حکومت کا نتیجہ تھا کہ مقبوضاتِ امریکہ برطانیہ سے چھن گئے۔ یہ اِس نظام حکومت کو طلاق دینے کا پھل تھا کہ آج کینیڈا

برطانوی سلطنت میں شامل ہے۔ اب برطانوی سیاسیات میں یہ ایک مسلّمہ اور ابتدائی اصول ہے کہ حکومت کے انتظامی شعبہ اور مجلسِ قانون ساز میں جتنی یکجہتی ہو کم ہے۔

حکومت کے انتظامی اور قانون ساز شعبوں میں اتحاد لازمی ہے

جب انگلستان پر اسٹوئرٹ خاندان کے سلاطین کا راج شروع نہ ہوا تھا، تو حکومت کے انتظامی شعبہ اور مجلسِ قانون ساز کا یہ اتحاد اِس وجہ سے قائم تھا کہ مجلسِ قانون ساز بادشاہ کے ساتھ بگاڑنے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ تودور خانوادہ کے برطانوی سلاطین عام حالات میں حکومت چلانے، یا روپے فراہم کرنے میں، اپنی پارلیمنٹ کے محتاج نہ تھے۔ اُن کی شاہانہ آمدنی اُن کے معمول کے اخراجات کے لئے کافی تھی۔ وہ ملک کے حالات سے بخوبی واقف تھے، اور کوئی ایسی پالیسی اختیار نہ کرتے تھے جس پر خرچ کی ضرورت ہو، اور یقین نہ ہو کہ ملک اس خرچ کو منظور کرے گا۔ چونکہ اِن بادشاہوں کے حمایتی ملک میں ہر جگہ موجود تھے، اور اُن دنوں بادشاہ کا نام ہی لوگوں کے دلوں میں لرزہ پیدا کر دیتا تھا، اِس لئے اُن کی پارلیمنٹ اُن کے قابو میں تھی۔ اگر پارلیمنٹ کے اراکین فرداً فرداً بادشاہ کی رائے کی مخالفت کرتے، تو ایسے ممبروں کے خلاف

سختی کرنے سے بھی دریغ نہ کیا جاتا تھا۔ چونکہ بادشاہ کی رائے قوم کی رائے ہوتی تھی، اِس لئے اس طرزِ عمل میں مضائقہ بھی نہ تھا۔ کچھ عرصہ بعد منحرف اراکینِ پارلیمنٹ کو راضی کرنے کے لئے رشوت کا حربہ بڑی کامیابی سے استعمال کیا جاتا رہا۔ اِس کے بعد ایک ایسا دور آیا جب پارلیمنٹ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے ایک طرف تو رشوت دی جاتی تھی، اور دوسری طرف ایسے حلقہ ہائے انتخاب سے امداد لی جاتی تھی جہاں کا الیکشن حکومت کی جانب سے نامزدگی کا دوسرا نام تھا۔ لیکن ۱۸۳۲ء کے بعد اِن میں سے کوئی حربہ کارآمد نہ رہا۔

اب حکومتِ برطانیہ، برطانوی پارلیمنٹ کی ایک ذیلی کمیٹی کا نام ہے۔ اگر پارلیمنٹ کابینہ کے کسی رکن کے طرزِ عمل کو شدت سے ناپسند کرے، تو سارے کابینہ کو عہدہ سے معزول کر دیا جاتا ہے، اور از سرِ نو وہ افراد منتخب کر لئے جاتے ہیں جنہیں نئے کابینہ کا رکن مقرر کرنا ہوتا ہے۔ اِس طرح سے حکومت کے انتظامی شعبہ اور مجلسِ قانون ساز میں زیادہ دیر تک اختلافِ رائے باقی نہیں رہ سکتا۔ اس نظام کے ماتحت بھی کئی اصولی، اور بعض عملی خرابیاں باقی ہیں، لیکن عام طور پر حکومت کے انتظامی شعبہ

کی کمزوری اِن خرابیوں میں شامل نہیں۔ جب تک کوئی وزارت برسرِ اقتدار رہتی ہے، اُس وقت تک اُس کی طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے، اور اُس کی کوئی فوری نگرانی بھی نہیں کی جاتی۔

ممکن ہے ہندوستان کی مجالسِ قانون ساز شاید جان بوجھ کر حکومت کے کام میں روڑے نہ اٹکاتی ہوں۔ غالبًا وہ جدید اصلاحات کو کامیاب بنانے کی خواہشمند بھی تھیں۔ بعض دانشمندانہ قوانین اِسی دوران میں وضع کیے گئے۔ کسی حد تک حکومت کو دانشمندانہ مشورے بھی دیے گئے۔ لیکن اِس نظامِ حکومت میں جو بنیادی خرابیاں مضمر تھیں، وہ زیادہ دیر تک پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ اکثر یہی ہوتا تھا کہ حکومت مجلسِ قانون ساز کی نہ سنتی تھی، اور مجلسِ قانون ساز حکومت کی پرواہ نہ کرتی تھی۔ بتدریج یہ تعطّل مستقل صورت اختیار کرتا گیا۔ دونوں ایوان حکومت پر طول وطویل اور تخریبی نکتہ چینی کرتے تھے۔ دونوں ایوانات میں ایسی ہی قرار دادیں بھی پیش کی جاتی تھیں، اور اکثر منظور بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ اِن قرار دادوں میں نفسِ مضمون سے قطعِ نظر اِدھر اُدھر کی باتیں بنائی جاتی تھیں۔ دونوں ایوانات کی کوشش یہ تھی کہ اِس قسم کی قرار دادیں منظور کر کے، اور

روپیہ منظور کرنے کی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے، حکومت کے انتظامی شعبہ کے اختیارات خود سنبھال لیں۔

حکومتِ ہند نے ہتھیار ڈال دیئے

حکومت کو جب اِس رویّہ کا سامنا کرنا پڑا، تو اُس نے تعطّل سے بچنے کی خاطر مصالحانہ رویّہ اختیار کر لیا۔ ایوان اگر سختی پسند نہ کرتا تھا، تو حکومت نے وہ تمام سخت قوانین منسوخ کر دیئے جن کے ذریعہ بُرا وقت آنے پر حکومت خود اپنا وجود قائم رکھ سکتی تھی۔ جیلوں کے دروازے کھول دئیے گئے۔ جو افسر ضرورت سے زیادہ مستعدی کا ثبوت دے رہے تھے اُن کی مذمّت کی گئی۔ ایوان اگر درآمد کی تجارت پر بھاری ٹیکس عائد کرنے کا خواہشمند تھا، تو حکومت نے ایسے ٹیکس لگانے شروع کر دیئے جن سے انگریز کارخانہ داروں اور ہندوستان کے غریب زمینداروں کو سخت نقصان پہنچا۔ ایوان اگر عسکریّت کو ناپسند کرتا تھا، تو حکومت نے اپنے فوجی انتظامات میں تخفیف کر دی۔ افغانستان کے ساتھ ایک شرمناک معاہدہ کر لیا، اور سرحد پر اپنی پالیسی تبدیل کر لی۔ ایوان اگر یورپین افسروں کو ناپسند کرتا تھا، تو حکومت یورپین افسروں کی تعریف کرنے، لیکن

ساتھ ہی انہیں زک پہنچانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ حکومت نے فوج کو بھی سراسر ہندوستانی افسروں کے ماتحت لانے کی تجویز پر عمل شروع کر دیا۔ فوج میں اس تجویز کا خیر مقدم نہ کیا گیا۔ حکومت نے انگلستان سے افسر بھرتی کر کے ہندوستان لانے کا دستور بھی پہلے کی نسبت کم کر دیا۔ سکھ مہنتوں کی جائداد ضبط کرنے اور دوسرے مذہبی اوقات کے نظم و نسق کو "باقاعدہ" بنانے کی تجاویز پر حکومت نے ہمدردی سے توجہ دینی شروع کر دی۔ حکومت نے عیسائیت کی حمایت میں سرکاری اخراجات بتدریج کم کر دئیے۔ حکومت نے خرچ کی بعض سابقہ مدات بالکل گھٹا دیں، اور بعض دوسری مدات پر بے انتہا خرچ بڑھا دیا۔ کسی محکمہ پر خرچ کا معیار یہ نہ رہا کہ اس محکمہ سے کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے، بلکہ خرچ کا معیار یہ تھا کہ کوئی محکمہ کس قدر ہر دلعزیز ہے!۔

حکومت نے جو نیا مصالحانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا، اس کی ایک مثال دینا کافی ہوگا۔ ہم اکثر سنتے ہیں کہ حکومت کو اپنے "زاویۂ نگاہ" میں تبدیلی پیدا کرنی چاہیئے، لیکن اگر "زاویۂ نگاہ" میں تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ سانپ کو رسی سمجھ لیا جائے، تو

یہ تبدیلی ضرور خطرناک قسم کی ہے :۔

بعض ہندوستانیوں اور یورپینوں پر شبہ تھا کہ وہ کچھ سامانِ حرب کی فراہمی میں حکومت کو دھوکہ دے کر ناجائز نفع کما رہے ہیں۔ مقدمہ کی تفتیش کے لئے ایک لمبی چوڑی تحقیق کی گئی۔ تحقیق کے بعد عدالت میں چارہ جوئی کا فیصلہ ہوا۔ سب سے بڑا یورپین ملزم انگلستان میں تھا۔ اِس لئے ہندوستانیوں پر تو فی الفور مقدمہ دائر کر دیا گیا، اور یورپین ملزم کو مقدمہ چلانے کے لئے انگلستان سے طلب کرنے کی خاص اجازت لی گئی۔ مقدمہ کی پہلی پیشی تھی کہ سرکاری وکیل نے اُٹھ کر کہا کہ میں حکومتِ ہند کی ہدایات کے ماتحت یہ مقدمہ واپس لیتا ہوں۔ سرکاری وکیل نے یہ بھی کہا کہ مقدمہ واپس لینے کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ بادی النظر میں مقدمہ چلانے کے لئے کافی ثبوت موجود نہیں، یا یہ کہ مقدمہ ناجائز طور پر دائر کیا گیا تھا۔ یہ ایک عجیب صورتِ حال تھی۔ یا تو ہندوستانی ملزم سچ مچ ملزم تھے۔ اس صورت میں اُن پر مقدمہ نہ چلانے کا مطلب یہ تھا کہ ایک بہت بڑے جرم کا ارتکاب کرنے والے بلاوجہ بچ جائیں۔ یا بصورتِ دیگر یہ ہندوستانی بے گناہ تھے، اور اِن کی شہرت کو بے وجہ داغ لگ

چکا تھا۔ تب بھی اُنہیں یہ داغ عدالت میں دھونے کا موقعہ ملنا چاہیئے تھا۔ اِسی دوران میں یورپین ملزم کے خلاف مقدمہ چلتا رہا۔ اس مقدمہ پر چہ میگوئیاں ہوئیں۔ اِس پر یہ راز کھلا کہ وائسرائے کی کونسل کے ایک رکن نے یہ مقدمہ سیاسی وجوہات کی بناء پر واپس لے لیا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ اِس مقدمہ سے ملک میں مالی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ ایک بہت بڑے اہم شہر میں بےچینی پھیل جائے گی۔ اِس وجہ سے اپنے ''دو دوستوں'' کے ساتھ غیر سرکاری مشورہ کے بعد اِس رکنِ کونسل نے ہندوستانی ملزموں کے خلاف مقدمہ ہی ختم کر دینا مناسب سمجھا۔

حکومتِ ہند نے بسرعتِ تمام اِس فیصلہ سے بری الذّمہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ کونسل کے جس رکن نے یہ فیصلہ کیا تھا، اُسے مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا۔ اُس رکن کے جن ''دوستوں'' نے اُس کو مقدمہ واپس لینے کا ''غیر رسمی'' مشورہ دیا تھا، اُن کا پھر کوئی ذکر سننے میں نہ آیا۔ لیکن جو بے قاعدگی سرزد ہو چکی تھی، اُس کا یہ تصفیہ تسلّی بخش نہ تھا۔ اوّل تو حکومتِ ہند بحیثیتِ مجموعی اپنے تمام اراکین کے افعال کی ذمہ دار ہے۔ اور اُس وقت تک کسی نے کبھی اِس اجتماعی ذمہ داری کا انکار نہ کیا تھا۔ جب کونسل

کے ایک رکن نے کوئی رسمی فیصلہ صادر کر دیا، تو یہ ساری کونسل کا سرکاری فیصلہ تھا۔ کونسل کے کسی رکن کے "سرکاری فعل" کو اُس کی "ذاتی خطا" قرار دے کر جان چھڑانے سے ایک ایسا راستہ کھول دیا گیا جس سے ناخوشگوار سیاسی نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی مجلس کے تمام اراکین کو ہر رکن کے فیصلہ کے لئے ذمہ دار نہیں گنا جاتا، تو پھر اجتماعی ذمہ داری کا نفاذ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اگر کونسل بحیثیتِ مجموعی ذمہ دار نہیں تو پھر وہ اپنے اراکین کی کارروائیوں پر کس طرح قابو رکھ سکتی ہے؟۔

مزید بریں شملہ میں وہ کیا فضا ہوگی، جس سے متاثر ہو کر، ایک قابل اور تجربہ کار افسر نے جس کی ساری زندگی سرکاری کاروبار میں کٹی تھی، ایسی غلطی کا ارتکاب کیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ اِن اونچے استھانوں میں بعض عجیب و غریب بتوں کی پرستش ہو رہی تھی، اس پرستش میں بعض ایسی انوکھی رسوم شامل ہو چکی تھیں، اور ایسی نرالی قربانیاں دی جاتی تھیں جن کا عوام کو علم تک نہ تھا۔

سرکاری نظام میں خلل پڑ گیا

یہ واقعہ اگرچہ ذرا زیادہ نمایاں تھا، لیکن نادر ہرگز نہ تھا۔ ایک طرف تو ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے، دوسری طرف حکومت

بغاوت کے قائدین پر مقدمے چلانے سے ہچکچا رہی تھی - اور تیسری طرف اِن قائدین کے بھڑکائے ہوئے گمراہوں سے قبرستان اور جیل بھرتے جا رہے تھے - اِن حالات میں عوام نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ جب تک کوئی شخص صاحبِ اقتدار ہے، یا برسرِ اقتدار لوگوں سے تعلق رکھتا ہے، تب تک وہ جیسا جرم چاہے کر سکتا ہے - علاوہ ازیں اب اِس امر کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ بے گناہوں کی عزت محفوظ رہے گی - اِن حالات میں لوگوں کو فرنگی کے انصاف پر بھروسہ نہ رہا، حالانکہ سلطنتِ برطانیہ کی بنیاد ہی انصاف پر قائم ہوئی تھی - اگر نظم و نسق کا نظام کمزور ہو، تو پھر بھی سلطنت بچ سکتی ہے، لیکن جب انصاف باقی نہ رہے، تو سلطنت نہیں بچ سکتی -

جہاں تک حکومت کے کارندوں کا تعلق ہے، اُن کا مستقبل اب بالکل تاریک تھا - وہ امن و امان قائم رکھنے کے ذمہ دار تھے - عدالتیں اُن سے بدگمان تھیں - اب حکومت کا انتظامی شعبہ بھی مجرموں کا ہمدرد بن چکا تھا - اِن حالات میں نظم و نسق کب تک چلایا جا سکتا ہے - سوچنا تو یہ چاہیئے کہ خود سرکاری ملازمین کی عزت اور جان کب تک محفوظ ہے - سرکاری ملازمین کے یہ خدشات جلد

ہی پورے بھی ہونے لگے - ایک ذی رتبہ افسر پر رشوت کا ذلیل بہتان لگایا گیا - اُس نے اپنی توہین کرنے والوں کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا - مقدمہ دائر کرنے سے پہلے اُس نے اپنے محکمہ سے اجازت حاصل نہ کی، کیونکہ اُسے خیال تھا کہ ایسی اجازت کی ضرورت نہیں - اُس محکمہ کے افسرِ اعلیٰ نے پہلے تو یہ مقدمہ ہی رکوانا چاہا، اور جب اِس میں ناکامی ہوئی تو مستعفی ہو گیا۔

جو کچھ ہو رہا تھا اِس کے باوجود کوئی ہرج نہ سمجھا جاتا، لیکن مصیبت یہ تھی کہ یہ اقدامات حکومت کے اقدامات نہ کہلا سکتے تھے۔ بعض حرکات تو ایسی تھیں کہ حکومت کبھی بخوشی اُن کا ارتکاب نہ کرتی، اور بعض افعال ایسے تھے کہ اگر حکومت کو انجام دینے ہی پڑتے، تو حکومت بالکل مختلف طریقے سے انجام دیتی - یہ پالیسی حکومت کی پالیسی نہ تھی۔ مجلسِ قانون ساز کی پالیسی تھی - باوجود اِس کے مجلسِ قانون ساز اس پالیسی کے لئے ذمہ دار نہ تھی، اور حکومت ذمہ دار تھی - اندریں حالات یہ بہتر ہوتا اگر حکومت مجلسِ قانون ساز کے سامنے ذمہ دار ہوتی - حکومت کو خود بھی اِس کا احساس تھا - چنانچہ جب اصلاحات کے نفاذ کو ایک سال گزر چکا تو حکومت نے بخوشی مجلسِ قانون ساز کی ایک قرارداد منظور کر لی، جس کا مفہوم یہ تھا کہ ملک کے

آئین پر فوراً نظرِ ثانی کی جائے۔ اِس نظرِ ثانی کا مقصد یہ ہو کہ مجلسِ قانون ساز کو حکومت پر زیادہ براہِ راست قابو حاصل ہو۔

حکومتِ ہند ابھی تک برائے نام حکومتِ برطانیہ کی نمائندہ اور گماشتہ تھی۔ درحقیقت حکومتِ ہند اُسی طرح ہندوستان مجلسِ قانون ساز کے اشاروں پر ناچتی تھی جس طرح اگر حکومتِ ہند کے وزراء مجلسِ قانون ساز میں سے منتخب ہوتے، تو ایوان کی اطاعت کرتے۔ موجودہ حکومت کے ارکان یہی سمجھتے تھے کہ وہ وائسرائے یا گورنر کو اُسی طرح مشورہ دیتے ہیں جیسے کسی ڈومینئن کے وزراء اپنے حاکمِ اعلیٰ کو ایوان کے منشاء کے مطابق مشورہ دیتے ہیں۔

اسمبلی اور گورنر جنرل کی کشمکش

حکومت مصالحت کے شوق میں بڑی دور نکل گئی، لیکن ابھی وہ ایک کام کرنے کو تیار نہ تھی۔ حکومت نے جن لوگوں سے مواعید کر رکھے تھے، وہ عہد شکنی کر کے اُن وعدوں کو توڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ حکومت نے راجے نوابوں سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اُنہیں دیسی اخبارات کے حملوں سے محفوظ رکھا جائے گا۔ اب جب اخبارات پر قابو رکھنے والے قوانین کی تنسیخ کی جا رہی تھی، تو حکومت نے اپنے اوپر "ترقی پسندانہ نکتہ چینی" کے دروازے کھولنے میں ایسی جلدی

سے کام لیا کہ راجے مہاراجوں پر دیسی اخبارات کے حملے روکنے کے لئے بھی حکومت کے پاس کوئی قانون باقی نہ رہا۔ مجلس قانون ساز نے یہ قانون منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً وائسرائے نے اپنے اختیاراتِ خصوصی کے استعمال سے یہ قانون نافذ کر دیا۔ تھوڑا ہی عرصہ پہلے حکومت نے ایک کمیشن اس غرض سے مقرر کیا تھا کہ سرکاری ملازمین کی حالت کے متعلق رپورٹ پیش کرے۔ ایوان تو چاہتا تھا کہ سرکاری ملازمین میں سے انگریز افسروں کا قصہ جلد از جلد پاک کیا جائے۔ اِس لئے ایوان کو کمیشن کے تقرر کی تجویز پسند نہ آئی، اور ایوان نے کمیشن کے اخراجات کی رقم منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ وائسرائے نے پھر اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لیا۔ آخری حد یہ تھی کہ سرکاری اخراجات موجودہ آمدنی سے پورے نہ ہوتے تھے۔ ایوان کو یہ ضد تھی کہ یا تو درآمد کی اشیاء پر ٹیکس لگا کر رقم وصول کرو، ورنہ ہم کوئی نیا ٹیکس منظور نہیں کریں گے۔ جب حکومت کی جانب سے ثابت کر دیا گیا کہ درآمد پر مزید ٹیکس لگانے سے آمدنی نہ بڑھے گی بلکہ اشیاء کی درآمد میں کمی واقع ہو جائے گی، تو ایوان کی جانب سے تخفیف

اخراجات کی تجویزیں پیش ہوئیں۔ خاص طور پر فوج کے اخراجات میں تخفیفِ تجویز کی گئی۔ یا کہا گیا کہ کرنسی کا معیارِ زر گرا دیا جائے۔ یا کوئی اور مالی شعبدہ بازی کی جائے۔ حکومت نے نمک پر ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کی۔ اِس میں تو کچھ شک نہیں کہ یہ ٹیکس مقبول نہ ہو سکتا تھا، لیکن اِس سے لوگوں پر کوئی سختی نہ ہوتی، اور رقم بآسانی وصول ہو جاتی۔ ایوان نے یہ بل نامنظور کر دیا۔ اب حکومت کو بجٹ میں خسارے کا سامنا تھا۔ حکومت نے آمدنی کے دیگر ذرائع کی تحقیق کی، اور کچھ دیگر تجاویز پیش کیں، لیکن ایوان مصالحت پر آمادہ نہ ہوا۔

ایوانِ اعلیٰ یعنی کونسل آف سٹیٹ کا سہارا لیتے ہوئے وائسرائے نے نمک پر ٹیکس، اپنے اختیاراتِ خصوصی سے منظور کر دیا۔ اِس سے ایوان میں بڑی خفگی پیدا ہوئی۔ بعض لوگوں نے تو وائسرائے کے فیصلہ کو خلافِ قانون قرار دیا۔ کچھ لوگ یہاں تک موشگافیاں کرتے رہے کہ وائسرائے کے اختیاراتِ خصوصی مالی قوانین پر حاوی نہیں۔ اگر واقعی وائسرائے کو مالی قوانین منظور کرنے کے اختیارات خصوصی حاصل نہ ہوتے، تو پھر اختیاراتِ خصوصی سرے سے بیکار تھے، کیونکہ جب حکومت کے انتظامی

شعبہ کو مالی قوانین نافذ کرنے کا اختیار نہ ہو، اور یہ اختیار مجلس قانون ساز کے ہاتھ میں ہو تو پھر عملاً مجلس قانون ساز حکومت کے انتظامی شعبہ پر مسلّط ہو جاتی ہے۔ کوشش کی گئی کہ ملک میں شورش بپا ہو جائے، لیکن ملک شورش پر آمادہ نہ تھا۔ حکومت کے خیر خواہ یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ ایک حد سے آگے حکومت بھی مصالحت کی خاطر جانے کو تیار نہیں۔ لیکن جن لوگوں کا خیال تھا کہ وائسرائے کے اس فیصلہ نے آئینی اصلاحات کا جنازہ نکال دیا ہے، ان کا اندازہ بھی کچھ زیادہ غلط نہ تھا۔ حکومت اس طرح نہیں چلا کرتی کہ تھوڑا تھوڑا عرصہ کے بعد کوئی بیرونی طاقت مداخلت کر کے حکومت کی دقّتوں کو حل کر جایا کرے۔ اگر یہ بیرونی طاقت ہر مداخلت کے موقعہ پر اپنے طرزِ عمل کے لئے معافی بھی طلب کرے، اور لمبی چوڑی وضاحتوں میں بھی پھنس جائے تو پھر اس طرح حکومت چلانا اور بھی مشکل ہے۔

اب ایک تعطّل رونما ہونے میں کوئی کسر باقی نہ تھی۔ تعطّل اِس طرح رد کا جا سکتا تھا کہ آئین میں ترمیم کر دی جاتی۔ آئین میں ترمیم اور اصلاح کے لئے اب صرف ایک ہی راستہ باقی تھا۔ وہ راستہ یہ تھا کہ حکومت کا انتظامی شعبہ مجلسِ قانون ساز کے سامنے اُسی

طرح ذمہ دار اور جواب دہ قرار دیا جاتا، جس طرح دیگر برطانوی مقبوضات میں ذمہ دار اور جواب دہ ہوتا ہے۔ اِس کے بعد عوام کے نمائندگان کے لئے نمک پر ٹیکس یا فوج کو ختم کر دینے کا مطالبہ کافی نہ ہوگا۔ ایوان کے ہر رکن کو علم ہوگا کہ اگر اُس کی تجویز منظور ہو گئی تو پھر اُسے حکومت بھی چلانی پڑے گی۔ فوج یا خزانہ کے بغیر حکومت چلانا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔

ڈومینین سٹیٹس

حکومت کے انتظامی شعبہ اور مجلس قانون ساز کا باہمی اختلاف صورتِ حال میں مضمر تھا۔ اس سے بچنا ممکن نہ تھا۔ اگر حکومت اور ایوان میں تصادم سے بچنا ممکن ہوتا، تو موجودہ وائسرائے ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔ کوئی مغلوب الغضب وائسرائے ہوتا تو بہت عرصہ پہلے مجلس قانون ساز سے لڑ بیٹھتا۔ اگر کوئی کمزور یا دبنے والا وائسرائے ہوتا تو ایوان نے بہت پہلے اُس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ہوتی۔ لارڈ ریڈنگ نہ تو مغلوب الغضب تھا اور نہ کسی سے دبنے والا۔ وہ ایک دانشمند، دور اندیش، منصف مزاج، اور اعتدال پسند وائسرائے تھا جو نہ تو مغرور تھا، اور نہ اپنے عزم سے ٹلنے والا۔

اُس نے تین سال تک ایسی مشکلات میں نظم و نسق چلایا جو پہلے کبھی سننے میں بھی نہ آئی تھیں۔ اگر آخر کار وہ ناکام رہا، اگر وہ کوئی برطانیہ کی حامی پارٹی پیدا نہ کر سکا، کیونکہ ایسی پارٹی کے لئے سرے سے مواد مفقود تھا، تو اُس میں اُس کا کچھ قصور نہیں۔ اگر چمچہ نہ ہو تو سالن پکانا ذرا مشکل ہے، لیکن ہانڈی ہی غائب ہو تو سالن پکے گا کس میں؟۔

غرض پنڈت جی اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے اُنہوں نے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی تھی کہ اب ہندوستان کو ڈومینین سٹیٹس کا درجہ دیئے بغیر حکومتِ ہند کا چلنا محال تھا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ اب حکومتِ ہند کا انتظامی شعبہ تعلیمیافتہ ہندوستانی طبقات پر مشتمل ہو گا، کیونکہ دونوں ایوانات پر اسی طبقہ کا تسلّط تھا۔ تعلیم یافتہ طبقات کی اِس نئی حکومت کو سوائے اپنے جھگڑالو اراکین کے اور کسی حزبِ اختلاف کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔ اگرچہ سرکاری نظم و نسق بظاہر تاج برطانیہ کے نام پر چلایا جائے گا، لیکن حکومتِ برطانیہ کو حکومتِ ہند کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہ ہو گا۔ غرض انگریز مقبوضۂ ہند سے بے دخل کئے جا چکے تھے۔

حاکم اچھے ہوں تو بدترین آئین حکومت کام دے جاتا ہے

اب صرف یہ موضوع باقی رہ گیا ہے کہ جن مسائل کا سرسری تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے، اُنہیں باہم مربوط کرکے یہ دیکھا جائے کہ ملک پر اِس فیصلہ کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ اگر اربابِ اقتدار چاہیں تو دنیا کے ہر دستورِ حکومت سے نظم و نسق چلانے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ غالباً ماضی میں جمہوریۂ روما اور زمانۂ حال میں جمہوریۂ امریکہ کے وساتیرِ حکومت عقلی لحاظ سے ناقص ترین ہیں۔ باوجود اِس کے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دونوں سلطنتیں دستورِ حکومت کے باعث بدنظمی کا شکار ہوئیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں سلطنتوں کے باشندے اپنی حکومت کو کامیاب بنانے کا عزم بالجزم کر چکے تھے۔ ہندوستان میں سرکاری ملازمین کے حلقہ سے باہر کوئی شخص شاذ و نادر ہی دستورِ حکومت کا خیر اندیش تھا۔ ہندوستان کا موجودہ دستورِ حکومت شاید سازگار حالات میں کارآمد ثابت ہوتا، اور ترقی کرکے کوئی اچھی شکل بھی اختیار کر لیتا، لیکن یہ سازگار حالات میسر نہ تھے۔

دستورِ حکومت کی موجودہ صورت نہ تو اُس نمونہ کے مطابق تھی جو حکومتِ ہند نے سرکاری طور پر منظور کیا تھا، اور نہ یہ

صورت مصنّف کے مجوّزہ خاکہ پر پوری اترتی تھی۔

کچھ دنوں دستور سازی کی وبا، وسیع پیمانے پر پھیلی رہی۔ دساتیر کے بعض عجیب و غریب نمونے پیش کئے گئے۔ بعض نمونے ایسے نادر تھے کہ اُن سے ایک اچھّا خاصہ عجائب گھر آراستہ ہو سکتا تھا، جس سے پتہ چل جاتا کہ مریض حکومتوں اور ناقص سلطنتوں کا آئین کیا کیا شکلیں اختیار کر سکتا ہے۔ جو دستور بعد میں فی الحقیقت اختیار کیا گیا، وہ اِن سب نمونوں سے جدا تھا۔ اہلِ شملہ نے جلد ہی اس نئے آئین کو قبول کر لیا، اور نومسلموں کی پختگیٔ ایمان کے ساتھ اُس پر عمل کرنے لگے۔ آج تک یہ حال ہے کہ اگر کوئی شخص اِس آئین کی کامیابی میں شک لائے تو اُسے غدّار سمجھا جاتا ہے۔ "آئین ضرور کامیاب ہونا چاہئے۔ لہٰذا موجودہ آئین کامیاب ہے"

بعض برطانوی اخبارات، بالخصوص ایسے اخبارات جو حکومت یا پارٹی کے زیر اثر تھے، اس مدح و ثنا کا وظیفہ پڑھنے میں شریک ہو گئے۔ لیکن درحقیقت سوائے دو طبقوں کے جدید اصلاحات کسی حلقہ میں ہر دلعزیز نہ تھیں۔

دیسی راجے اور نواب

ان میں سے پہلا گروہ تو ہندوستانی راجے اور نوابوں کا تھا۔

غالباً ان لوگوں کی رائے کا اصلاحات کے نفس سے کوئی براہِ راست
تعلق نہیں۔ یہ طبقہ تو بادشاہ کا وفادار تھا۔ جب اُنہوں نے دیکھا
کہ انگریز ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں، تو انہیں افسوس ہوا۔ پھر بھی
اُنہوں نے یہی کہا کہ اگر انگریز جانا چاہتے ہیں تو جائیں، اُن کی مرضی
شاید اِس کا نتیجہ اچھا ہی نکلے۔ ممکن ہے پرانے دن پھر لوٹ آئیں
کیا پتہ ہے روپے اور فوج کی طاقت سے اقتدار حاصل کرنے
کے راستے پھر کھُل جائیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ سلطنتِ ہند کا
وائسرائے یا مذہبی راہنما کوئی راجہ یا نواب نہ ہو، تختِ طاؤس
پر برہمنوں اور بنیوں، یا بنیوں اور برہمنوں کے نمائندوں کا تسلط
ہمیشہ تو نہیں رہ سکتا! اِس دوران میں وزیرِ ہند ہمارے ساتھ
جس ہمدردی کا سلوک کر رہے ہیں، ہم اُس کے لئے ممنون ہیں۔
جب سے انگریز آئے ہیں، اب پہلی مرتبہ ہمیں اپنی ریاستوں میں
کامل اختیارات حاصل ہوئے ہیں۔

مختلف راجے اور نواب اس قسم کے خیالات میں منہمک
تھے۔ بعض نے سرکار کی تقلید کرتے ہوئے، خود اپنی ریاست
میں بھی جمہوری ادارے قائم کر لئے۔ دیسی ریاستوں میں مجلسِ
قانون ساز، اور حکومت کے انتظامی شعبہ کے باہمی تعلقات تعاون

اور اتحاد پر مبنی تھے۔

ہندوستان رئیسوں کی سرزمین ہے۔ کئی رئیس بیکار، شہوت پرست، اور ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں، لیکن باوجود اُن خرابیوں کے جو اُن میں بیکار رہنے کے باعث پیدا ہو گئی ہیں، اُن میں کئی ایسی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں جو زمیندار رئیسوں کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی ہیں۔ یہ رئیس اکثر ناخواندہ ہوتے ہیں، اور خواندہ طبقات کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی نزدیک خواندگی برہمنوں، کائستھوں اور بنیوں ہی کو زیب دیتی ہے۔ وہ فوج کو اپنے شان شایاں پیشہ سمجھتے ہیں۔ حکومتِ ہند کی سوار فوج اور پیدل فوج کے افسر انہیں زمینداروں میں سے بھرتی ہوتے تھے۔ وہ خواندہ طبقات کو اپنا روایتی دشمن سمجھتے تھے۔ انگریزوں نے پڑھے لکھوں کا سحر دور کر کے، ہمیشہ اِن دلیر زمینداروں کا ساتھ دیا تھا، اور اُن کو خود اُن کی غلطیوں کے نتائج سے بچاتے ہیں ہمیشہ اُن کا ہاتھ بڑایا تھا۔ اِس وجہ سے یہ لوگ بحیثیت ایک طبقہ کے حکومت کے وفادار تھے۔ انگریزوں کے دیوانی اور فوجی افسروں سے اس طبقہ کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ یہ لوگ اپنے ہموطنوں کو کبھی اچھا نہ سمجھتے تھے، چاہے ان کا سرکاری مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔

ہاں اگر کوئی افسر خود اُن کے طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، جو کہ شاذونادر ہی ہوتا تھا، تو تب دوسری بات تھی۔

یہ رئیس یہ معلوم کر کے بھوچکے رہ گئے کہ انگریز تو جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اکثر مقامات پر یہ رئیس اقلیت میں تھے اُن کو اپنا حشر یہ نظر آرہا تھا کہ اُن کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اُنہیں اُن کے پرانے ذلیل دشمنوں کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ اُن کے طفلانہ دماغ میں یہ دلیل نہ آتی تھی کہ: "چونکہ آپ ہندوستانی ہیں، لہذا آپ کی شجاعت اور دورانِ جنگ میں وفاداری کا سہرا ہندوستان کے سر پر ہے۔ بنئے اور برہمن بھی ہندوستانی ہیں۔ اس لئے جو انعام بنیوں یا برہمنوں کو دیا جائے، گویا وہ ہندوستان کو دیا جاتا ہے۔ اِس وجہ سے نئی اصلاحات، آپ کی خدمات کے صلہ میں، آپ کا انعام ہیں۔"

ہندوستان چھوٹے چھوٹے دیہات کا ملک ہے

سارا ہندوستان چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بٹا ہوا ہے ملک میں لاکھوں گاؤں آباد ہیں۔ ہر گاؤں، چند مٹی کے جھونپڑوں، ایک دو عبادت گاہوں، چند پرانے درختوں، ایک کنویں، اور وسط میں ایک کھلے میدان پر مشتمل ہوتا ہے۔ گاؤں کے چاروں جانب

زرعی زمین، چراگاہ، اور گاؤں کی مشترکہ غیر آباد زمین پھیلی ہوتی ہے۔ کاشتکار اسی ماحول میں پیدا ہوتے ہیں، اور یہیں دفن ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کی حقیقی قوم یہ محنت کش اور باصبر لوگ ہیں، جن کی محنت سے ٹیکس ادا ہوتے ہیں، جن کے خون سے سلطنت کا گارا تیار ہوتا ہے، یا حملہ آوروں کی یلغار روکی جاتی ہے۔

کسانوں میں بھی بہت سے نقائص پائے جاتے ہیں، کیونکہ وہ آخر انسان ہی تو ہیں۔ کاشتکاری اُن کا پیشہ ہے، اور وہ جاہل بھی ہیں۔ پھر بھی بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو کسان دیانتدار اور پرہیزگار ہوتے ہیں۔ وہ چال چلن کے بھی ایسے برے نہیں ہوتے۔ بحیثیت باپ، بیٹے، اور شوہر کے وہ اپنے فرائض تن دہی اور شفقت سے ادا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں غریبوں کی امداد کے لئے کوئی ٹیکس وصول کرنے کی ضرورت نہیں۔ غریبوں ضعیفوں، اپاہجوں، اور گداگروں کے معاش کا سہارا یہی کاشتکار ہیں۔ جو لوگ کسی کاشتکار کو وفادار بنانے کے گر سے واقف ہیں، اُن کے ساتھ یہ لوگ وفادار بھی رہتے ہیں۔ کاشتکاروں میں ایک وقار بھی پایا جاتا ہے۔ مزید بریں وہ اُن لوگوں کے ساتھ باخلاق بھی پیش آتے ہیں، جو اس سلوک کے مستحق ہوتے ہیں۔

اِن کاشتکاروں میں ایک دیہاتی، اور تلخ، بذلہ سنجی کا مذاق بھی پایا جاتا ہے۔ اگر یہ طبقہ کسی قسم کی اصلاحات کو پسند کرتا، تو وہ یہ پسند کرتا کہ حکومت کا یہ پیچیدہ اور لمبا چوڑا انتظام ختم کر دیا جائے۔ اس کی جگہ ہر سب ڈویژن میں ایک تجربہ کار انگریز افسر مقرر کر دیا جائے، جسے حکومت کے تمام اختیارات سپرد ہوں۔ انگریزوں کے ابتدائی دورِ حکومت میں کاشتکاروں نے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھایا تھا، کیونکہ اِس زمانہ میں سارے ملک کے اندر زراعت شروع ہوگئی تھی۔ ہاں جو علاقے مسلسل جنگ کے باعث تباہ ہو گئے تھے، یا جہاں ملیریا سے بھرے ہوئے جنگل اُگ آئے تھے، میں اُن مقامات کا تذکرہ نہیں کر رہا۔ کاشتکار اپنی احسان مندی کا تذکرہ زبان سے نہ کر سکتے تھے، کیونکہ وہ بیچارے تو بے زبان کاشتکار تھے۔ اِن لوگوں کے نزدیک سرکار کسی عظیم، برتر از فہم، اور بے پایاں نفع رساں ہستی کا نام تھا۔ سرکار کے نظامِ حکومت اور اُس کے یورپین کارندوں پر کاشتکاروں کو طفلانہ اعتماد تھا۔ اِس اعتماد میں اُن کو مایوسی بھی شاذ و نادر ہی ہوتی تھی۔ ہندوستان کے باشندوں میں یہ طبقہ سب سے زیادہ قابلِ تعریف تھا۔ لیکن جدید آئینی اصلاحات کے ماتحت اِن

کو کچھ نہ ملا تھا۔ حتیٰ کہ ووٹ بھی حاصل نہ ہوا تھا۔ اصلاحات کے مصنفین نے یہ پاکیزہ توقّع ظاہر کی تھی کہ جدید نظامِ حکومت کے ماتحت کاشتکاروں پر ظلم ہوگا اور وہ بدنظمی کا شکار بھی ہوں گے۔ اس کے بعد اُنہیں سیاسیات میں دلچسپی لینے کا شوق پیدا ہوگا اور وہ اچھّے جمہوریت پرست بن جائیں گے۔ آج تک تو کاشتکار کبھی اچھّے جمہوریت پرست ثابت ہوئے نہیں۔ جب وہ اپنے دکھوں کا علاج کرنے پر اُتر آئیں تو وہ جمہوریت کے لمبے چوڑے نسخہ کی بجائے ایک زیادہ جلد اثر کرنے والا علاج استعمال کیا کرتے ہیں۔

سرکار کا دماغ چل گیا ہے

کاشتکار اپنے خیر خواہوں کے مذکورہ بالا عزائم سے ناواقف تھے، اور اگر واقف ہو جاتے تو شاید زیادہ خوش نہ ہوتے۔ نہ تو اُنہیں اصلاحات کی بابت زیادہ علم تھا، اور نہ وہ اُن کی پرواکرتے تھے۔ اُن کی حدِّ نظر تو زیادہ سے زیادہ ضلع کے افسر تک تھی، اور ضلع کا افسر ابھی تک کوئی انگریز ہی ہوتا تھا۔ ہاں کاشتکاروں نے یہ دیکھا کہ شورش پھیلانے والے ملک میں بھاگے پھرتے ہیں، اور کاشتکاروں کو فساد پر آمادہ

کرتے ہیں کبھی کبھی کاشتکار اِن نو واردوں کی باتیں سننے ٹھہر بھی جاتے تھے۔ شورش پھیلانے والے کہتے تھے کہ حکومت کا تختہ الٹ چکا ہے۔ آج وقت ہے کہ پرانے حساب چکائے جائیں۔ یوں کبھی کبھار خاموش، پُرامن، اور قانون کے پابند رہنے والے مزارع ایک ایسے ہجوم میں تبدیل ہو جاتے تھے جو شور مچاتا ہوا قتل کرتا پھرتا تھا، اور آگ لگاتا پھرتا تھا۔ اس کے بعد اِس ہجوم پر گولی چلائی جاتی تھی۔ یا بلوہ میں حصّہ لینے والوں کو پھانسی دی جاتی تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ خود کاشتکار قتل، یا آتشزدگی کا شکار ہو جاتا تھا، کیونکہ اُس نے اپنا ٹیکس وقت پر ادا کر دیا تھا، یا اُس کا بھائی فوج میں نوکر تھا۔ بظاہر سرکار اُس کی مدد کرنے سے عاجز نظر آتی تھی۔ عوام کے دلوں میں ہراس پھیلنے لگی "سرکار ختم تو نہیں ہوئی۔ زندہ بھی ہے، اور ہمیشہ کی طرح زبردست بھی ہے۔ البتہ سرکار کا دماغ چل گیا ہے۔"

بیچاری نیچ ذاتیں

کاشتکاروں کے ماتحت بیچاری کمین ذاتیں تھیں۔ اُن کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ برطانوی حکومت آج تک اُن کے

بھلے کے لئے کچھ نہ کرسکتی تھی۔ ہندو دھرم کا مقابلہ کرنا برطانوی حکومت کے بس کی بات نہ تھی۔ البتّہ حکومت نے اِن کمین ذاتوں کو بھی ایک فائدہ ضرور پہنچایا تھا۔ وہ یہ کہ از روئے قانون اب رعایا کے ہر فرد کو مساوی حقوق حاصل تھے، گو یہ درست ہے کہ ان حقوق کا نفاذ ہمیشہ ممکن نہ ہوتا تھا۔ حکومت نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ نیچ ذاتوں کو تعلیم دی جائے۔ سرکاری ملازمتوں میں بھی نیچ ذاتوں کو تھوڑی بہت جگہ دی گئی۔ نیچ ذاتوں پر ہندو دھرم کی بدترین سختیاں بھی بند کر دی گئیں۔ حکومت نے عوام میں اپنی ہمدردیٔ انسانیّت کے خیالات بھی خاصے پھیلا دیئے تھے۔ حکومت نے کمین ذاتوں کے لئے کنویں اور سرائیں بھی بنوا دیں، جن سے آج تک ہندوؤں نے اُن کو بے دخل کر رکھا تھا۔ قحط پڑنے پر حکومت اُن کو خوراک مہیّا کرتی تھی، اور بیمار پڑ جائیں تو اُن کے لئے مفت دوائیں اور ہسپتال فراہم تھے۔ نیچ ذاتیں سیاسیات کی کچھ سمجھ نہ رکھتی تھیں۔ اگر اُنہیں اصلاحات کے متعلق رائے قائم کرنے کی قابلیّت حاصل ہوتی، تو اُنہیں یہ معلوم کر کے خوشی نہ ہوتی کہ اُن کو پناہ دینے والے حکومت چھوڑ کر جا رہے ہیں، کیونکہ اِس کا مطلب یہ تھا کہ اُنہیں، جسمانی اور روحانی طور

پر، دونوں طرح، پھر قدیم حکمرانوں کے ظلم کا نشانہ بننا پڑے گا۔

ہندوستانی سیاست دان نرے گاؤدی ہیں

جہاں تک سیاسی مزاج رکھنے والے ہندوستانیوں کا تعلق ہے، پہلے پہل تو اعتدال پسندوں نے اصلاحات کے بڑے گن گائے، لیکن جلد ہی اُنہیں محسوس ہوا کہ یہ اصلاحات تو ناکافی ہیں۔ اعتدال پسندوں کی حقیقی پالیسی یہ تھی کہ حکومت کے ساتھ وفادارانہ تعاون کیا جائے۔ یہ ثابت کر دیا جائے کہ ہم حکومت کا کارخانہ چلا سکتے ہیں۔ اُس کے بعد یہ توقع بالکل جائز ہو گی کہ حکومت اُن کے ہاتھ سپرد ہو جائے۔ لیکن یہ اعتدال پسند بھی ذرا جلد باز تھے۔ اُن کی جلد بازیوں کا نتیجہ جلد ہی ایک تعطّل کی صورت میں رونما ہوا۔ اب اُنہوں نے بھی شور مچانا شروع کیا کہ اصلاحات تو بالکل ناکافی اور کھوکھلی ہیں۔ جب تک ہندوستان کو ڈومینیئن سٹیٹس نہیں دیا جاتا، تب تک ہندوستانی عوام کی آرزوؤں کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک منافقت کا سوانگ رچانے والے انتہا پسندوں کا تعلق تھا، اُنہوں نے بظاہر وفادار، لیکن ایک دل شکستہ دوست کا روپ دھار رکھا تھا۔ درحقیقت وہ دستورِ حکومت کے دل سے دشمن تھے۔

اُن کی خواہش تھی کہ یہ سارا نظام ہی ختم ہو جائے۔

انتہا پسندوں کی صفوں میں اب اکثر سیاسی مزاج رکھنے والے ہندوستانی شامل ہو چکے تھے۔ تجربہ سے یہ لوگ بے مثال احمق ثابت ہوئے۔ اُنہوں نے متعصّب قدامت پسند انگریزوں کا یہ مقولہ حرف بحرف ثابت کر دیا تھا کہ یہ لوگ سیاسی قابلیت سے عاری ہیں۔ انتہا پسند کہتے تھے کہ یہ اصلاحات شیطان کی اختراع ہیں۔ بھلا ہم اِس ملعون کارروائی میں کیسے حصّہ لے سکتے ہیں۔ ہم نہ تو جدید آئین کے ماتحت اُمیدوار بنیں گے، اور نہ رائے دہندگان میں شامل ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ انتہا پسندوں نے خود الیکشن میں کوئی حصّہ نہ لیا، اور اُمیدواروں اور رائے دہندگان کو دہشت زدہ اور مرعوب کرنے پر اکتفا کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ الیکشن کا میدان اعتدال پسندوں کے ہاتھ آ گیا۔ سوائے منافقت کا بھیس بدلنے والے انتہا پسندوں کے، مرکزی یا صوبائی اسمبلیوں میں انتہا پسندوں کو نیابت نہ ملی۔ اگر یہ لوگ الیکشن لڑتے تو دس میں سے آٹھ حلقہ ہائے انتخاب میں یقیناً کامیاب ہو جاتے، اور سب اسمبلیوں میں اُن کو اکثریت حاصل ہوتی۔ اِس کے بعد وہ چاہتے تو حکومت کے کام میں خلل پیدا کر کے، اور بجٹ منظور کرنے سے انکار کر کے، حکومت کا

تمام کارخانہ درہم برہم کر دیتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو بہر حال اُنہیں ڈومینئن سٹیٹس مل جاتا۔ اُن دنوں جو حالات تھے، اُن کے پیشِ نظر یہ نتیجہ مزید یقینی تھا۔ اُس کے بعد وہ جیسا چاہتے، انتہا پسندی کے پروگرام پر عمل کر سکتے تھے، یا اگر اُن عقل ہوتی تو سرکار کے ساتھ سودا بازی کر کے اُسے مجبور کر دیتے کہ اُن کے پروگرام کا غالب حصّہ خود سرکار بغیر انتہا پسندی کا نام لئے پورا کر دیتی۔ اُن کی حماقت نے اُن کے ہاتھ سے یہ موقعہ گنوا دیا۔ اب وہ اُگلے ہوئے کو نگلنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن آج وہ ایسے منظّم نہیں جیسے آج سے تین سال پہلے منظّم تھے۔ علاوہ ازیں ہندو مسلمان پھوٹ کے باعث اُن کے راستہ میں مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ باوجود اس کے اسمبلیوں میں انتہا پسندوں کے لئے جو سازگار فضا موجود ہے، اُس کے باعث یہ لوگ اقلیت میں رہتے ہوئے بھی خاصہ کام کر سکتے ہیں۔ جہاں تک اعتدال پسندوں کا تعلق ہے، چاہے وہ "سچے" اعتدال پسند ہوں، اور چاہے منافق، یہ لوگ حکومت کی حمایت میں زیادہ تردد برداشت کرنے پر آمادہ نہیں۔ اِن حالات میں انتہا پسند کبھی اصلاحات کو کامیاب نہ ہونے دیں گے۔

ہندوستانی سوداگر پیشہ

ہندوستانی تاجروں کو اس دوران میں، مسلسل کئی طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جنگ کے دوران میں چار سال تک تو انہوں نے اتنا نفع کمایا جس کی کوئی حد نہ تھی۔ اُس کے بعد اُن کو خوفناک گھاٹا پڑا۔ ہندوستانی روپیہ کی بین الاقوامی شرحِ مبادلہ میں یکلخت اُتار چڑھاؤ واقع ہوتے رہتے تھے۔ جنگ کے دوران میں کئی تھوک فروش سوداگروں نے برطانوی کارخانہ داروں سے براہِ راست سودے شروع کر دیئے تھے۔ برطانوی کارخانہ داروں کو اِس سے یہ فائدہ تھا کہ اُنہیں وہ نفع بھی حاصل ہو جاتا تھا، جو برطانوی فرمیں ہندوستان میں مال درآمد کرنے کے عوض وصول کرتی تھیں۔ اِس نفع کے بدلہ میں برطانوی کارخانہ داروں نے بڑی بڑی رقموں کا مال ادھار دینے کی سہولتیں فراہم کر دیں۔ ہندوستانی روپیہ کی بین الاقوامی شرحِ مبادلہ گر جانے سے اب ہندوستانی سوداگر برطانوی کارخانہ داروں کے ساتھ اپنے معاہدے پورے کرنے سے قاصر ہو گئے۔ ہزارہا ہندوستانی فرمیں جو ایک دو سال پہلے روپے میں کھیلتی تھیں، اب اُن کا یہ حال تھا کہ دیوالہ نکلنے کے خوف سے لرز رہی تھیں۔ یہ لوگ حکومت سے سخت ناراض تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن کی تباہی کا باعث حکومت

کی احمقانہ اور غیر دیانتدارانہ پالیسی ہے۔ ان حالات میں اگر ملک کے اندر کوئی انقلاب برپا ہو جاتا تو کم از کم یہ طبقہ اس تبدیلی سے ناخوش نہ تھا۔ غرض سوداگر پیشہ ہندوستانی انتہاپسندوں کے پروگرام کی تائید پر آمادہ تھے۔ اُن کو اصلاحات کی کوئی پروا نہ تھی چند چھوٹے درجہ کے سوداگر جو سوتی کپڑے کے کارخانوں سے دلچسپی رکھتے تھے، ضرور اصلاحات کے حامی تھے۔ وہ کسی ایسے نظامِ حکومت کی تائید پر آمادہ تھے جس کے ذریعہ بیرونی مال کی درآمد پر بھاری ٹیکس لگنے کا امکان ہو۔ اِس طرح اُن کو توقع تھی کہ جس کارخانے کے حصّے اُنہوں نے خرید رکھے ہیں، اُس کو دوگنا نفع ہوگا۔ تاجروں کی غالب اکثریت کو سیاسیات سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ وہ برطانوی سرکار سے راضی تھے، کیونکہ سرکار امن قائم رکھتی تھی، ذرائع آمد و رفت کو ترقّی دیتی تھی اور معاہدوں کی پابندی سختی سے کرواتی تھی عدالتوں کا طویل اور پیچیدہ نظام ضرور تکلیف دہ تھا، لیکن اس نظام کی یہ دشواری سوداگروں کے حق میں مفید تھی۔ جب کسی عدالت کے سامنے مقدمہ پیش ہو، تو ایک کاروباری فریق اور کسی ناخواندہ کسان یا فضول خرچ رئیس سے کون مقدمہ جیتے گا، اِس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اصلاحات کے نفاذ کے بعد بھی

عدالتوں کے نظام کی اِس خصوصیت میں کوئی فرق آنے کا خدشہ تھا۔
برعکس اِس کے، اصلاحات کے ماتحت جو لوگ برسرِ اقتدار آئے
تھے وہ سب سوداگروں کے دوست تھے۔ مثلاً یہ لوگ اکثر
وکیل تھے، جو بنئے کا دوست اور شریکِ کار ہوتا ہے۔ ہاں اصلاحات
میں ایک خرابی ایسی تھی جسے سوداگر پسند نہ کرتے تھے۔ اصلاحات
کے ماتحت ملک میں بدامنی اور بدنظمی بڑھ گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی
منڈیوں والے شہروں میں چاہے جنتا کی فوج سرکاری افسروں اور
ابلیسی حکومت پر حملے کر رہی ہو، چاہے خلافت کے غازی
روحانی طاقت کا جسمانی مظاہرہ کر رہے ہوں، اور چاہے ستیہ گرہ
کرنے والے عام ہڑتال کے اہتمام میں مصروف ہوں، اِن سب
کے پروگرام میں ایک مقبولِ عام مدّ یہ ہوتی تھی کہ بازار کو لوٹ لیا
جائے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ غریب بنیا بھی لٹ جاتا تھا، یا
اُس کے بہی کھاتے کی کتابیں موقعہ ملنے پر تباہ کر دی جاتی تھیں۔
اِس لئے سوداگر پیشہ لوگ متفقہ طور پر نئی اصلاحات کے حامی
نہ تھے۔ اُن کو سیاسیات یا جمہوریت سے کوئی رغبت نہ تھی۔ اگر
وہ نئی اصلاحات کی حمایت کرتے تھے، تو اُس کے ساتھ ہی اُنہوں
نے یہ شرط بھی لگا رکھی تھی کہ اصلاحات سے اُن کے نفع کمانے

میں کمی آئی تو پھر وہ اصلاحات کی تائید نہ کریں گے جب تک اُنہیں نفع کمانے کا موقع ملتا ہے اور ملک میں امن قائم رہے۔ وہ کسی حکومت کی حمایت پر آمادہ تھے جو برسرِ اقتدار ہو۔

پینتیس کروڑ کی "اقلیت" اور دس ہزار کی "اکثریت"

دستکار طبقہ سیاسیات سے کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا، نہ ہی اصلاحات اُن کی سمجھ میں آتی تھیں۔ اُن کو اِن اصلاحات سے کوئی فائدہ نہ پہنچا تھا۔ اُنہوں نے برطانوی راج میں بڑا فائدہ اُٹھایا تھا۔ اُنہیں خواندہ طبقات سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ وہ خواندہ طبقات کا احترام ضرور کرتے تھے لیکن اُن پر اعتماد نہ کرتے تھے۔ انتہاپسندوں کی شورش کے بعض پہلو اُنہیں ضرور پسند آتے تھے لیکن دستکار طبقہ بھی سوداگروں کی طرح برسرِ اقتدار حکومت کی تائید پر آمادہ ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ حکومت امن قائم رکھے اور خوشحالی کو ترقی دے۔

اگر بحیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو ہندوستان کی چونتیس کروڑ اور نوّے لاکھ آبادی حکومت میں کسی انقلاب کی مخالف تھی، یا کم از کم انقلاب کی خواہاں نہ تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اِن چونتیس کروڑ نوّے لاکھ کو یہ علم بھی نہ تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ باقی دس لاکھ میں سے آٹھ لاکھ کے قریب کم و بیش انتہاپسندوں کے کھلے

حمایتی تھے۔ اِس وجہ سے اُن کے نزدیک اصلاحات شیطان کی اختراع تھی۔ باقی دو لاکھ کو اعتدال پسند پارٹی سمجھنا چاہیئے۔ اِن میں سے ڈیڑھ لاکھ تو منافق اور دراصل انتہا پسند تھے، جنہوں نے اعتدال پرستی کا بھیس بدل رکھا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ شعوری طور پر اُن کو اپنے بھیس بدلنے کا احساس تھا یا نہیں۔ چالیس ہزار کے قریب یہ شور مچا رہے تھے کہ یہ اصلاحات ناکافی ہیں، اور فی الفور مزید دستوری تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اس طرح دس ہزار ہندوستانی جن میں عورتیں بھی شامل ہیں، ایسے بچتے تھے، جو اصلاحات کی موجودہ صورت میں اُن کی حمایت پر کمربستہ تھے۔ یہ حمایت بھی اس وعدہ سے مشروط تھی کہ آئندہ اِن اصلاحات میں مزید توسیع ہوگی۔

ذرا غور کیجیئے پینتیس کروڑ کی آبادی میں دس ہزار کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہیں ہاں یہ درست ہے کہ یہ اقلیت بھی اپنی پالیسی پر عمل کروا سکتی ہے۔ انقلابات ہمیشہ اقلیتیں ہی بپا کرتی آئی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انقلاب چھوٹی سی اقلیت ہی بپا کر سکتی ہے۔ جب برطانیہ میں انقلاب آیا تھا تو رائے دہندگان کی تعداد، عام باشندوں کے مقابلہ میں بہت کم تھی، اور اِن رائے دہندگان میں سے بھی مخلص وہگ تو آٹے میں نمک برابر نہ ہوں گے۔ سنہ ۱۷۷۶ء میں امریکہ کی انقلابی پارٹی وہاں کے باشندوں

کی اکثریت پر مشتمل نہ تھی۔ انقلابِ فرانس کے حامی ایک معمولی ٹولی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ باوجود اِس کے یہ سب پارٹیاں برسرِ اقتدار آئیں، اور اُنہوں نے اپنی پالیسی پر عمل بھی کروایا، کیونکہ ملک اُن کے پیچھے چلنے پر تیار تھا۔

قوم کی اکثریت شاید پارٹی کی پالیسی واضح طور پر نہ سمجھ سکتی تھی، اور جس حد تک سمجھتی تھی، شاید تمام و کمال قبول نہ کرتی تھی، لیکن اُنہیں یہ یقین تھا کہ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں بنیادی طور پر ٹھیک ہے۔

نیم فرنگی بابو

ہندوستان میں اصلاح چاہنے والے بظاہر صاحبِ رسوخ تھے۔ یہ اصلاح چاہنے والے انتہا پسند، اور اُن کے ساتھ منافق انتہا پسند وکالت خانوں میں بھرے پڑے تھے۔ ملک کے باوقار اخبارات پر اُن کا قبضہ تھا۔ وہ صاف انگریزی بول سکتے تھے۔ اُنہیں تازہ ترین سیاسی خیالات پر عبور تھا۔ اِس وجہ سے وہ برطانوی قوم کے سامنے ہندوستان کی ترجمانی کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ حکومتِ برطانیہ کو بظاہر کوئی علم نہ تھا کہ اِن لوگوں کے علاوہ کسی دوسری قسم کے ہندوستانی بھی موجود ہیں

لیکن ہندوستان کی ترجمانی کے یہ مدعی جس وصف سے محروم تھے، اور جس وصف سے محروم ہونے کے باعث اُن کے باقی تمام اوصاف بے حقیقت تھے، وہ خامی یہ تھی کہ اُن کو ملک میں کوئی رسوخ حاصل نہ تھا۔ ہندوستانیوں کی غالب اکثریت کو یا تو ان لوگوں کے وجود کا علم ہی نہ تھا، اور یا وہ اِن کو دوغلے اور قوم کے دشمن سمجھتے تھے۔ عوام کہتے تھے کہ اگر برطانیہ کا راہِ راست راج ختم ہی ہونا ہے تو ہم ایسے لوگوں کو اپنا لیڈر کیوں بنائیں جو خیالات، عادات اور پروگرام کے لحاظ سے نیم فرنگی ہیں۔ "ہم تو قومی اعتقادات کو دوبارہ زندہ کریں گے' اور قومی لیڈروں کے پیچھے چلیں گے"۔ اعتدال پسندوں کو خوب علم تھا کہ ملک میں اُن کا کوئی رسوخ نہیں۔ اُنہوں نے انگریزوں سے جو سودا چکایا تھا وہ اُس کی قیمت ادا کرنے سے قاصر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اعتدال پسند یہ غوغا مچاتے تھے کہ برطانیہ نے اُن سے عہد شکنی کی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ انتہا پسند تحریکوں کو خطرناک سمجھتے ہوئے، اور اُن سے کوئی حقیقی ہمدردی نہ رکھتے ہوئے بھی اُن سے جوڑ توڑ کرتے رہتے تھے۔ ایسے "مجاہدین" کی امداد سے قلعہ کو تاریکی کی فوجوں کے حملہ سے بچانا ممکن نہ تھا۔ غالب امکان

تو یہ تھا کہ قلعہ کی فوج خود ایک روز دشمن سے مل جائے گی۔ بغاوت کے جھنڈے بلند کر کے قلعہ کے دروازے فتحمند محاصرین پر کھول دیئے جائیں گے۔

انگریز سرکاری ملازمین کو جُل دیا گیا

اِس دوران میں برطانیہ کے گماشتے کیا کر رہے تھے؛ انگریز سرکاری ملازمین نے اصلاحات کو سچے دل سے قبول کر لیا تھا۔ بعض افراد کو گہرے شکوک و شبہات ضرور محسوس ہوتے تھے، اور بعض کا یہ بھی خیال تھا کہ اِن اصلاحات پر عمل کر کے وہ امانت میں خیانت کر رہے ہیں، کیونکہ سیاست سے ناآشنا ہندوستانی عوام، انگریز سرکاری ملازمین ہی کو اپنی حفاظت اور اپنے مفاد کی نگہداشت کا امانت دار سمجھتے تھے۔ لیکن انگریز سرکاری ملازمین کی دقّت یہ تھی کہ وہ نافرمانی اور افسرانِ بالا سے غدّاری کیے بغیر اپنے خیالات ظاہر نہ کر سکتے تھے۔ مزید بریں پالیسی کے عام اصول وضع کرنا اُن کے فرائض میں داخل بھی نہ تھا۔ جن مدبرین نے یہ اصلاحات نافذ کی تھیں وہ سرکاری ملازمین کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ کئی دفعہ کھلا اعلان کیا گیا کہ نئی اسکیم کی حمایت کرنے والے سرکاری ملازمین کو مناسب انعام بھی

ملے گا۔ یہ تو سب مانتے تھے کہ اصلاحات کے بعد سرکاری ملازمین میں ہندوستانیوں کا تناسب پہلے سے بڑھ جائے گا۔ کارفرما اور کارکن دونوں اقسام کے سرکاری ملازمین میں ہندوستانیوں کا تناسب بڑھے گا۔ لیکن بار بار یقین دلایا جاتا تھا کہ یہ تبدیلی بتدریج ہوگی۔ اس وجہ سے موجودہ ملازمین کے حقوق میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ سب پارٹیوں کو اقرار تھا کہ سرکاری ملازمین کے تعاون کے بغیر اصلاحات کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ یہ تو ایک مسلّمہ اصول سمجھا جاتا تھا کہ نظم و نسق میں برطانوی ملازمین کو عنصر کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ شامل رہے گا۔ سرکاری ملازمین کی اکثریت ان مواعید پر سچ مچ یقین کر بیٹھی۔ اُن کی یہ سادہ لوحی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ نئے حالات میں کام کرنے کے قابل نہ تھے۔ اُن کی سادہ لوحی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اُس مکّار جانور کی فطرت سے واقف نہ تھے جس کا نام "سیاستدان" ہوتا ہے۔ اِس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ فطرتِ انسانیہ اور ہندوستانیوں کی طبیعت سے بھی ناواقف تھے۔ جلد ہی ثابت ہو گیا کہ نئے دستور کے ماتحت سرکاری ملازمین میں انگریزوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ جس نظریہ پر موجودہ نظام قائم تھا، اُس میں

انگریز سرکاری ملازمین کے لئے کوئی جگہ ہونی بھی نہ چاہئے تھی۔ ایک انگریز حکمران کے ماتحت، انگریز سرکاری ملازمین ہو سکتے تھے۔ ایک انگریز حکمران کے ماتحت، ہندوستانی ملازمین بھی ہو سکتے تھے۔ ہندوستانی حکمرانوں کے ماتحت ہندوستانی ملازم ہو سکتے تھے۔ یہ سب صورتیں کسی حد تک معقول ہیں۔ لیکن ہندوستانی حکمرانوں کے ماتحت، انگریز سرکاری ملازمین کام کر سکیں، یہ تو بالکل ناقابلِ تصور تھا۔ اگر ہندوستانیوں میں اتنی قابلیت ہے کہ وہ حکمران بن سکتے ہیں تو یقیناً اُن میں یہ قابلیت بھی ہونی چاہئے کہ وہ اپنی صفوں میں سے سرکاری ملازم چن سکیں اگر وہ نظم و نسق کے ادنیٰ اور غیر اہم مناصب پُر کرنے کے قابل نہیں تو حکمرانی کی مسند پر بیٹھنے کے اہل کیونکر ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان میں اب جو پارٹی برسرِ اقتدار تھی، وہ اِس حقیقت سے بخوبی واقف تھی۔ علاوہ ازیں یہ امر انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ خود اپنی کمزوری کا اعتراف کر لیا جائے۔ اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ ہندوستانی خود تسلیم کر لیتے کہ انگریزوں کو بدستور ملازم رکھنے کی کوئی ضرورت باقی ہے۔ مزید بریں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انسانوں کا کوئی گروہ خوشی سے یہ برداشت کرے کہ جو تنخواہ اور اقتدار خود اُن کے اساکین یا قریبی رشتہ داروں کو مل سکتے ہیں اُن پر اجنبیوں کا تسلط رہے۔

رہی یہ بات کہ فرنگی رین بسیرا کرنے والی چڑیاں ہیں جن کا یہاں کوئی رشتہ دار نہیں اور اِس وجہ سے وہ سب کے ساتھ غیر جانبداری کا سلوک کریں گے، تو ہندوستانیوں کو غیر جانبداری کی کچھ ایسی خواہش نہیں! یہ تو سب مانتے تھے کہ انگریز بالعموم رشوت خور نہیں ہوتے، لیکن ہندوستانیوں کے نزدیک مالی دیانتداری کے علاوہ بعض دوسری ایسی خصلتیں بھی ہیں جن کی زیادہ وقعت ہونی چاہیئے۔ رشوت نہ لینا اگر کوئی خوبی ہے، تو ایک خشک اور منجمد سی خوبی ہے۔

ہندوستانی دیانت سے زیادہ رعایت کے طالب ہوتے ہیں

انگریز سرکاری ملازمین میں ہمدردی کا جذبہ نہ تھا۔ ہندوستانیوں کی اصطلاح میں اِس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے فرض پہ سختی سے ڈٹا رہے، تو یہ ہمدردی کے فقدان کی نشانی ہے۔ "ہمدردی نہ ہونے کے باعث انگریز افسر جو کرنے پر تُل جائیں، پھر اُس سے ٹلتے نہیں۔" علاوہ ازیں منافقت کا چولہ پہننے والے انتہا پسند ہندوستان کے فرنگی افسروں کو اُسی نگاہ سے دیکھتے تھے جس طرح ملک شام کے مسلمان، عیسائی بانکوں اور مذہبی پیشواؤں کی پرانی ٹولیوں کو دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "اگر ہمیں اِن فرانسیسی

شیطانوں سے نجات مل جائے تو ہم فرانس کا راج آنکھ جھپکنے میں ختم کر دیں"۔ اس میں شک نہیں کہ انگریز افسر ہندوستان میں ملازمت اختیار کرتے تھے تو حکومتِ ہند کے ماتحت بھی ہوتے تھے لیکن ملازمت کے وقت اُن کا معاہدہ تاجِ برطانیہ سے ہوتا تھا۔ حکومتِ ہند بہر حال تاجِ برطانیہ کی گماشتہ اور کارندہ تھی۔ اس لئے سول سروس کے انگریز ملازمین اپنے آپ کو کسی مشرقی حکومت کا ملازم نہ سمجھتے تھے، بلکہ اپنے آپ کو ایک بیرونی تمدن کا نائب خیال کرتے تھے۔ اس وضع کے لوگ انتہا پسندوں کی جماعت کے انتہائی مقاصد کے راستہ میں سخت رکاوٹ ثابت ہو سکتے تھے۔ ایسے کارندے کسی ایسے نظامِ حکومت کے لئے موزوں نہ تھے جو اب مشرقی ڈھنگ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ نیا حکمران طبقہ ہندوستان میں انگریز سرکاری ملازمین سے خوشگوار تعلقات نہ رکھ سکتا تھا۔ ابھی چودہ سال ہی تو گذرے تھے کہ حکومتِ برطانیہ نے کانگرس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا، اور اُس وقت سے حکومتِ ہند کو بھی مجبوراً کانگرس کا خیر خواہ بننا پڑا تھا، ورنہ اِس سے پہلے تو کانگرس اور سرکار میں اینٹ کتے کا بیر ہوا کرتا تھا۔ کئی دفعہ تصادم کی نوبت آئی، اور حکومت کو نرمی سختی دونوں سے ہی

کام لینا پڑتا رہا۔ جب کبھی سختی کی نوبت آئی تو سرکاری ملازمین نے ہی سختی کا سلوک کیا۔ کئی افراد جو اب برسرِ اقتدار تھے، ماضی میں کسی انگریز مجسٹریٹ، یا پولیس کے کانسٹیبل کے سامنے گڑگڑا کر معافیاں مانگ چکے تھے، یا امداد کی درخواستیں کرتے رہے تھے۔ بھلا اُن کے دل سے اپنی اس ذلّت کا میل اب کبھی نکل سکتا تھا؟

ہندوستانیوں میں ایک عجیب وضع کا کھلاڑیوں جیسا جذبہ پایا جاتا ہے۔ انہیں یا اُن کے دوستوں کو جو افسر جائز سزا دے اُس کے خلاف اُن کے دل میں ذاتی دشمنی کا جذبہ شاذ و نادر ہی پیدا ہوتا ہے۔ پھر بھی جن ہندوستانیوں کو یوں صدمہ پہنچتا تھا، وہ طبعاً اُس نظام کو تو ہرگز پسند نہ کر سکتے تھے جس کے ماتحت اُنہیں یہ تکلیف پہنچتی تھی۔ اِس وجہ سے وہ اُن لوگوں کو بھی ناپسند کرتے تھے جو اِس نظام کو چلاتے تھے۔

آئی۔ سی۔ ایس کو حکومت پر اعتماد نہ رہا تھا

جلد ہی حکومت پر ثابت ہو گیا کہ رائے عامہ کو خوش کرنے، عوام کے اندر مقبولیّت حاصل کرنے، وسعتِ قلب و نظر اور صحیح تدبّر کا ثبوت دے کر ہنگامی واہ واہ کرواتے کا اِس سے زیادہ آسان طریقہ اور کوئی نہیں کہ انگریز سرکاری ملازمین کو ذلیل کیا جائے، یا اُن کو

بُرا بھلا کہا جائے۔

جہاں کہیں موقعہ ملتا تھا موزوں ہندوستانیوں کو سرکاری عہدوں پر فائز کر دیا جاتا تھا۔ جن ملازمتوں پر قانوناً صرف آئی۔سی۔ایس کے انگریز افسر مقرر کئے جا سکتے تھے، اُن کی بابت حکومت نے یہ قرار داد اصولاً تسلیم کر لی کہ یا تو ایسے عہدے منسوخ کر دیئے جائیں گے، یا اُن کے تقرر کے متعلق قانون بدل دیا جائے۔ یہ تو صاف نظر آ رہا تھا کہ مجلسِ قانون ساز کا منشاء یہ ہے کہ آئی۔سی۔ایس کے ملازمین کو محض سرکاری کارندے بنا دیا جائے، اور سرکاری کارندے بھی ایسے جن کی تنخواہ حقیر ہو، اور جن سے اچھا سلوک بھی نہ کیا جاتا ہو۔ واضح طور پر نظر آ رہا تھا کہ جیسے جیسے اصلاحات ترقی کریں گی، اور مجلسِ قانون ساز کو حکومت کے انتظامی شعبہ پر کامل تسلط حاصل ہوگا، توں توں انگریز سرکاری ملازمین کے لئے ہندوستان میں کوئی جگہ نہ رہے گی۔

اِس کے بعد حکومت نے ایک گشتی چِٹھی جاری کی جس سے بالکل کھلے طور پر ثابت ہو گیا کہ آئی۔سی۔ایس میں فرنگیوں کی بھرتی بند ہونے والی ہے۔ اب ایسی گشتی چِٹھی کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ بغیر ایسی ہدایات کے بھی اب انگلستان میں آئی۔سی۔ایس

کے لئے اُمیدوار نایاب تھے۔ آئی۔سی۔ایس کی ملازمت میں کبھی بڑی کشش ہوا کرتی تھی۔ سالانہ خالی آسامیوں کو پُر کرنے کے لئے جو امتحاناتِ مقابلہ منعقد ہوتے تھے، اُن میں اُمیدواروں کی کثیر تعداد حصّہ لیا کرتی تھی۔ لیکن اب خالی آسامیاں زیادہ تھیں اور اُمیدوار کم۔ وزیرِ ہند کو کئی دفعہ مجبور ہو کر اپنے اُن اختیاراتِ نامزدگی سے کام لینا پڑا، جو جنگ کے دوران میں خاص طور پر اُس کو سونپے گئے تھے۔ جنگ کے بعد فوج سے نکالے ہوئے ایسے افسروں کی کمی نہ تھی جو بھوکے مرنے کے بجائے کوئی ملازمت قبول کرنے پر آمادہ تھے۔

اب کسی انگریز آئی۔سی۔ایس افسر کو اپنے حکمرانوں پر اعتماد نہ رہا تھا۔ افسر خوب جانتے تھے کہ حکمران تھوڑی سی عارضی ہردلعزیزی حاصل کرنے کی خاطر اپنے افسروں کو بخوشی قربان کر دیں گے۔ اگر حکمران اپنے افسروں کی جنبہ داری بھی کریں تب بھی اس کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ ایسی جنبہ داری کارگر ثابت ہوگی۔ مثال کے طور پر قانون ہدایت کرتا ہے کہ چور کو گرفتار کیا جائے۔ کوئی افسر کسی شخص کو چور سمجھ کر گرفتار کر لیتا ہے۔ چور کے تعلقات وسیع ہیں۔ تھوڑا ہی عرصہ بعد اِس افسر کا کارنامہ سلطنت کا

ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بن جاتا ہے۔ مجلس قانون ساز میں قرار دادیں منظور ہونے لگتی ہیں، کہ افسر پر مقدمہ چلایا جائے اور اُس کو برخاست کر دیا جائے۔ یا ایک دوسری مثال لیجئے۔ کوئی افسر کسی بارسوخ آدمی کو قتل کی سازش میں شریک سمجھتا ہے۔ اُس کے خلاف مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ تھوڑی ہی مدت بعد اُلٹی آنتیں گلے پڑنے لگتی ہیں۔ ملزم کی پیٹھ ٹھونکنے کو ایسے لوگ آدھمکتے ہیں۔ جن کا حکومت میں بڑا رسوخ ہے۔

ان حالات میں عقل کا راستہ یہ ہے کہ تنخواہ وصول کی جائے، کاغذوں کی خانہ پُری کر دی جائے۔ دنیا جس راستہ پر چلتی ہے، اُسے چلنا دیا جائے، اور اُس وقت تک کوئی قدم نہ اٹھایا جائے جب تک بالائی حکام کی جانب سے تحریری احکام موصول نہ ہوں۔ اس قسم کی ملازمت میں قابل اور باضمیر لوگ کوئی کشش محسوس نہیں کیا کرتے۔

اب آئی سی۔ایس کا مشاہرہ بھی معقول نہ تھا

علاوہ ازیں اب آئی۔سی۔ایس کی تنخواہیں بھی کچھ ایسی منفعت بخش نہ تھیں۔ سوائے آئی۔سی۔ایس کے ہندوستان میں سرکاری ملازمین کی تنخواہیں کبھی فراواں نہ تھیں۔ اور اب تو آئی۔سی۔ایس کی جیب

بھی ہلکی تھی۔ کئی افسروں کی بڑی گت بنتی تھی۔ دیوالہ تو سب کا نکلا ہوا تھا، لیکن جو بدقسمت شادی کے جرم کا ارتکاب اور بچے پیدا کرنے کی حماقت سرزد کر چکے تھے، اُن کا تو برا حال تھا۔

سنہ ۱۸۶۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۱۳ء تک اِن افسروں کی تنخواہیں یکساں رہی تھیں۔ اُس کے بعد اشیا کی گرانی کا لحاظ رکھتے ہوئے، اُن کی تنخواہوں میں تھوڑا بہت اضافہ کیا گیا۔ اُس کے بعد ایک تو جو کچھ دائیں ہاتھ سے دیا گیا تھا، بائیں ہاتھ سے واپس لے لیا گیا۔ علاوہ ازیں سنہ ۱۹۱۳ء کے بعد اشیاء کی قیمتوں میں جو غیر معمولی گرانی پیدا ہو چکی تھی، اُس کا کوئی خیال نہ کیا گیا۔ ہر محکمہ تنخواہ میں ترقی کا رونا رو رہا تھا۔ ہندوستانی سرکاری ملازمین کو بڑی بڑی رعائتیں دی گئیں۔ لیکن یورپین افسروں کے لئے کچھ نہ کیا گیا۔

انگلستان میں سرکاری ملازمین کو وہٹلے کمیشن کی سفارشات کے مطابق سنہ ۱۹۱۳ء میں جو رعائتیں دی گئی تھیں، وہ تو ہندوستان میں ناممکن تھیں، کیونکہ قانون اور قواعد کی "ہمدردانہ تعبیر" کرتے ہوئے سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے وغیرہ کی تجاویز مجلس قانون ساز کے فیصلے کی پابند کر دی گئی تھیں، اور مجلس قانون ساز کسی صورت انگریز سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں کوئی اضافہ کرنے پر آمادہ نہ تھی تنخواہیں

بڑھانے سے عوام میں شور مچ جاتا۔ اس وجہ سے حکومت نے کہہ دیا کہ اِس میں تو شک نہیں کہ اصولاً انگریز افسر بھی اتنی تنخواہ کے حقدار ہیں جس سے اُن کا گذارہ چل سکے، لیکن قانوناً یہ افسر سرکار کو اُس سے زیادہ تنخواہ دینے پر مجبور نہیں کر سکتے جس کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ لہذا سرکار سختی سے معاہدہ کی شرائط کی پابندی کروائے گی۔ اگر کوئی سرکاری افسران شرائط سے راضی نہیں تو وہ ملازمت ترک کر سکتا ہے۔

انگریز سرکاری ملازمین سے ناانصافی

آئی۔سی۔ایس کے نوجوان انگریز افسروں نے جن کی ہمتیں ابھی جوان تھیں، اور سر پر بیوی بچوں کا بوجھ بھی نہ تھا، یہ سوچا کہ ہم حکومت سے بیوفائی کا الزام سر پہ لئے بغیر، ملازمت کیوں نہ ترک کر دیں جب حکومت کو ہماری خدمات کی ضرورت ہی نہیں۔ چنانچہ انھوں نے تھوڑی پنشن لے کر ملازمت چھوڑنے کی درخواستیں دی۔ حکومت بالآخر یہ درخواستیں قبول کرنے پر راضی ہو گئی، لیکن اِس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی گئی کہ ہر ملازمت چھوڑنے والا افسر باقرارِ صالح یہ اعلان کرے کہ میں بدلے ہوئے حالات میں اپنے آپ کو ملازمت کے ناقابل سمجھتا ہوں۔ یہ اقرار کرنے کے بعد حکومت غور کرے گی

کہ آیا کسی افسر کو ریٹائر ہونے کی اجازت دی جائے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اقرار کرنے کے بعد اگر کسی افسر کو ریٹائر ہونے کی اجازت نہ ملے، تو دورانِ ملازمت میں اُس کی کیا حیثیت رہ جائے گی، جب وہ خود اقرار کر چکا ہے کہ میں ملازمت کے ناقابل ہوں۔

حکومتِ ہند کی اِن حرکتوں سے آخر برطانوی رائے عامہ کا وہ جذبۂ انصاف بیدار ہو گیا جو کچھ عرصہ سے سویا پڑا تھا لیکن مرا کبھی نہ تھا۔ باوجود حکومتِ ہند کی مخالفت اور ہندوستانی سیاستدانوں کے تلخ احتجاج کے حکومتِ برطانیہ نے مداخلت کر کے انگریز سرکاری ملازمین کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک خاص کمیشن مقرر کر دیا۔

غیر ملکی حکومت کے ساتھ ہی غیر ملکی سرکاری افسر بھی چلے جائیں گے

میں اِس کمیشن کی رپورٹ شائع ہونے سے قبل اُس پر کوئی رائے زنی نہیں کرنا چاہتا، لیکن مجھے یقین ہے کہ بحالاتِ موجودہ ہندوستان کے سرکاری ملازمین میں انگریزوں کو شامل رکھنا ناممکن ہے، اور نامناسب بھی۔ اگر ہندوستان نے آزاد ہو کر ڈومینین سٹیٹس حاصل کرنا ہے، تو اُسے یہ بھی اختیار حاصل ہونا چاہیئے کہ خود اپنے سرکاری ملازمین بھرتی کرے۔ ہندوستان یہ واضح کر چکا ہے کہ وہ یورپین افسروں

کو ملازم نہیں رکھنا چاہتا- آزاد ہندوستان کو انگریزہ سرکاری ملازمین رکھنے پر مجبور کرنا کوئی معقولیت کی حرکت نہ ہوگی - اگر ہندوستان کو انگریزہ ملازمین رکھنے پر مجبور کر بھی دیا گیا، تو اُن سے حُسن سلوک، اور مناسب معاوضہ دینے پر کون مجبور کر سکتا ہے- اگر ہندوستان انگریز ملازمین کی ضرورت محسوس کرے تو اُسے اُن سے براہ راست معاوضے کرنا چاہیئے- اِس کا امکان بہت کم ہے کہ ہندوستان کوئی ایسی ضرورت محسوس کرے- ہندوستان خود معاہدے کر کے، اُن معاہدوں کو پورا کرنے کا زیادہ پابند ہوگا- اور اگر اُس نے ایسا کوئی معاوضہ توڑا تو اُس کی ذمہ داری اُس کے کندھوں پر ہوگی، نہ کہ تاجِ برطانیہ کے سر پر-

اندریں حالات میرا خیال ہے کہ پنڈت جی کا پروگرام جلد ہی پورا ہونے والا ہے- غیر ملکی حکمران اور غیر ملکی سرکاری عملہ دونوں کا عنقریب خاتمہ ہو جائے گا- اقتدار کے یہ دونوں ذریعے ایسے ہاتھوں میں آجائیں گے جن کا سلوک پنڈت جی سے بہتر ہوگا- میں یہ نہیں کہتا کہ پنڈت جی زیادہ عرصہ برسرِ اقتدار رہ سکیں گے- دنیا اُس زمانہ سے بہت آگے نکل آئی ہے، جب رشی دنیا پر حکومت کیا کرتے تھے- آج دنیا اُس کی

ہے جس کے پاس لشکر ہو۔ بہر حال ہندوستان کے مستقبل کی فکر کرنا انگلستان کے ذمّہ نہیں۔

باب نہم

موت

دنیا میں سوائے ایمان کے کچھ باقی نہیں رہتا

ماضی سے کیا سبق حاصل کیا جا سکتا ہے؟ میرے خیال میں کئی عبرت ناک سبق حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ سبق کچھ نئے بھی نہیں! مصنوعی چیزیں گھس پٹ جاتی ہیں۔ جاندار اشیاء کھپ جاتی ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ اگر ایمان کمزور ہو تو ارادہ زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا، اور جب ارادہ کمزور ہو جائے تو ہاتھ پاؤں مارنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ روحانی طاقت کے ذریعہ بڑے سے بڑے مضبوط قلعے تسخیر کئے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی راج کا خاتمہ اِس لئے ہوا کہ اِس کے مقابلہ میں ایمانی

قوتیں کام کر رہی تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان طاقتوں سے کام لینے والوں کی نیتیں ٹھیک نہ تھیں، لیکن اُن کا عزم غیر متزلزل تھا۔ اس ایمان اور عزم کے مقابلہ میں برطانیہ کے پاس سوائے مادی قوت اور ادھورے اعتقاد کے اور کچھ نہ تھا۔ انگریزنہ عزم کے مقابلہ میں عزم، ایمان کے مقابلہ میں ایمان، اور خدا کے مقابلہ میں اپنا کوئی معبود پیش نہ کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے ہندوستان میں انگریز کا راج ختم ہو گیا!۔

ہائے! کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ راج ایک عظیم الشان لڑائی کے بعد کسی زبردست شکست کے نتیجہ کے طور پر ختم ہوتا۔ افسوس تو یہ ہوتا ہے کہ یہ راج رات کے اندھیرے اور چوبارے کی آڑ میں، ٹھگوں کی کٹار کا شکار ہو گیا۔ مشرق کے شہنشاہوں کی شاندار اور خونین شہادتیں مغرب کے قیاصرہ کے حسرتناک اور خاموش انجام سے بدرجہا زیادہ قابلِ ترجیح ہوتی ہیں!

جو لوگ بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں اور قبروں میں دفن ہو جاتے ہیں، وہ تو پھر شاید حشر کے روز ہی بیدار ہوں گے!!! ایک بادشاہ اپنی موت مر گیا تو دوسرا اُس کے تخت پر بیٹھ جائے گا۔ لیکن جو تاجدار دھوکے سے قتل کر دیئے جائیں

اُن کی روح فلک بوس مقبروں کے اندر بھی بے چین رہتی ہے
اُن کے بھوت قبرستان سے بھٹکتے ہوئے، زندوں کی بستیوں
کے کوارڑ کھٹکھٹانے باہر نکل آیا کرتے ہیں، اور کبھی کبھی جون بدل کر
نئے سروں سے قرنا بھی پھونک دیا کرتے ہیں! مقتول بادشاہوں
کا انتقام خوفناک ہوتا ہے، اور اُن کی روح کی طاقت کا مقابلہ
کوئی نہیں کر سکتا۔ کاش کوئی شخص آج بھی جولیس سیزر کی نعش
کو منظرِ عام پر لا کر رکھ دے تاکہ سب کو پتہ چل جائے کہ
سیزر واقعی فریب کے خنجر کا شکار ہو کر مر چکا ہے۔ کاش مقبوضہ
ہند کے جنازہ پر بھی کوئی انٹنی آخری مرثیہ پڑھ دے۔ تب جھوٹ
کے بادل چاک ہو جائیں، اور دنیا سچ کا منہ دیکھ سکے۔ سیاسیات
میں دروغ گوئی کے خاصے فائدے ہیں، لیکن بالآخر اِس سے
نقصان ہی پہنچتا ہے۔

کبھی راج سنبھالنا بھی جائز ہو سکتا ہے، اور کبھی راج
تیاگ دینا بھی کارِ ثواب ہو سکتا ہے، لیکن راج کے فرائض
تیاگ کر، راج کا مکٹ سر سے نہ اتارنا، یا راج کے لابھ کا
لوبھ رکھنا، کوئی بھلی بات نہیں۔

بدزبانی ہمیشہ بدچلنی کا شیوہ ہوتی ہے

یہ خیالات عام ڈگر سے ذرا مختلف ہیں۔ اور اس وجہ سے جو کوئی ایسے خیالات ظاہر کرے اُسے بوسیدہ دماغ کہا جاتا ہے۔ انگلستان میں فی زمانہ "بوسیدہ دماغ" کہلانا تعریفی کلمہ سمجھا جاتا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس خطاب کا مستحق نہیں سمجھتا۔ اگر مجھے شہید مشہور کر بھی دیا گیا تو میں ایک زرد رو شہید ثابت ہوں گا۔ میں تاریخ کی نامور ہستیوں جیسی شہرت حاصل کرنے کا کوئی شوق نہیں رکھتا۔ عزت، استقلال، وفاداری اور دلیری میں سوائے نام کے کیا رکھا ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ کوئی دانشمند اپنے نفع یا اپنی پارٹی کے فائدہ کی خاطر کمینہ سے کمینہ حرکت کے ارتکاب سے دریغ نہ کرے گا۔ میں جانتا ہوں کہ ضد کرنا کیسی بری عادت ہے اور ثابت قدمی محض ایک دھوکہ ہے۔ مجھے علم ہے کہ انسان کا فرض صرف مصلحت جوئی ہے۔ کیا انسان یونان کے حکیم لیوکریشیا کی تقلید میں عیش و عشرت کا طلبگار بن جائے؟ لیکن عیش و عشرت کے متعلق اس حکیم کے فلسفہ کا حاصل کیا ہے؟ زرد رنگ کی مرجھائی ہوئی بدمزاج اور مدقوق لڑکیاں؟ کیا انسان روما کے حکیم کیٹو کی تقلید میں زہد اور

پرہیزگاری کا راستہ اختیار کرے؟ یہ وہی کیٹو تھا جس نے یوٹیکا
میں زندگی بسر کی تھی۔ لیکن انسان کی پرہیزگاری سے کیا بنتا ہے،
جب خود دیوتاؤں نے ہی دنیا قیصرو کسریٰ کی غلام بنا دی ہے۔
کیا فرانس کی جون آف آرک کی پیروی کرتے ہوئے، وطن پر جان
چھڑکی جائے؟ لیکن جون آف آرک کا انجام کیا ہوا؟ قدرت نے
اُس کو عیش کے آغوش کی زینت بننے کے لئے عورت بنایا تھا۔
عنفوانِ شباب تھا، لیکن بیچاری کال کوٹھڑی کے اندر گھٹ
گھٹ ہی تو گئی ہوگی! اور پھر ذرا چتا پر کباب کی طرح بھونے
جانے کی سوزش کا خیال کیجئے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں!!
کیا ٹیپو سلطان کی دینی حمیّت کو نشانِ راہ بنایا جائے؟ لیکن
ٹیپو کا تو سر پھرا ہوا تھا۔ اُسے کس نے کہا تھا کہ خون آغشتہ مورچے
میں ڈٹ کر اندھا دھند موت کے پاؤں تلے کچلا جائے؟
آج کوئی اُس کا نام لیوا بھی تو نہیں! اور دوسری طرف دیکھئے تو
عالیشان سلطانی محلّات اور انمول شاہی خزانے بلا اختیار
من لبھائے لیتے ہیں!!۔
اگر بہاڑے کے ٹٹّو، پراپیگنڈا کرنے والے بھانڈ، مذکورہ بالا
مشاہیر اور خواتین کی تعریف نہیں کرتے تو اس میں تعجب کی کیا

بات ہے - لیکن یہ ہرگز برداشت نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اِن بزرگوں کی توہین بھی کریں - روپے لے کر پرچار کرنے والوں سے اور توقّع بھی کیا کی جا سکتی ہے؟ پرانی مثل ہے کہ "رنڈیاں ذرا منہ پھٹ ہوتی ہیں!"

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

بہر حال اس جھگڑے سے میرا کوئی واسطہ نہیں - ربِّ ذوالجلال اپنے بندوں پر کبھی اُس سے زیادہ بوجھ نہیں رکھتا جتنا وہ اُٹھانے کے قابل ہوں - اس لئے میرے ربّ نے شروع سے مجھے میدانِ جنگ، کشتوں کے پشتوں، اور گردِ سفر کی صعوبت سے محفوظ رکھّا ہے - مجھے ایک ایسا گھر بخشا ہے جس کے چاروں جانب سبز میدان ہے، اور دھیمی دھیمی خاموش ندّیاں رینگتی ہیں - سپہ سالاروں کی کڑک اور سپاہیوں کے نعرے میرے کانوں سے دُور ہیں - سلطنتوں کی تباہی کے تڑاقے یہاں بلبل کے نغمے اور جھینگر کے گیت سے بھی زیادہ بے حقیقت محسوس ہوتے ہیں -

ہاں مستقبل میں کیا ہوگا؟ یہ کتاب لکھتے وقت میرا مقصد صرف یہ بیان کرنا تھا کہ ہندوستان میں انگریز کا راج کیوں ختم ہوا -

ہیں نہ کسی پالیسی کا حامی ہوں اور نہ کسی پروگرام کا مخالف۔ میں پیشین گوئی کرنے کا مدّعی نہیں۔ سیاسیات میں زائچے کھینچنا فنِّ پیشین گوئی کی بدترین نوعیّت ہے۔ اگر خود برطانیہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اُسی سے ثابت ہوجاتا ہے کہ سیاسی پیشین گوئیاں شاذ و نادر ہی پوری ہوتی ہیں۔ ہاں وقت اکاٹنے کے لئے سیاسی پیشین گوئی کا شغل کچھ ایسا برا نہیں! لیکن میرے پاس نہ تو اتنا روپیہ ہے، نہ اتنا وقت، اور نہ اتنی ہمّت، کہ فضول مشغلوں میں وقت کاٹا کروں۔ البتہ مختلف مکاتیبِ خیال کے نمائندوں کی قیاس آرائیاں نقل کرنا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو۔

یہ امر شروع سے ہی واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ میری رائے میں اب ہندوستان پر برطانوی راج قائم رکھنا، یا دوبارہ قائم کرنا ناممکن ہے۔ یہ وسیع سلطنت جس کے باشندوں کی تعداد پنتیس کروڑ سے زائد ہے، اب روز بروز زیادہ سرعت کے ساتھ اُسی منزل کی جانب بڑھتی جائے گی، جس کے راستے پر گامزن ہو چکی ہے۔ تخت و تاج سے دستبردار ہونے والے بادشاہ بیوقوف بھی ہو سکتے ہیں اور عقلمند بھی۔ لیکن اُس بادشاہ سے زیادہ احمق کون ہوگا جو تخت و تاج سے دستبردار ہو کر پھر تخت

تاج کی حرص سے دستبردار نہ ہو؟ ایسے بادشاہ یا تو میکسیکو کے تاجدار میکسمیلین کی طرح پھانسی پاتے ہیں، اور یا پھر روماؔ کے سربراہ آرمائے وکٹر کی طرح جیل خانہ میں مرتے ہیں۔

ہر نظام کا انجام فنا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آئندہ سو سال میں ہندوستان کے اندر کیا ہوگا؟ ہندوستان میں جو کچھ ہوگا، اُس کا اثر برطانوی سلطنت پر کیا ہوگا؟۔

ہندوستان آزاد ہوکر برطانیہ کی حلقہ بگوشی تو نہ چھوڑ دے گا

جاہن کالنز جو کہ آجکل برسراقتدار پارٹی کا سرکاری ڈھارس بندھانے والا' درباری نقیب ہے، لکھتا ہے کہ:۔

"اب ہندوستان کو خود مختار حکومت قائم کرنے سے زیادہ دیر نہیں روکا جا سکتا۔ ہندوستان اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کے لئے آزاد ہوگا۔ سلطنتِ برطانیہ کی فوجیں ہندوستان کو بیرونی حملہ سے محفوظ رکھیں گی، اور برطانیہ کے بین الاقوامی تعلقات' ہندوستان کے استحکام کی مزید ضمانت ہوں گے۔ ہندوستان، برطانوی دولتِ مشترکہ میں برابر کا ساجھی ہوگا۔ ہندوستان پر جب برطانوی راج نہ رہے گا، تو ہندوستان سلطنتِ برطانیہ کا ویسا ہی وفادار بن جائے گا جیسے دوسرے ڈومینین وفادار ہیں۔ ہندوستان

کو بیرونی فوجوں، غیر ملکی سرکاری ملازمین، اور غیر ملکی حکمرانوں کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستان میں غیر ملکی ماہرین ملازم نہ رکھے جائیں گے۔ البتہ یہ غیر ملکی ماہرین خود ہندوستان کے ملازم ہوں گے، اور کوئی غیر ملکی طاقت اُن کو ہندوستان کے سر پہ نہ ٹھونسے گی۔ جب ہندوستان پر بیرونی تمدّن ٹھونسا نہ جائے گا، تو وہاں اس تمدّن کو خوش آمدید کہا جائے گا۔ جمہوری اداروں کے قیام سے جمہوریت کے ساتھ وابستگی بڑھ جائے گی۔ جمہوریت سے وابستگی، جمہوریت کے استحکام کا سبب بنے گی۔ جب ملک میں جمہوری ادارے بھی ہوں گے، اور جمہوری جذبہ بھی، تو لازم ہے کہ معاشرتی اصلاح کی جانب بھی توجہ دی جائے گی۔ چند ہی پشتوں کے بعد ہندوستانیوں اور انگریزوں میں سوائے اس کے کچھ فرق نہ رہ جائے گا کہ ایک کا رنگ ذرا زیادہ کالا ہے اور وہ کپڑے بھی مختلف شکل کے پہنتا ہے۔

"سلطنت برطانیہ کو ہندوستان کی آزادی سے بے اندازہ فائدے پہنچیں گے۔ ہندوستان دولت کی ایک ایسی کان ہے جس سے تمام دولتِ مشترکہ کے باشندے جھولیاں بھر سکیں گے۔ جب ہندوستان کے باشندے اُن آزادیوں سے محروم نہ رہیں گے

جو ہر انگریز کو حاصل ہیں، تو پھر خطِ استوا کے قریب برطانوی سلطنت
کے تمام علاقوں میں ہندوستانی آباد کاروں کو خوش آمدید کہا جائے گا۔
کینیا، شمالی آسٹریلیا اور نیپال میں ایسے وسیع غیر آباد علاقے موجود
ہیں جو آباد کاری اور استفادہ کے منتظر ہیں۔ اِن علاقوں میں گوری
اقوام بآسانی زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔ یہاں برطانوی ملّت کے
یہ ہندوستانی ارکان آبادیاں قائم کریں گے۔ آزادی مل جانے کے
بعد ہندوستان کی صنعتوں میں بھی اضافہ ہوگا۔ سلطنتِ برطانیہ
کے اندر اِس وقت مختلف ممالک کے مابین صنعت و حرفت
کی جو تقسیم رائج ہے اُس پر نظرثانی کی جائے گی۔ ہر ڈومینئن میں وہی
مصنوعات تیار کی جائیں گی جن کے لئے مطلوبہ سامانِ خام وہاں
مہیّا ہو۔ مثال کے طور پر بمبئی کے پارچاتی کارخانے ساری سلطنتِ
برطانیہ بلکہ کل مشرقی ممالک کی پارچاتی ضروریات پوری کریں گے۔
یہ ناقابلِ تصوّر ہے کہ خود مختار اور روشن خیال، ہندوستان روئی یا پٹ سن
کی برآمد یا مصنوعات کی درآمد پر ایسے گراں ٹیکس عائد کرے، جو
تجارت کے حق میں مضر ثابت ہوں۔ اگر ہندوستان کوئی ایسی غلطی
کرے تو برطانوی حکومت اُس کے کان کھینچنے میں حق بجانب ہوگی۔
اگر ہندوستان اِس احتجاج پر بھی باز نہ آئے، تو اُس کو چند برس

اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا، جس سے اُس کو خود ہی ہوش آ جائے گا، اور وہ رجعت پسندی کا راستہ ترک کر کے آزاد تجارت کی راہ پر آجائے گا۔

"یہ ناقابلِ تصوّر ہے کہ ہندوستان برطانیہ کے ساتھ معاہدانہ تعلقات ترک کر دے۔ یا برطانوی سکّہ سے رشتہ توڑ دے۔ اگر ہندوستان ایسا کرے، تو حکومتِ برطانیہ احتجاج کرے گی۔ احتجاج کرنے پر بھی ہندوستان باز نہ آیا، تو چند برس کے بائیکاٹ سے اُس پر واضح ہو جائے گا کہ دوسرے ممالک سے تعلقات بگاڑنا کوئی اچھّا سودا نہیں۔

"برطانوی دولتِ مشترکہ میں ہندوستان کی شمولیّت سے کوئی اُلجھنیں پیدا نہ ہوں گی۔ ہندوستان کی سرحدوں پر کوئی خطرناک ہمسایہ نہیں۔ آزاد ہندوستان کے مقابلہ پر افغانستان کی کچھ حیثیت نہ ہوگی۔ ہندوستان کا بچہ بچہ مادرِ وطن کو وحشیوں کے حملہ سے بچانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوگا۔ روس زوال پذیر ہو چکا ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں میں جو روشن خیالی اور ترقی پھیل رہی ہے، اُس کے باعث تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا کی کوئی بڑی سلطنت تسخیرِ مملکت کی مجنونانہ آرزو نہ کرے گی۔ اس امر کا امکان ہے

کہ شاید ہندوستان میں بعض غیر ملکی افراد سے ناخوشگوار سلوک کیا جائے، یا بعض اقلیتوں پر سختی کی جائے۔ لیکن غیر ملکی افراد جب کسی ملک میں جائیں، تو وہاں کے قوانین اور روایات کا احترام کرنا اُن کا فرض ہے۔ ہندوستان اگر قانون کے ماتحت اپنے حقوق نافذ کرنا چاہے تو ساری دولتِ مشترکہ اُس کی حمایت کرے گی، اور اگر کوئی نازک صورتِ حال پیدا ہوگئی تو بلاشبہ مجلسِ اقوام مداخلت کرکے معاملہ سلجھا دے گی۔"

گورے اور کالے کیسے برابر ہو سکتے ہیں

یہ تو سرکاری ڈھارس بندھانے والے بزرگ کے خیالات تھے۔ ہم بھی اُمید رکھتے ہیں کہ یہ خیالات صحیح ثابت ہوں۔ اگر کوئی ناتجربہ کار پیشین گوئی کرنے والا ہندوستان کے مستقبل کی پیشین گوئی کرنا چاہے تو وہ ایک طرف تو جزائر شرق الہند کے جزیرہ ہیٹی، چین، ایران، اور ترکی کی مثالوں پر غور کر سکتا ہے۔ اور دوسری طرف وینی زوئیلا اور نکاراگوا کی وسطی امریکہ کی ریاستوں کی تاریخ سامنے رکھ سکتا ہے۔ یا تیسری طرف جاپان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی داستان سے سبق حاصل کر سکتا ہے۔ یا وہ مسلّمہ کلّیات سے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

جان ڈسل ہوم جو کہ معاملاتِ افریقہ کا ایک ممتاز ماہر ہے، اسی طریقہ پر عمل کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

"میں ہندوستان یا ہندوستانیوں کے متعلق زیادہ علم نہیں رکھتا۔ مجھے صرف اتنی واقفیت ہے کہ افریقہ میں کچھ ہندوستانی آباد ہیں جو ہمیشہ ہمارے لئے دردِ سر ثابت ہوتے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ لوگ دولتِ برطانیہ کے باشندے ہیں یا نہیں۔ لیکن ہم مزید ہندوستانیوں کو ہرگز اپنے ملک میں نہ آنے دیں گے۔ جہاں تک دولتِ برطانیہ کا تعلق ہے، میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں برطانوی دولتِ مشترکہ صرف اتحادِ اعتقاد کی بنا پر قائم ہے۔ ہم لوگ برطانیہ کی رعایا نہیں۔ برطانیۂ عظمےٰ صرف ہمارا ساجھی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب برطانیہ کو ادعائے بزرگی چھوڑ کر ہمارے ساتھ برابر کا ساجھی بننا ہوگا۔ اس کاروبار میں دوسرے مشترک ساجھی دولتِ مشترکہ کے دیگر اراکین ڈومینین ہیں۔ دولتِ مشترکہ اور برطانیہ کا رشتۂ اتحاد صرف یک دلی پر مبنی ہے۔ اس یکدلی کی تفصیل یہ ہے کہ ہم ایک نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اہم مسائل پر ہم میں اتفاقِ آراء پایا جاتا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد یکساں زندگی بسر کرتے آئے ہیں۔ ہمارا تمدن ایک ہے۔ ہم نے کئی مہمیں اکٹھے لڑی ہیں۔ ہم نے پہلو بہ پہلو

فتوحات حاصل کی ہیں، اور کئی میدانوں میں اکٹھے شکست کھا کر بھی واپس لوٹے ہیں۔ ہمارے کلیسائی اور سرکاری ادارے ایک ہی جڑ سے پھوٹ کر تناور درخت بنے ہیں۔ غرض تہذیبِ مغرب ہمارا مشترکہ ورثہ ہے۔ چاہے ہم انگلستان میں رہیں، یا افریقہ جائیں، یا کینیڈا میں زندگی بسر کریں، اور یا آسٹریلیا کے جزیروں میں گھر بنائیں، ہم ایک ہی دولتِ مشترکہ کے فرزند ہیں، جو قیدِ مقامی سے آزاد ہے۔

"میں نے جن عوامل کا ذکر کیا ہے اگر وہ دولتِ مشترکہ کے کچھ اجزاء پر اثر انداز نہیں ہوئے، تو ایسے علاقے ہرگز دولتِ مشترکہ کی رکنیت کے درجہ کے مستحق نہیں۔ یہ خطّے تو مشترکہ کاروبار کے ایک حصّہ دار یعنی برطانیہ کی ذاتی جائداد تھے، اور اسی حیثیت میں ان خطّوں کی آمدنی اور مالیانہ مشترک مقاصد پر خرچ ہوتا رہا۔

"ہمارے نزدیک دولتِ مشترکہ کا رشتہ خودمختار اجزاء کے اتحاد سے پیدا ہوا۔ جہاں تک برطانوی مقبوضات کا تعلق ہے اُن کے ساتھ برطانیہ کا رشتہ قاہرانہ اقتدار کے اصول پر مبنی رہا ہے۔ اصولاً اور عملاً ہر دو لحاظ سے یہ علاقے تاجِ برطانیہ اور وزارتِ برطانیہ کے تابع رہے ہیں۔ ہم صرف تاجِ برطانیہ سے رشتہ رکھتے ہیں۔ برطانوی

پارلیمنٹ کو ہم پر کوئی اقتدار حاصل نہیں،

"دولتِ مشترکہ میں کسی غیر نسل کو شامل کرنا، ایسے خطرات اور نقصانات کا امکان مول لینا ہے جو کبھی ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں گزرے۔ ہم یہ خطرات اور نقصانات برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ اگر اس تجویز پر اصرار کیا گیا تو نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ برطانوی دولتِ مشترکہ ختم ہو جائے گی۔ برطانیہ یا تو گوری نسل کے ڈومینیئوں کے ساتھ قدیم روابط جاری رکھ سکتا ہے، اور یا ہندوستان کے ساتھ نئے رشتے گانٹھ سکتا ہے۔ کالوں اور گوروں سے بیک وقت مساوی یارانہ نہیں نبھ سکتا۔

"مختصراً میں اپنا زاویۂ نگاہ یوں پیش کروں گا: کیا آپ کی رائے میں جنوبی افریقہ کو اس لئے فرانس کے ساتھ جنگ مول لینے میں دریغ نہ کرنا چاہئے کہ روس کا کوئی مسافر امرتسر میں ناحق مارا گیا تھا؟"

یہ تھے جان ڈسل بوم صاحب کے خیالات۔ کئی لوگ اُن کے ساتھ اتفاق کریں گے۔ مجھے یہ بات ناممکن نظر نہیں آتی کہ خود اہلِ برطانیہ بھی کہہ دیں کہ ہندوستان اب آزاد ہو چکا ہے۔ ہندوستان پر ہمارا کوئی بس نہیں۔ اب ہندوستان کو بغیر ہماری مداخلت کے خود اپنی

تقدیر کا لکھا بھگتنا چاہیئے۔ اندریں حالات ہم ہندوستان کی حفاظت میں نہ اپنے خون کا ایک قطرہ بہائیں گے اور نہ ایک پائی خرچ کریں گے۔

فتح کا پھل کھانا ایک ذلیل حرکت ہے!

پروفیسر ایتھانیسی اس گگلنزوک جو کہ ایک نامور "میاں ہمچوں ما دیگرے نیست" ہیں، لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان میں جدید دستوری اصلاحات کا نفاذ، ملک کی نجات کا پیش خیمہ ہے۔ ہندوستان کو یوں آزاد کر کے برطانیہ نے بیمثال فراخدلی کا ثبوت دیا ہے۔ میری رائے میں جس دن سے روما کے جرنیل ہونوری اس نے برطانیہ کو فوجی طور پر خالی کر دیا تھا، تب سے لے کر آج تک دنیا کی تاریخ میں ایسی فراخدلی کی اور کوئی مثال نہیں ملتی۔ بعض پہلوؤں سے برطانیہ کا ہندوستان کو آزاد کر دینا، ہونوری اس کی مراجعت سے زیادہ قابلِ تعریف ہے۔ ہونوری اس نے ایک حد تک مجبوری کے باعث برطانیہ سے اپنی فوجیں نکالی تھیں۔ برعکس اِس کے انگریز ہندوستان سے رضا کارانہ طور پر نکل آتے ہیں۔ انگریزوں کو ہندوستان میں آج بھی ایک ایسا تفوّق حاصل تھا، جو چاہے اخلاقی طور پر قابلِ ستائش نہ سہی،

لیکن جس سے انگریزوں کو کئی مادی فائدے حاصل تھے۔ برطانیہ کا ہندوستان کو آزاد کر دینا ویسا ہی ہے جیسا دنیا میں غلامی کے انسداد کی تحریک کا آغاز۔

"دستوری اصلاحات سے قبل سلطنتِ ہند کا نظام کفرانِ باری تعالیٰ کا مجسّم نمونہ تھا۔ اوّل تو اِس نظام کے ذریعہ ایک نسل دوسری نسل پر حکمران تھی۔ واقعات سے ثابت ہے کہ ہندوستان جنگجو اور نفع خور عناصر کی شکارگاہ تھا۔ درآمد کی تجارت پر ٹیکس لگاتے وقت برطانوی تجارت کے مفاد کو پیشِ نظر رکھا جاتا تھا۔ واقعات سے یہ بھی ثابت ہے کہ مظلوم کسانوں سے جو مالیانہ وصول کیا جاتا تھا، اُسے اعلیٰ طبقات کے انگریز نوجوانوں کو ذریعۂ معاش مہیّا کرنے پر خرچ کر دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ ایک ایسا مسلم الثبوت مسئلہ ہے جس کی تائید میں واقعات پیش کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ یہ حقیقت تو عقلاً بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ جب ایک نسل کو دوسری پر قابو حاصل ہو جائے، تو غالب ہمیشہ مغلوب کو اپنا چاکر اور غلام بنا لیتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضرور سلطنتِ ہند کی رعایا کو بھی بری طرح برطانوی مفاد کے لئے استعمال کیا جاتا ہوگا۔

"جو انگریز بھی ہندوستان جاتا تھا وہ جلد ہی اُس اخلاقی معیار سے گر جاتا تھا جو یورپ میں انگریزوں کو حاصل رہتا ہے۔ ایسا ہونا خلافِ قیاس بھی نہیں۔ یہاں پھر ہمارا دعویٰ واقعات سے ثابت ہے۔ پادری سپٹیمیئس ہاؤلو نے ہندوستان جا کر ایک چھوٹی سی بستی قائم کی تھی، جسے ضلع کے ظالم حاکم نے ناجائز کشیدِ شراب کے جھوٹے الزام میں تباہ کر کے رکھ دیا۔ اِن پادری صاحب نے ولایت واپس آکر ہندوستان کی حالتِ زار کے متعلق جو رپورٹیں شائع کی ہیں اُن سے ہمارا دعویٰ بخوبی ثابت ہو جاتا ہے۔ اِس کے علاوہ ہندوستان کے شہرۂ آفاق پرچارک بابو سیتارام دیکھشت کے پُر اثر اخباری مضامین بھی ہماری تائید کرتے ہیں۔ مزید بریں بیچٹ جو کہ برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں، حال ہی میں چھ ہفتے ہندوستان کا دورہ کر کے واپس آئے ہیں۔ اُن کے ذاتی مشاہدات بھی حرف بحرف ہمارے حق میں ہیں۔ مگر میں پھر کہوں گا کہ یہ دعویٰ ثابت کرنے کے لئے واقعات کی شہادت لازمی نہیں۔ یہ امر تو اصولی استدلال سے بھی تسلّی بخش طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے کہ فرنگی چاہے سرکاری منصب پر فائز ہو، اور چاہے سرکاری منصب پر فائز نہ ہو، ضرور ہندوستان میں تکبّر، ظلم، غصب، اور بدکاری کا مرتکب ہوتا ہوگا۔

پاجیوں کو سارا جگ پاجی ہی نظر آتا ہے

"انسان خواہشات کا بندہ ہے، اور طبعاً اپنی خواہشات کو پورا کرنے پر مائل رہتا ہے۔ میں خود اقرار کرتا ہوں کہ کبھی کبھار گھر کی نوکرانی کو شہوت کی نگاہوں سے تاک جھانک کر آنکھیں سینک لیا کرتا ہوں۔ پھر جو انگریز ہندوستان جاتے، اُن پر نگرانی کرنے والا کون تھا؟ ہندوستان میں کوئی رائے عامہ تو ہے نہیں۔ عوام مدافعت کرنے کے قابل نہیں۔ انگریز انفرادی طور پر جو ظلم ڈھائیں، اُس کی فریاد عدالت یا حکومت کے پاس پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ مظلوم اپنی شکایت بھی ظالم ہی کے پاس لے جانے پر مجبور ہے ہے۔ تمام انتظامی اقتدار کی باگ ڈور یا تو انگریزوں کے ہاتھ میں ہے، یا مغرب زدہ ہندوستانیوں کے بس میں ہے۔

"حکومتِ ہند چونکہ ایک استبدادی حکومت ہے اس لئے وہ ضرور آزادیِ تقریر اور آزادیِ تحریر پر پابندیاں عائد کرتی ہو گی سارا ملک بے رحمی اور جبر کے نیچے یوں دبا ہے جیسے کوئی سبزہ زار برف سے ڈھک جاتے۔ کبھی کبھی کسی جگہ سے برف ہٹ جائے تو بُراق اور شفاف برف کے نیچے زبوں حالی کا ایک پوشیدہ سمندر دکھائی دیتا ہے۔

"اگر حکومتِ ہند ایسی اچھّی ہوتی جیسا کہ اُس کے حامی بیان کرتے ہیں، تب بھی ہندوستان پر انگریزی راج ایک کلنگ کا ٹیکہ تھا۔ حکومتِ ہند کا سب سے بڑا مقصد یہ رہا ہے کہ ملک کی مادی خوشحالی کو ترقی دی جائے۔ اوّل تو حکومتِ ہند یہ مقصد بھی پورا نہیں کر سکی۔ ہندوستان کو جن لڑائیوں، قحط اور وباؤں سے آج واسطہ پڑ رہا ہے، ماضی میں اُن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ملک میں جہاں پہلے بڑے بڑے شہر آباد تھے، اب وہ علاقہ دیہات سے پٹا پڑا ہے۔ بڑے بڑے شہروں کی تعداد پہلے سے کم ہو چکی ہے۔ کچھ بڑے شہر مثلاً بمبئی، کراچی، اور کانپور حد سے زیادہ پھیل گئے ہیں۔ ایسے شہروں کی آبادی کوئی جنس پیدا تو کرتی نہیں، البتہ کھانے کی مفت چٹّی ہے۔ الغرض اگر بالفرضِ محال حکومتِ ہند ملک کو خوشحال کر دیتی، اگر ہمالیہ سے راس کامرون تک ہر باشندہ اور اُس کا خاندان عام حالات میں خوراک پوشاک اور رہائش سے مطمئن ہو جاتا، تب بھی کیا تھا۔ کیا انسان صرف روٹی کھا کر زندہ رہ سکتا ہے۔ کیا انسان اپنی آبرو، حبِّ وطن اور دین وملّت کا احساس روٹی کے ٹکڑے کی اُمید پر ترک کر سکتا ہے؟"

مغرب ابھی وحشی تھا کہ مشرق متمدّن ہو چکا تھا

"میں نے سنا ہے کہ ہندوستانی ایک روحانیت پرست قوم ہیں۔ ذرا ٹیگور کو دیکھو۔ ہندوستانی مذہب کے متوالے ہیں۔ ذرا اُن کے پینتیس کروڑ دیوتاؤں کا تصوّر کیجیے۔ اہلِ ہندوستان فنونِ لطیفہ میں کمال دسترس رکھتے ہیں۔ اُن کے فنونِ لطیفہ کے نمونے ہمیں اس لئے پسندِ خاطر نہیں کہ ہم یونان کے پیش پا افتادہ فنونِ لطیفہ کی روایات میں مستغرق ہیں، اور ہمارا ذہن اتنا بلند پرواز نہیں۔ ہندوستانی قوم کی روح کا اظہار شری رنگم کے مندر، ایلوؔرا کی غاروں کی سنگ تراشی، تاج محؔل اور سکندؔرہ باغ جیسی شاندار عمارات کے ذریعہ ہو چکا ہے۔ جب ہمارے آباؤ اجداد یورپ میں دریائے ایلبؔے کے دہانے کے قریب سمندری مرغابیوں کے گھونسلوں سے انڈے چرا کر زندگی بسر کرتے تھے، تو ہندوستان اعلیٰ درجہ کے مدبّرین اور فاتحین کی سرزمین تھا۔ بارھویں صدی قبل مسیحؑ میں جب یونانیوں نے آس پاس کے جزیروں پر نو آبادیاں قائم کیں تو اُس سے بہت پہلے ہندوستان میں عظیم الشان سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں۔ اگر ہندوستان کی تہذیب و تمدّن ہم سے مختلف ہے تو اس سے اُس کی عظمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ پلاسی کی لڑائی تک یہ تہذیب آب و

تاب سے قائم تھی - غلامی کا پہلا دن ہی انسان کی آدھی شجاعت کا
خاتمہ کر دیتا ہے - ہندوستان آج چھ پشتوں سے غلام ہے - اس
عالی مرتبت قوم کے لئے یہ احساس کیسا سوہانِ روح ہوگا کہ
قومی تمدّن مٹ رہا ہے - ہندوستان کے شجاع سپاہی، آج خانہ دار
شہری بن چکے ہیں - ہندوستان کے ولی اللہ اور رشی مُنی اب اپنے
جانشین چھوڑے بغیر مر جاتے ہیں - مندروں، مسجدوں، اور محلّات
کی جگہ ریلوے اسٹیشن، بندرگاہوں کی گودیاں، اور میونسپلٹیوں
کی بنائی ہوئی منڈیاں، تعمیر ہو رہی ہیں - ڈھاکہ کی کھڈیوں کے بُنے ہوئے
پارچات کے بجائے آج لنکاشائر کے کارخانوں کا کپڑا پہنا جا رہا
ہے - آج اجنبی معلّم، غیر ملکی زبان ہیں مرتّب شدہ، غیر ملکی ضابطۂ قوانین
کا ورس دیتے ہیں - انسان خالی روٹی کھا کر تو زندہ نہیں رہ سکتا، آریہ
ورت کے باشندوں کے لئے یہ ہزار درجہ بہتر تھا کہ وہ آپس میں
لڑ لڑ کر فنا ہو جاتے، بہ نسبت اس کے کہ وہ آج دب کر، اور اپنی
روحانیت سے محروم ہو کر، غلاموں کی زندگی بسر کر رہے ہیں - آج
ہندوستان کے باشندے ابتدائی ضروریاتِ زندگی کی تلاش میں
سرگرداں رہتے ہیں - غلاموں کی طرح، آقاؤں کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں
اُن کے نصیب میں لکھی ہیں - سات سمندر پار سے آنے والے اِن

آقاؤں کا راج بے رحم بھی ہے اور ناگوار بھی۔

فرنگی کا تمدّن، فرنگی کا راج اور فرنگی کا سکّہ تینوں لعنتیں ہیں!

"یہ راج نہ کبھی دیر تک قائم رہنے کی اُمید ہو سکتی تھی، اور نہ ہے۔ ہندوستان میں دستوری اصلاحات کا نفاذ اِس راج کے خاتمہ کا پہلا مرحلہ ہے۔ اب منزلِ مقصود زیادہ دور نہیں۔ آج ملّتِ ہندوستان کے سر پر جس منحوس پرندے کا سایہ پڑ رہا ہے، اُس کا دایاں بازو فرنگی کا راج ہے، اُس کا جسم فرنگی کا تمدّن ہے، اور اُس کا بایاں بازو فرنگی کا مالیاتی نظام ہے۔ اس پرندے کا سایہ قومی زندگی کے لئے زہرِ ہلاہل بن رہا ہے۔ آئینی اصلاحات کے ذریعہ ملّتِ ہندوستان عنقریب اِس منحوس پرندے کے سایہ سے نکل جائے گی۔ اِس کے بعد جلد ہی اِس پرندے کو مار کر اُس کا نام ونشان بھی مٹا دیا جائے گا۔

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اِس پرندے کو ختم کرنے میں بڑی دیر لگ جائے گی۔ ہمیشہ کئی لوگ موجودات کی پرستش میں گرفتار ہو جایا کرتے ہیں۔ انسان عقل کی تعلیمات پر اعتماد نہیں کرتا۔ ماحول میں کیسی ہی معمولی یا حقیر تبدیلی رونما ہو رہی ہو، انسان کی پہلی کوشش یہی ہوتی ہے کہ تبدیلی اچھی نہیں، اِس کو روکا جائے۔

"پھر انگریز سلطنتِ ہندوستان پر بیجا فخر کرتے ہیں۔ انگلستان کے کسی معمولی سے قصبہ کے ایک عدد ووٹر صاحب کا دماغ یہ سوچ کر عرش پر چڑھ جاتا ہے کہ اُس کے ووٹ میں ایک ایسی قوّت کا کروڑواں حصّہ شامل ہے، جس کے ذریعہ اُس جیسے پنتیس کروڑ انسانوں پر حکومت کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں کئی ایسے لوگ بھی ہیں جن کے مادی مفاد ہندوستان سے وابستہ ہیں۔ حکومتِ برطانیہ کے عسکری ماہرین کو اسی فہرست میں داخل سمجھنا چاہیئے۔ اِن کے علاوہ کئی ایسے لوگ بھی ہیں جو ہندوستان کے سرکاری قرضے کا سود کھا کھا کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لنکا شائر، برمنگھم، اور ڈنڈی کے شہریوں کا تو روزگار ہی ہندوستانیوں کا خون چوس کر چلتا ہے۔ ہزار ہا پنشنیں وصول کرنے والے ایسے ہیں جو نہ صرف دورانِ ملازمت میں ہندوستان کو لوٹ کر کھاتے رہے، بلکہ اب بڑھاپے میں بھی اژدھا کی طرح مفلس ہندوستان کی ہڈیاں پیس پیس کر موجیں اڑا رہے ہیں۔ یہ سب طبقات مل جل کر کثیر التعداد بھی بن جاتے ہیں اور بارسوخ بھی۔ اگر ایسے تمام گروہ سر جوڑ بیٹھتے تو شاید دستوری اصلاحات کی بیل کبھی منڈھے نہ چڑھ سکتی۔ یہ تو اصلاحات منظور کروانے والے مدبّرین کا کمال ہے کہ اُنہوں نے چپکے چپکے اصلاحات منظور کروالیں۔ اب اُن طبقات

کی کوئی اہمیت نہیں ۔ اُنہیں بے اثر بنایا جا چکا ہے ۔ اب ہندوستان کی تقدیر اُس کے اپنے ہاتھوں میں ہے ۔ ہندوستان میں عام آزادی کا دن اِس قدر قریب ہے جس کا عام انسان تصوّر بھی نہیں کر سکتے چند ہی برسوں میں ہندوستان پر انگریزی راج اُسی طرح بھولی بسری داستان بن چکا ہوگا ، جس طرح فرانس پر ماضی میں شاہانِ برطانیہ کا تسلّط آج ایک فراموش شدہ افسانہ بن چکا ہے ۔

انگریزی راج ختم ہو چکا ہے

" ممکن ہے شروع شروع میں دقّتوں کا سامنا ہو ۔ لیکن میری رائے میں یہ دقّتیں ہی ہندوستان کو آزادی کے راستہ پر تیزی سے گامزن کرنے کے لئے تازیانہ کا کام دیں گی ۔ جدید اصلاحات کے ماتحت حکومتِ ہند کے لئے جو آئین تجویز کیا گیا ہے ، اُس میں کئی ایسی خامیاں موجود ہیں جن کے باعث حکومت اور عوام کے مابین تصادم یا تعطّل کا امکان ہے ۔ یہ خامیاں اسی طرح دُور ہو سکتی ہیں کہ فریقین میں سے کوئی ایک دوسرے کے سامنے ہتھیار ڈال دے ۔ اگر حکومت عوام کے سامنے ہتھیار ڈالتی ہے ، تو چونکہ یہ ایک بیرونی اور اجنبی حکومت ہے ، اس لئے اِس کے ہتھیار ڈالنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ بہت جلد اُس کو ترکِ اقتدار

کرنا پڑے گا۔ برعکس اِس کے اگر حکومت غیر معمولی اختیارات
حاصل کر کے نظم و نسق چلانے پر مجبور ہو جاتی ہے تو اِس کا مطلب
یہ ہے کہ اصلاحات ناکافی ہیں، اور ہندوستان میں امن و اطمینان
قائم کرنے کے لئے اِن اصلاحات میں توسیع کی ضرورت ہے۔
حکومتِ ہند کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کے لئے، یا حکومتِ
برطانیہ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کے لئے، یا حکومتِ برطانیہ
کی جانب سے حکومتِ ہند کو ہتھیار ڈالنے کی ہدایت دلانے کی
خاطر، ہندوستانی محبّانِ وطن کو صرف اتنی جدّوجہد کرنی پڑے گی
کہ وہ متحد ہو جائیں، اور ایسے تمام قوانین ماننے سے انکار کر دیں
جن کی حکومت ضرورت محسوس کرے۔ اِس کے ساتھ ساتھ
وہ رقومات منظور کرنے سے بھی انکار کر دینا چاہیئے جو حکومت
کے اخراجات کے لئے درکار ہوں۔ بعض حلقوں میں توقّع رکھی جاتی
ہے کہ سیاسی مزاج رکھنے والے ہندوستانی، انگریزوں کے ساتھ
تعاون کریں۔ لیکن جن دو نسلوں کے اعتقادات میں ایسے بنیادی
اختلافات موجود ہوں، اُن کے مابین کیا تعاون ہو سکتا ہے؟ میری
رائے میں ہندوستان کے سیاست دان اِس سے کہیں زیادہ
بلند اخلاق رکھتے ہیں کہ چند اعلیٰ عہدوں یا تھوڑے سے حقیر

انعامات کی خاطر اجنبیوں کی غلامی برقرار رکھنے پر آمادہ ہو جائیں۔

"چاہے استخراجی منطق کی رو سے دیکھا جائے، اور چاہے استنباطی استدلال سے کام لیا جائے یہ تو ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جس حکومت کا انتظامی شعبہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا، اور جس مجلس قانون ساز کے کندھوں پر حکومت چلانے کی ذمہ داری نہیں، اُن دونوں میں اکثر تصادم رہتا ہے۔ جب مجلسِ قانون ساز جان بوجھ کر تعطل پیدا کرنے کی خواہاں ہو، اور سازش کر کے یکے بعد دیگرے تعطل پر تعطل پیدا کرتی جائے، تو پھر حکومت کے لئے کام چلانا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

"اندریں حالات، متوقع یہ ہے کہ سیاسی مزاج رکھنے والے ہندوستانیوں کا پروگرام، اصلاحات کے مصنفین کے اندازہ کے مقابلہ میں زیادہ تھوڑی مدت کے اندر پورا ہو جائے گا۔ اس پروگرام کی تکمیل یا تو موجودہ حکومت کی خاموش رضامندی سے ہو جائے گی، یا جب موجودہ دستورِ حکومت ناقابلِ عمل ثابت ہو جائے گا تو اُس کی جگہ اصلاحات کی ایک تازہ قسط عطا کی جائے گی، جو پہلے سے زیادہ وسیع ہو گی، اور پھر اِس نئے آئین کے ماتحت تشکیل پانے والی حکومت اِس پروگرام کو پورا کرے گی۔ جب یہ

پروگرام پورا ہو جائے گا تو ہندوستان کو ایک جمہوری اور مختارِ مطلق حکومت نصیب ہو جائے گی۔ میں ایسی حکومت کو سوراج کا نام دینے کو ترجیح دوں گا۔

ہندوستان انگریزوں سے خالی کراؤ

"پہلا فرض یہ ہے کہ ملک کو اجنبیوں سے خالی کروایا جائے۔ غیر ملکی دفتری حکومت کا خاتمہ ضروری ہے۔ غیر ملکی سرکاری افسروں کی جگہ نوجوان، جوشیلے اور محبِ وطن سرکاری ملازمین کا عملہ بھرتی کیا جانا چاہئے۔ برطانوی نوجوان تو پہلے ہی ہندوستانی ملازمت اختیار کرنے میں اب کوئی کشش محسوس نہیں کرتے۔ یہ گستاخ نوجوان، اُن افسروں کے ماتحت کام کرنے کو آمادہ نہیں جنہیں وہ ایک ذلیل نسل کے افراد خیال کرتے ہیں۔ یہ مسخرے بڑی سنجیدگی سے اعلان کرتے ہیں کہ اُن کا مستقبل، اُن کی زندگی، اور آبرو ایسے افسروں کے ماتحت محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اُنہیں کبھی خیال نہیں آتا کہ ہندوستانیوں کا مستقبل، اُن کی زندگی، اور آبرو بھی مدت تک انگریز افسروں کے ماتحت مخدوش رہی ہے۔ کیا ہندوستانی انگریزوں سے اُس سے زیادہ انصاف کی توقع رکھ سکتے تھے جتنی آج انگریزوں کو ہندوستانیوں سے توقع ہے۔ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔ نسل ایک بالکل بے معنی لفظ ہے۔

میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ مجھے حبشہ کے کسی باشندے کے بوٹ پر پالش کرنے میں اُس سے زیادہ عذر نہ ہوگا، جتنا کہ اسکاٹ لینڈ کے کسی نواب صاحب کی پاپوش جھاڑنے میں توقف ہوگا۔ باعزّت ملازمت کسی آقا کے ماتحت کی جائے ہمیشہ باعزّت رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں سرکاری ملازمتوں کے لئے انگریز اُمیدواروں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ جو اُمیدوار اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنہیں کھانے کو نہیں ملتا، اور جو پہلی جنگِ عظیم کے بعد کنگال ہو چکے ہیں۔ بہرحال برطانیہ کے نوجوان ہندوستان میں ملازمت پر آمادہ ہوں، یا نہ ہوں، اِس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ ہندوستان اپنے گھر کی رانی خود بننے کا ارادہ کر چکا ہے، اور اُسے ایسے غیر ملکی ملازمین کی زیادہ چاہت نہیں جن کی وفاداری بھی مشکوک ہو۔

"سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ ہندوستان کی فوج کو غیر ہندوستانیوں سے پاک کر دیا جائے۔ اس تجویز کا منہ سے نکلنا ہی اس کی معقولیت کا ثبوت ہے۔ ممکن ہے جنگجو قبائل میں ایسے لوگ نایاب ہوں جنہیں افسر مقرّر ہونے کے لئے مطلوبہ تعلیم حاصل ہو، لیکن پڑھے لکھے طبقات میں ایسے نوجوانوں کی کمی نہیں جو پریڈ کی

گراؤنڈ اور فوجی چھاؤنی میں رہ کر وطن کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسے افسر مقرر کرنے سے فوج کی طاقت میں تھوڑا بہت فرق آجائے، تب بھی کوئی ہرج نہیں، اگرچہ بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ایسا ہو، کیونکہ کسی پیشہ سے نسبی مناسبت کا دعوےٰ ایک بے حقیقت اصول ہے۔ ہندوستانی فوج کمزور ہو گئی تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہندوستان ہمیشہ امن پسند رہے گا۔ ہندوستان کا خزانۂ عامرہ خارج از ملک فاتحانہ مہمات پر خرچ نہ ہوگا۔ جہاں تک بیرونی حملہ کے خطرہ کا تعلق ہے، ایک مطمئن ملک جس کی مضبوط قومی فوج نے دریائے سندھ یا دریائے ستلج، اور بہتر تو یہ ہے کہ دریائے جمنا پر مورچے قائم کر لئے ہوں، اُس کو لوٹ مار کرنے والے غیر ملکی گروہوں سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی مہذب قوم باقاعدہ تیاری کے بعد ہندوستان پر حملہ کرے تو اوّل تو برطانوی دولتِ مشترکہ ہندوستان کی حفاظت کرے گی، لیکن ایسے خطرات کے خلاف آخری اور قطعی تحفّظ دنیا کی قوموں میں جمہوریت کا اعتقاد پھیل جانے سے ہوگا۔ جب یہ نوبت آجائے گی تو دنیا کی تمام بڑی بڑی طاقتیں عسکریت سے نفرت کرنے لگیں گی۔

انگریز راج کے ساتھ انگریزی زبان بھی رخصت ہو جائیگی

"جب غیر ملکی افسر چلے جائیں گے تو اُن کے ساتھ ہی غیر ملکی تمدّن بھی رخصت ہو جائے گا۔ ہندوستان پھر ویدوں کے زمانہ کا خوشگوار اور پُرسکون اطمینانِ قلب حاصل کرلے گا، اور وہ سب کچھ فراموش کردے گا جو اُس نے ایتھنز، روما، یا لندن سے سیکھا تھا۔ جمہوریّت پر اعتقاد تو انسان کی گھٹی میں پڑا ہے۔ جمہوریّت کا ثبوت شاستروں سے بھی اُسی وثوق سے اخذ کیا جا سکتا ہے، جس طرح ارسطو کی تصنیفات سے مستنبط کیا گیا ہے۔ میں نے نہ تو کبھی شاستروں کا مطالعہ کیا ہے، نہ ارسطو کی تصنیفات دیکھی ہیں، لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ دونوں سے جمہوریت کا سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اپنے بنی نوع سے انصاف کرو، یہی قانون کا مقصد ہے اور یہی کتبِ مقدسہ کی تعلیم۔ اسی اصول میں تمدّن اور تہذیب کی حقیقت بھی آجاتی ہے اس کے سوا دنیا میں جو کچھ ہے وہ غرور ہے یا جرم۔ جب ہندوستان سے بیرونی تمدّن چلا جائیگا تو اُس کے ساتھ ہی غیر ملکی زبان بھی رخصت ہو جائے گی۔

"میں جانتا ہوں اب آپ کے دل میں یہ سوال چٹکیاں لے رہا ہوگا کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقات کا کیا بنے گا؟

یہاں تعلیم سے مراد صرف انگریزی پڑھنا لکھنا ہے۔ آئینی اصلاحات
خاص طور پر اسی تعلیم یافتہ طبقہ کو راضی کرنے کے لئے نافذ کی گئی تھیں،
اور اِن کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم یافتہ طبقات جس اقتدار کے خواہشمند
ہیں اور جو ہماری رائے میں بھی اُن کو مل جانا چاہیئے، وہ اُن کے سپرد
ہو جائے۔ آجکل دنیا میں استنباطی طریقۂ استدلال کی جانب زیادہ
میلان ہے۔ اس لئے میں آپ کی خدمت میں چند مثالیں پیش کرونگا۔
مقدونیہ کے دورِ عروج میں جن یہودیوں نے یونانی تہذیب اختیار
کر لی تھی، وہ آج کدھر ہیں؟ وسطی ایشیا میں پارتھیا نے یونانی
اثر قبول کر کے جو تہذیب قائم کی تھی، کیا آج اُس کا کوئی نشان باقی
ہے؟ کیا ایران کے جن باشندوں نے صیہونیت کا اثر قبول کر لیا
تھا، اب اُن کا کوئی نام بھی جانتا ہے؟ کیا سلطنتِ روما میں جو غیر
ملکی غلام آزاد کر دیئے گئے تھے، اور اُنہوں نے وہاں ایک زبردست
سیاسی پارٹی بھی قائم کر لی تھی، آج اُس کا کوئی سراغ ملتا ہے؟ سلطنتِ
روما کے زیرِ اثر ایشیائے کوچک میں جو تمدن قائم ہو گیا تھا، اب اُس
کی کونسی یادگار باقی ہے؟ جس تہذیب و تمدن کی بنیاد کسی قوم پر نہ ہو،
جو تمدن اجنبی ہی رہے، جس تمدن کو عوام اختیار نہ کریں، اور جس
تمدن کو کسی ملت کے توالد و تناسل میں دخل حاصل نہ ہو جائے

ایسا تمدّن اُس بیرونی اقتدار کے اختتام کے ساتھ ہی فنا ہو جاتا ہے جس نے یہ تمدّن کسی قوم پر ٹھونسا تھا۔ ایسے تمدّن کی مثال اُس ہتھیلی پر اُگائی گئی سرسوں جیسی ہے جو زیادہ دیر سرسبز نہیں رہا کرتی، اُس کے غنچے چٹکتے ہیں تو دو دن خوب بہار دکھلاتے ہیں، اور کبھی کبھار پھل بھی لگ جاتے ہیں، لیکن جلد ہی یہ کھیتی مرجھا کر خاک میں مل جاتی ہے۔ اگرچہ ایسے ہندوستانیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جنہوں نے اپنے اوپر تھوڑے بہت مغربی تمدّن کا ملمع چڑھا لیا ہے، پھر بھی یہ لوگ ہندوستان کی کروڑوں آبادی کے اندر آٹے میں نمک برابر بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ کیا آپ کو انجیل کی وہ کہانی یاد نہیں کہ کالی مرچ کے دانے چاولوں کی قاب میں دب کر گم ہو گئے تھے۔ جس طرح افریقہ کے وہ حبشی جو فرانس کے زیرِ اثر کالے جنٹل مین کہلایا کرتے تھے، آج حبشیوں کی نسل میں مدغم ہو چکے ہیں، جس طرح والٹیئر کی تعلیمات پر حبشیوں کا علمِ سحر غالب آ چکا ہے، اسی طرح ہندوستان میں بھی بہت جلد ملکی تمدّن دوبارہ چھا جائے گا۔ جو افراد غیر ملکی تمدّن کے ملعون اعتقادات پر ڈٹے رہیں گے، اُن کا یکلخت خاتمہ ہو جائے گا۔ انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنا فرض ادا کر چکے ہوں گے جس طرح حیدر علی اور رنجیت سنگھ نے غیر ملکیوں کے حیلہ ہائے جنگ اور حربہ ہائے جنگ کا استعمال سیکھ کر

ہندوستان سے غیر ملکیوں کو نکالنے کی کوشش کی تھی، اسی طرح سے
تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے غیر ملکیوں کے سیاسی فنون سیکھ کر ایسا
پیچ کھیلا ہے کہ انہیں غیر ملکیوں کو ہندوستان سے باہر نکال مارا ہے۔
اگر حیدر علی کی سلطنت خداداد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی تو
بخوشی قواعد دان پلٹنوں اور توڑے دار بندوقوں کو ترک کر کے، پرانے
برچھی بردار رسالے دوبارہ رائج کر دیتی۔ اسی طرح سے موقعہ ملتے ہی
ہندوستان آرام کا سانس لے کر اسکولوں کی کتابیں، دفتری ہدایات
ضابطۂ قوانین، اور انگریزی عدالتوں کے فیصلوں کے طومار پرے
پھینک دے گا۔ اسٹوئرٹ مل کے فلسفہ، شیکسپیئر کی شاعری، اور
برک کے مضامین کو طاق پر رکھے گا، اور اپنے عہدِ عظمت کے سادہ اور
شریفانہ تمدّن کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ یہ انقلاب آج بھی شروع ہو
چکا ہے۔ کون شخص فرقہ دارانہ یونیورسٹیوں، یونانی اور ویدک طب کے
احیاء، انگریزی کے سرکاری زبان ہونے پر مسلسل اعتراضات، علاقائی
بولیوں کی ہر دلعزیزی، اور ہندی کو سارے ملک کی قومی زبان بنانے
کی بھونڈی کوششوں، کا منتہائے نظر سمجھنے میں دھوکا کھا سکتا ہے۔

"ہاں میری تصنیفات ہمیشہ ہندوستان میں شوق سے پڑھی جائیں
گی، کیونکہ میری تصنیفات میں حق کا بیان ہے، اور انسان ہمیشہ حق

کو سننے کا مشتاق رہتا ہے۔

فرنگی کا مالیاتی نظام ایک نحوست ہے

"آج برطانیہ کا مالیاتی نظام ہندوستان کے سر پر کابوس کی طرح سوار ہے۔ جب ایک تنومند قوم غلامی کی نیند سے بیدار ہوگی تو اُسے اِس کابوس کو فراموش کرنے میں ذرا دیر نہ لگے گی۔ یہ تمام نکھٹو پنشن خور اپنی ناجائز منفعت اندوزیوں سے محروم کر دیئے جائیں گے۔ ایک آزاد قوم کسی ایسے شخص کو پنشن دینے پر آمادہ نہ ہوگی جس نے غاصبوں کی خدمات بجالائی تھیں۔ اس بندش کے لئے پنشنیں ضبط کرنے کے اعلان کی ضرورت نہ ہوگی، کیونکہ ایسے اقدامات سچے جمہوریت پرستوں کی طبیعت کے خلاف ہوتے ہیں۔ ضبطی کے بجائے ملک سے غیر حاضر افراد کی آمدنی پر گراں محصول عائد کر کے ملکی دولت کو ایسی ناجائز فضول خرچیوں سے محفوظ رکھا جاسکے گا۔

"ہندوستان کے جس قومی قرضے کی ہُنڈیاں برطانیہ میں ہیں، اُس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے گا۔ یہ قرضہ ہندوستان کے قومی مقاصد کی خاطر نہ لیا گیا تھا۔ یہ قرضہ یا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملعون حقوق کے باقیاتِ غیر صالحات پر مشتمل ہے، یا اس میں وہ رقوم شامل ہیں جو تنازعہ جو استبداد نے ناجائز جنگوں پر خرچ کیں، یا پھر اِس میں

وہ خرچ شامل ہے جو ہندوستان کو غلام بنانے، اور وہاں غلامی پھیلانے کے سلسلہ میں برداشت کیا گیا، یا یہ قرضہ ہندوستان میں ریلوے بچھانے اور بندرگاہوں کی گودیاں بنانے کے مصارف پر خرچ ہوا۔ اِن ریلوے اور بندرگاہوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستان کی دولت لوٹ کر لے جانے میں آسانی ہو، یا باہر سے مال لاکر ملکی مصنوعات کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ ایک سچا جمہوریت پرست ذاتی جائداد کے مقدس حق کا احترام کرے گا، لیکن فریب اور تشدد سے حاصل کردہ حقوق پر مبنی مطالبات ہرگز تسلیم نہ کرے گا۔ وقت گذر جانے سے کوئی ناجائز حق کبھی جائز نہیں بن جایا کرتا۔ وقت جو کچھ کرتا ہے انسان اس کو بدل سکتا ہے۔

"یوں ہندوستان مختلف صورتوں میں برطانیہ کو جو خراج ادا کرتا ہے وہ خود بخود بند ہو جائے گا۔ پنجاب کا زبوں حال کسان اپنے کھیت کا نصف حصہ دھان سے بچا کر چلٹن ہیم یا ہیمپ سٹیڈ کے کسی کارخانہ دار کی حرص کو پورا کرنے کے لئے روئی کاشت کرنے پر مجبور نہ ہوگا۔

"سیاسی آزادی کا کچھ فائدہ ہی نہیں اگر اِس کے ذریعہ اقتصادی آزادی بھی حاصل نہ کی جائے۔ ہندوستان کے سیاستدان

اِس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں، اور وہ اپنے ملک کو کبھی غیروں کا اقتصادی مقبوضہ بننے کی اجازت نہ دیں گے۔ برآمد و درآمد پر محصول گھٹا بڑھا کر غیر ملکی مصنوعات کو ملک سے باہر رکھا جا سکتا ہے، اور ملک کی خام اجناس کو ملک سے باہر جانے سے روکا جا سکتا ہے۔ آئندہ ڈنڈی کے پٹ سن کے کارخانوں کے لئے نفع مہیا کرنے کی خاطر بنگال کا کاشتکار وبا کی ماری ہوئی دلدلوں میں اپنی چوٹی کا پسینہ ایڑی تک نہ بہائے گا۔ شہر کے لوگوں کے غیر فطری مذاق کی تسکین کی خاطر، دیہات کے صالح اور تندرست تقاضاؤں کو نظر انداز نہ کیا جائے گا۔ ایک آزاد قوم مانچسٹر کے کارخانوں کے پارچات نہ پہنے گی، بلکہ ہاتھ سے بُنا ہوا خوبصورت اور سادہ کھدّر پہنے گی، جو بلند آرزوؤں کی شہادت دیتا ہے۔

"یہ خدشہ پھر بھی باقی رہے گا کہ یہی خرابی ایک دوسری صورت میں پھر رونما نہ ہو جائے۔ بیرونی کارخانوں کی مصنوعات کی درآمد روکنے اور ملک کی قیمتی اجناسِ خام کے ملک سے برآمد نہ ہونے کا کچھ فائدہ نہ ہوگا، اگر ملک میں غیر ملکی سرمائے کا عمل دخل نہ روکا گیا۔ غیر ملکی سرمائے کو ملک میں بدستورِ سابق نفع کمانے کی اجازت

دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان کے کارخانوں میں کام کرنے
والے مزدوروں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی، غیر ملکی سرمایہ داروں
کی جیب میں پہنچ جائے گی، کیونکہ جب اِن کارخانوں میں غیر ملکیوں
کا سرمایہ لگا ہوگا تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ اِن کارخانوں کے
مالک بھی غیر ملکی ہیں۔ حصّہ داروں کے منافع اور قرضے پر سود
کی صورت میں جو رقم ادا ہوگی، آخر وہ غیر ملکیوں کی جیب میں ہی
تو جائے گی۔ اگر ملک کی دولت، ملک سے یوں ہی باہر جاتی رہی
تو اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ ملک بدستور غلام ہے۔ ایسی صورتِ
حال سے بچنے کے کئی طریقے ہیں: یا تو مجلسِ قانون ساز ملکی
کارخانوں کا نفع ملک سے باہر جانے کی ممانعت کر سکتی ہے،
یا اِس نفع پر بھاری ٹیکس لگائے جا سکتے ہیں۔ اگر ملک کے اندر
ایسی کمپنیوں کو کام کرنے کی ممانعت کر دی گئی جن کے حصّہ داروں
کی اکثریت غیر ملکیوں پر مشتمل ہو، تو یہ اقدام جمہوریت پرستی کے
عین مطابق ہوگا۔ سب سے بہتر تو یہ ہوگا کہ عوام کی حب الوطنی
پر اعتماد کیا جائے۔ عوام اپنی ناراضگی کا تشدّدانہ مظاہرہ کر کے
غیر ملکیوں کو اپنے وطن میں لوٹ کھسوٹ کی ممانعت کر سکتے ہیں۔
ہندوستان پہلے ہی مغرب کی لوٹ کھسوٹ کا اتنا شکار ہو چکا

ہے کہ اب اِس ظلم کو مزید جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی مقامی عدالتیں یا نظم و نسق کے مقامی افسر ہرگز غیر ملکی تاجروں کو بچانے کے لئے کوئی مداخلت نہ کریں گے۔ نہ ہی دولتِ مشترکہ کبھی سوداگروں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر دخل دے گی۔

تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ

"ہمیں موجودہ تصادم سے منہ موڑ کر اپنی نگاہیں ہندوستان کے روشن مستقبل پر گاڑ دینی چاہئیں۔ یہ مستقبل بہت دور نہیں۔ یہ کسی شاعر یا نجومی کا خواب نہیں۔ یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر زمین پر شروع ہو چکی ہے۔ اگر کل نہیں تو پرسوں ضرور یہ خواب ایک حقیقت بن کر رہے گا۔"

یہ تھے حضرت ایتھانیسی اس۔ اُنہوں نے انتہا پرست اعتدال پسندوں کے پروگرام کا ایک ایسا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ اگر انتہا پرستی اور اعتدال پسندی متضاد تصوّر نہ ہوتے تو بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا۔

جیسا میں نے کہا تھا سیاسی پیشین گوئی محض بے فکروں کا مشغلہ ہے۔ سیاستدان کبھی دریا پر پہنچنے سے پہلے پُلیں باندھنے کے سامان کا نقشہ دماغ میں قائم نہیں کیا کرتے۔ خاص طور پر

برطانوی سیاستدان' تو ہرگز قبل از مرگ واویلا، اور آب ندیدہ موزہ کشیدہ کے قائل نہیں۔ یہ عادت کچھ ایسی خلافِ عقل بھی نہیں سیاسیات میں کوئی نہ کوئی پہلو ہمیشہ نظر سے اوجھل رہ جاتا ہے، اور کون کہہ سکتا ہے یہی پہلو سب سے زیادہ اہم ثابت نہ ہو گا۔ یوں وہ مثل صادق آتی ہے کہ تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ۔ اگر سیاسیات میں پیشین گوئیاں نہ کرنے کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو پھر ماننا پڑتا ہے کہ سرکاری نجومیوں کو بھی خوشگوار پیشین گوئیاں کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے، اور صاف اقرار کر لینا چاہیئے کہ حالات ایسے ناگفتہ بہ ہیں کہ جو ہماری سمجھ آتا ہے کر بیٹھتے ہیں۔ انجام کا خدا مالک ہے!۔

ہاں کشف کا دعویٰ کئے بغیر بھی ایک عامی چند سوالات ضرور پوچھ سکتا ہے:۔

ہندوستان تقسیم ہو جائے گا

(۱) اگر حکومتِ برطانیہ کا اقتدار اُٹھ گیا تو اِس امر کی کیا ضمانت ہے کہ ہندوستان زیادہ دیر تک ایک مرکزی حکومت کے ماتحت رہے گا؟

آج تک کسی دوسری نسل نے اِس برِ صغیر کو زیادہ دیر تک

ایک حکومت کے ماتحت رکھنے میں کامیابی حاصل نہیں کی بلکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند سے قبل کوئی ہندوستانی حکمران ایسا نہیں گذرا جو سارے ہندوستان میں سفید گھوڑا چکر کاٹنے بھیجتا، اور کوئی اُس کے مقابلہ پر نہ آتا۔ سیاست دان کبھی جغرافیہ نہیں بدل سکتے۔ ہندوستان کی جغرافیائی تاریخ کوئی ایسی وجہ پیش نہیں کرتی جس سے اس ملک کا ایک حکومت کے ماتحت رہنا لازمی ثابت ہو۔ یہ برِ صغیر ہمیشہ اس لئے پارہ پارہ رہا ہے کہ اِس کا کوئی ایک مشترکہ مرکز نہیں۔ کوئی ایسا مقام نہیں جہاں سے سارے ملک پر قابو رکھا جا سکے۔

یہ برِ صغیر بآسانی چار منطقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ میں چھوٹے موٹے منطقوں کو نظرانداز کئے دیتا ہوں۔ پہلا منطقہ دریائے سندھ کی وادی ہے۔ دوسرا منطقہ دریائے گنگا کی وادی پہ مشتمل ہے۔ تیسرا منطقہ وسطی ہند کی سطح مرتفع پر مشتمل ہے۔ اور چوتھا منطقہ انتہائی جنوب کے علاقوں پر حاوی ہے۔ یہ جغرافیائی منطقے کم وبیش نسل، مذہب اور زبان کے لحاظ سے بھی متجانس ہیں۔ ماضئ قریب میں ہر ایک منطقہ جدا حکومت کے ماتحت تھا۔ اگر اصولی نگاہ سے دیکھا جائے تو اِن میں سے ہر ایک منطقہ

کا علحدہ ہو جانا قرینِ قیاس دکھائی دیتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں نے جو مصنوعی سیاسی وحدت پیدا کر دی تھی، وہ ایک مضبوط اور جابر بیرونی حکمران کے سہارے کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔

ہندوستان برطانوی دولتِ مشترکہ میں زیادہ دیر شامل نہ رہے گا

(۲) ہندوستان کے داخلی نظم و نسق میں دولتِ مشترکہ کی ذمہ داریاں کیا ہوں گی۔ دولتِ مشترکہ کے دوسرے اراکین ملکوں کے داخلی معاملات میں دولتِ مشترکہ کبھی دخل نہیں دیتی۔ جہاں تک دولتِ مشترکہ کے گوری رنگت والے اراکین کا تعلق ہے وہاں سے برطانوی عساکر ان مقبوضات کی نشو و نما کے ابتدائی مراحل میں ہی واپس بلالی گئی تھیں۔ جنوبی افریقہ میں پہلی جنگِ عظیم کے آغاز تک کچھ برطانوی فوج مقیم رہا کرتی تھی۔ لیکن اس سے بھی کئی الجھنیں پیدا ہو گئیں۔ پنڈت جی تو شاید بخوشی ملک میں برطانوی افواج رکھنے پر آمادہ ہو جائیں، اور شاید فوج کی تنخواہ اور دیگر اخراجات بھی ادا کرنے پر رضامند ہوں۔ لیکن میری رائے میں اب انگریزی افواج ہندوستان میں نہیں رہ سکتیں۔

اندریں حالات حکومتِ ہند داخلی امن و امان قائم رکھنے کی خود ذمہ دار ہو گی اگر اس کی سرحدوں پر کوئی حملہ ہو تو اس کا مقابلہ

بھی شروع میں حکومتِ ہند کو خود ہی کرنا ہوگا۔ اگر شمال کی جانب سے کوئی حملہ آور ملک میں گھس آیا تو اُس کا مقابلہ بھی پہلے تنہا ہندوستان کو کرنا ہوگا۔ ان حالات میں ہندوستان قومی رضاکاروں پر اکتفا نہیں کر سکتا۔ اُسے مجبوراً مستقل فوج ملازم رکھنی پڑے گی اس فوج کا برطانوی افواج سے کیا رشتہ ہوگا؟۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات ہونگے

اس فوج کے اجزائے ترکیبی کیا ہوں گے؟ یہ فوج کس حد تک لڑنے کے قابل ہوگی؟ اس فوج پر قابو کس طرح رکھا جائے گا؟ اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ یہ فوج ہمیشہ دیوانی حکومت کی مطیع رہے گی؟ عقاب خوش دلی سے میاں مٹھوؤں کی حکومت قبول نہیں کیا کرتے۔ ہندوستان میں تو فوج متعدّد وجوہات کے باعث خواندہ طبقات پر اعتماد نہیں کر سکتی۔

جس ملک میں سازش کا رواج عام ہو، جہاں کسی کے خلاف ایک نظام کے ماتحت فیصلہ ہو جائے تو وہ جھٹ دوسرے نظام کے پاس اپیل لے کر پہنچ جاتا ہے، جہاں ایک طاقت سے بگاڑ پیدا ہو جائے تو دوسری طاقت کا سہارا لینے میں کوئی عار نہیں، جہاں ایسی حرکتیں تدبّر کا شاہکار تصوّر کی جاتی ہوں، وہاں فوج کو سیاسیات سے

علحدہ رکھنا ذرا مشکل ہے ۔ جو فوج سیاسیات سے علحدہ نہ رکھی جا سکے وہ کچھ عرصہ تو سیاست دانوں کے ہاتھ میں ایک اوزار کا کام دیتی ہے، لیکن جلد ہی آپس میں لڑنے والی سیاسی پارٹیوں پر غالب آ جایا کرتی ہے ۔ جمہوریتوں کا حافظہ ذرا کمزور ہوتا ہے، لیکن یہ تو بہت کم انگریز بھولے ہوں گے کہ ۱۹۱۴ء کے آغاز کے چند مہینے تک ہمیں ہندوستان میں کس بھیانک خطرہ کا سامنا تھا ۔ اگر سپاہی کی اوّلین وفاداریاں سرکار سے وابستہ نہ ہوں تو ایک مضبوط، منظّم، اور کارگر فوج اپنے آقاؤں کے لئے بہت بڑا خطرہ ہو سکتی ہے ۔

جو فوج کمزور اور شوریدہ سر ہو، وہ ایک اور لحاظ سے خطرناک ہوتی ہے ۔ جن حالات میں برطانیہ کو مصر کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنی پڑی تھی وہ سب کو معلوم ہیں ۔

اندرونی امن و امان سے ملحقہ سوال اقلیّتوں کی حفاظت کا ہے سب تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کی اقلیتیں خاص تحفّظات کی مستحق ہیں ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جدید ہندوستان میں یہ تحفّظات برقرار رکھّے جائیں گے ؟ صاف نظر آتا ہے کہ یہ تحفّظات برقرار نہیں رکھے جا سکتے ۔ فوج کا غالب حصّہ انہیں اقلیّتوں میں سے بھرتی کیا جاتا ہے ۔ طبعی امر ہے کہ اکثر افسر بھی انہیں عناصر میں سے بھرتی کئے جائیں گے

جن پر عام فوج مشتمل ہے۔ اِن حالات میں کیا سپاہی ہمیشہ اپنی اوّلین وفاداریاں سرکار کے ساتھ وابستہ رکھ سکے گا؟

ہندوستان کا مستقبل بھیانک ہے

(۳) دیسی راجے نوّابوں کا مسئلہ بھی قابلِ غور ہے۔ یہ لوگ مختلف ذاتوں، نسلوں، اور مذہبوں سے تعلّق رکھتے ہیں۔ اُن میں سے بعض تو اپنے کردار کی کمزوری کے باعث نظرانداز کیے جا سکتے ہیں۔ بعض کی ریاستیں بہت چھوٹی ہیں لیکن کئی ایسے بھی ہیں جن کے ذرائع وسیع ہیں اور شخصیتیں صاحبِ کردار ہیں۔ حکومتِ ہند کے ساتھ اِن راجے نوّابوں کے تعلقات کس نوعیّت کے ہوں گے؟ کیا وہ زیادہ دیر تک ماتحت رہنا پسند کریں گے؟ دولتِ مشترکہ کے نام کا سہارا لے کر اندرونی امن و امان قائم نہیں رہ سکتا۔ دنیا کی دوسری حکومتوں کی طرح ہندوستان میں بھی پائیدار حکومت صرف حکمرانوں کے کردار، اُن کی طاقت، اور رعایا کی وفاداری کے ستونوں پر ہی قائم رہ سکتی ہے۔

یہ مسائل اور کئی دوسرے مسائل حل طلب ہیں۔ ابھی تک اِس امر کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے کہ کسی کو اِن مسائل کے وجود کا بھی علم ہے۔ حل کا تو ذکر ہی کیا۔

اِن مسائل کا حل مستقبل ہی تلاش کرے گا اور مستقبل ہی دولتِ مشترکہ کی زندگی یا موت کا فتویٰ بھی صادر کرے گا۔ اگر نتائج ہندوستان اور انگلستان کے حق میں بہتر نکلے تو کہا جائے گا کہ ہندوستان میں انگریز کا راج ختم کرنے والے دانشمند تھے۔ ورنہ تاریخ اُن کو کم ہمت قرار دے گی۔

ممکن ہے دیوتے خون کے پیاسے ہوں۔ شاید ہم، یا ہماری اولاد، یا ہمارے پوتے ایک عجیب اور بھیانک سماں دیکھیں جو مر جاتے ہیں اُنہیں انسانی خوشیوں اور دکھوں کی پروا نہیں رہتی۔ مرنے والی عظیم ہستیوں کی یاد ہمیشہ تاریخ زندہ رکھے گی، اور اُن پر تعریف کے پھول برسائے جائیں گے۔ ہم جو فی الحال زندہ ہیں، اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہماری مدّت العمر کی محنتیں رائگاں گئیں، ہم صرف یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلّی دے سکتے ہیں کہ جو ربّ العزت اپنے بندوں کو کام کرنے کی توفیق دیتا ہے وہی اُن کو انعام بھی دے گا۔

تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک من تشاء

ہم تو بغیر جانے بوجھے عمل کرنے پر مجبور ہیں۔ غیب اور آخرت کا علم اللہ نے اپنے تک محدود رکھا ہے۔ کون ہے جو اُس کی حکمتوں کا

اندازہ کر سکے۔ اگر ہم نے ایمانداری سے کام کیا ہے، اور اپنی استعداد کے مطابق اچھا کام کیا ہے تو ضرور ہمارا انجام بھی بخیر ہوگا۔

اللہ ہی سلطنتیں بخشتا ہے، اور اللہ ہی حکومتیں چھین بھی لیتا ہے۔ انسان عقلمند ہو یا بیوقوف، بزدل ہو یا دلیر، غلام ہو یا آزاد، عظیم الشان سلطنتیں ہوں یا فساد اور بدامنی، سب کا انجام فنا ہے! اور سب کا خاتمہ فراموشی! آخر فنا!! آخر فنا!!!۔

ذاتِ باری تعالیٰ ہی حمدِ بیحد کی مستحق ہے۔ اللہ ہی ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اُسی کی ذات کو بقا ہے۔ اور اُسی کا نام کبھی نہ مٹے گا۔

(شیخ عبداللطیف پاٹنر لائن پریس لاہور نے استقلال پریس لاہور سے طبع کرا کر شائع کیا)

۵۸۳